سعید ابراہیم

کیہ جاناں میں کون

پیدائش گوجرانوالہ یکم فروری ۱۹۶۶ء۔ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور سے گرافک ڈیزائننگ کے شعبے میں تحصیل یافتہ۔ ایڈورٹائزنگ کی سرگرم ایجنسیوں جیسے کہ ASSA اور اورینٹ مین، اسلام آباد سے وابستگی رہی۔ 92-2000 کا عرصہ راولپنڈی میں جنگ گروپ کے The News میں گزرا۔ اس کے بعد لگ بھگ دس برس تک مختلف این جی اوز کے صحرا کو کھنگالا۔ اسی دوران تھیٹر برائے تبدیلی بھی کیا۔ ۲۰۰۶ء میں بچوں کو پڑھانے والی اساتذہ کو ڈول آرٹ اور تھیٹر کے ذریعے تعلیم کے عمل کو دلچسپ بنانے کی تربیت دینے کا دلچسپ تجربہ کیا۔ ڈرامہ سکرپٹ لکھنے سے ڈائریکشن تک بھی جاتے چلے۔ سن دو ہزار ایک سے گیارہ تک ماہنامہ 'نیا زمانہ' لاہور میں ادبی موضوعات پر تجزیاتی مضامین لکھے۔ بہت ہی پیارے دوست ساجد ہاملیون کے امجد سلیم منہاس کی محبت کے ناطے کئی معروف مصنفین کی کتابوں کے سرورق بنانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ میرے گرامی پیارے وجاہت مسعود نے روزنامہ 'آج کل' میں بطور کالم نگار متعارف کروایا۔ جیو ٹیلی وژن کے دو پروگرام 'الف' اور 'نادی' میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ آج کل زیادہ وقت لکھائی پڑھائی کے لیے وقف ہے۔

ید ابراہیم

سیکس اور سماج

مکالمہ ضروری ہے

سعید ابراہیم

نروان پبلیکیشن ہاؤس

2-779 ڈی-1 نیو ٹاؤن شپ، لاہور، پاکستان

موبائل: 0321-4272847

نام کتاب

سیکس اور سماج، مکالمہ ضروری ہے

مصنف

سعید ابراہیم

سرورق

سعید ابراہیم

ناشر

سعید اختر

برائے نروان پبلیکشن ہاؤس

D-1 779-2 نیو ٹاؤن شپ، لاہور

انٹرنیشنل سٹینڈرڈ بک نمبر (ISBN)

ISBN 978-969-7683-00-0

طباعت

نوید حفیظ پریس

سن اشاعت 2016ء

قیمت -/600 روپئے

بیرون ملک 20 ڈالر (علاوہ ڈاک خرچ)

انتساب
ان بھی خاموش لوگوں کے نام
جو بہت کچھ کہنے کو ترس رہے ہیں
مگر
سماج کے خوف نے انہیں
گونگا بنا دیا ہے

فہرست

سیکس اور سماج

مکالمہ ضروری ہے

کتاب لکھنے کی وجہ

اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ مجھ سے یہ کتاب میری بے چینیوں نے لکھوائی، وہ بے چینیاں جن کی جڑیں میرے بچپن میں ہیں۔ اور ان بے چینیوں نے مجھے یہ ادراک دیا کہ انسان ہونے کے ناطے یہ بے چینیاں محض ذاتی نہیں بلکہ کم و بیش ہر فرد کا مسئلہ ہیں۔ جہاں تک لکھنے کے حوصلے کا تعلق ہے تو اس کا کریڈٹ منٹو کو جاتا ہے جس کی تحریریں تخلیقی وفور اور جرأتِ اظہار کی مظہر ہیں۔ بلاشبہ مجھے منٹو سے عشق ہے۔ دل کو لگنے والی کوئی بھی تحریر لکھنے کے لئے بے چینی کی حد تک وفور پہلی شرط ہے کیونکہ اس کے بنا تحریر میں خلوص اور بے ساختگی کا آنا ممکن ہی نہیں۔ دو اور نام ایسے ہیں جن کا تذکرہ مجھ پہ قرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک امرتا پریتم اور دوسرا احمد بشیر۔ یہ نام میرے لہو میں دوڑتے ہیں، جب بھی یاد آئے خوف کا ہوّا ہوا ہو گیا۔ محض سچ لکھنا کفائت نہیں کرتا بلکہ یہ ہنر بھی مانگتا ہے۔ میرے لیے منٹو، امرتا اور احمد بشیر سچ اور ہنر کے امتزاج کا استعارہ ہیں۔

ایک بات عرض کر دوں کہ یہ کتاب کوئی ریسرچ ورک نہیں ہے بلکہ یہ میرے مشاہدے، تجربے اور مطالعے کا نچوڑ ہے۔ میرا پہلا مقصد اسے عام فہم بنانا تھا تا کہ اسے عام تعلیم یافتہ قاری بھی پڑھنے میں آسانی محسوس کرے اور امکانی حد تک اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کے ساتھ جوڑ کر سمجھ سکے۔

کوئی مانے یا نہ مانے سیکس سے جڑے معاملات ہماری سوسائٹی کا اہم ترین مسئلہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں معاشی اور سیاسی معاملات کو پس پشت ڈالنے کی بات کر رہا ہوں۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں

کہ کوئی فرد معاشی طور پر بھلے کتنا ہی آسودہ کیوں نہ ہو اگر اسے محبت کرنے والا ساتھی نصیب نہ ہو تو یہ شدید بدنصیبی کی بات ہے۔ یقیناً معاشی تنگ دستی کسی فرد کو خطرناک حد تک پریشانی سے دوچار کر سکتی ہے مگر اس کی سیکسوئل فرسٹریشن، محبت سے محرومی یا اسکے ساتھ ہونے والی کسی بھی طرح کی جنسی اونچ نیچ اس کی شخصیت میں ایسے بگاڑ پیدا کر سکتی ہے جن کا مداوا بعض اوقات عمر بھر ممکن نہیں ہو پاتا۔

اس کتاب میں جس موضوع پر بات کی گئی ہے اس سے ہر فرد کا واسطہ ہے مگر ہم نے اس پر مجرمانہ چپ سادھ رکھی ہے۔ سیکس کو ہم نے ایک خوفناک ٹیبو بنا دیا ہے اور اس کے بارے میں گفتگو کو بے شرمی، بدمعاشی اور فحاشی کا ہم معنی قرار دے دیا ہے (سو ہم اپنی نجی اور بے تکلف محفلوں میں اس پر سوقیانہ اور گھٹیا ترین انداز میں ہی بات کرتے ہیں)۔ ہم نے اجتماعی طور پر سیکس کو ایک غلیظ حرکت کا درجہ دے کر اسے دلگر بنا دیا ہے۔ میں پوری ایمانداری سے یہ سمجھتا ہوں کہ جب کسی بھی انسانی جبلت پر ناجائز پابندیاں عائد کی جاتی ہیں وہ بھاپ کی مانند طاقت میں بدل کر فرد اور سماج کے وجود کو شکست وریخت سے دوچار کر دیتی ہیں۔ جب فطری خواہشات کے اظہار کو فطری اور تخلیقی راستہ نہ دیا جائے تو وہ کرپشن اور ونگیریٹی کا راستہ اپنا لیتی ہیں۔ ایسے سماج میں فنون اور فحاشی ہم معنی ہو جاتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے ہاں موسیقی، فلم اور تھیٹر سیکسوئل فرسٹریشن کے کیتھارسز کا بے ہودہ ذریعہ بن چکے ہیں۔

انسانی فطرت پر ناجائز پابندیاں وہی لوگ عائد کرتے ہیں جو انسانی فطرت کے شعور سے عاری ہوں۔ جن کے دماغوں میں دوسروں کو غلام بنانے کا غلیظ مالکانہ جذبہ بھرا ہو۔ ان کے اختیار میں اگر ملک کا اقتدار ہو تو یہ پوری سوسائٹی کو جانوروں کی طرح سدھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر یہ اختیار خاندان کی حد تک ہو تو اسے اپنی مرضی کے دائرے کی قید سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتے۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ قید رکھنے کی یہی کوشش بغاوت کے راستے کھولتی ہے۔ بغاوت بے شعور ہو تو نری تباہی اور شعوری ہو تو نئے سماج کی تعمیر۔

ہمارا معاشرہ واضح طور پر دو متضاد خانوں میں تقسیم ہے، ایک مردانہ اور دوسرا زنانہ۔ بلا مبالغہ عورتیں غلامانہ حد تک تحقیر کا شکار ہیں۔ مرد کی مرضی کو قانون اور حکم کا درجہ حاصل ہے۔ محض نطفے کے ناطے وہ

ایسی اولاد کا مالک بن بیٹھتا ہے جسے عورت نہ صرف نو ماہ تک اپنی کوکھ میں سنبھالے پھرتی ہے بلکہ اسے جنم دینے کی جان لیوا تکلیف سے بھی گزرتی ہے اور پھر راتوں کی نیند حرام کر کے اسے پالتی پوستی بھی ہے مگر وہ پھر بھی اپنی اولاد کی پہچان نہیں بن سکتی۔ یہ حق صرف باپ کو حاصل ہے بھلے وہ کتنا ہی نکما، جاہل اور بدکار کیوں نہ ہو۔ ایسے میں عورت چاہے کچھ بھی کر لے وہ اپنی شخصیت کی مثبت اور قابل فخر پہچان حاصل نہیں کر سکتی۔

یہ جو ہم عورت کی عزت کا راگ الاپتے ہیں یہ ڈھٹائی کے ساتھ بولے جانے والے بیہودہ جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں نے عورت کی عزت کے دعویداروں اور نعرے بازوں کو نظروں ہی نظروں میں ان کے کپڑے اتارتے دیکھا ہے۔ ویگن اور بس میں بظاہر بڑے احترام اور خشوع وخضوع سے خواتین کو سیٹ پیش کرنے والوں کے دلوں میں یہ خواہش تڑپتے محسوس کی ہے کہ کاش وہ انہیں اپنی بغل یا گود میں بٹھا سکتے۔ یہ سراسر ایک جعلی اخلاقیات کے بوجھ تلے دبے سماج کا عام المیہ ہے۔

اس بات میں کوئی دو رائے ممکن نہیں کہ عورت اور مرد کا بنیادی رشتہ جنسی جذبے کی کشش کا ہے جسے تہذیب نے محبت کا روپ دیا اور پھر یہی تہذیب عورت اور مرد کی محبت کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہوگئی اور یوں اس سیدھے سادے بنیادی جنسی جذبے کو نارسائی اور عدم مساوات کے حربوں سے یوں اُلجھایا کہ دونوں ہی حقیقی معنوں میں ایک دوسرے کو پانے میں ناکام ہیں۔ مرد نے عورت کی آزادی سلب کی تو سمجھو اپنے ہی اعلیٰ ترین مگر منہ زور جذبے کی تسکین کے راستے مسدود کر دیئے۔ نتیجہ کیا نکلا؟ یہی کہ ہمارے ہاں اب لڑکیاں اور عورتیں تو ایک طرف، دو دو، تین تین برس کے معصوم بچے بھی محفوظ نہیں۔

ہماری عورت کا المیہ یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ عزت دینے کے دعوے دار معاشرے میں ہی سب سے زیادہ مقہور اور ذلیل ہے۔ اس کی حیثیت آج بھی بہشتی زیور میں بیان کردہ کردار سے زیادہ مختلف نہیں۔ جاب کرنے والی عورت ابھی بھی مردانہ سماج کی قید میں ہے بلکہ اس کا بوجھ اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ مرد اپنے گھر کی عورتوں کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں، خاص طور پر بیوی کو۔ اسی بنا پر سیکسوئل فرسٹریشن کا شکار ہوتے ہیں اور اسی لیے ان کے لئے ہر غیر عورت محض ایک سیکس اوبجیکٹ ہوتی ہے جسے دیکھ کر ان کی مردانہ

حسیات بے قابو ہونے لگتی ہیں۔ مگر ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ شرافت کا نقاب چہرے سے نہ سرکے۔
یہ صورتحال خوشی کی حقیقی دشمن ہے مگر ہم اس سے نجات کا راستہ سوچنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔

اس کتاب کو لکھنے کا محرک ویسے تو کئی سوالات ہیں مگر ایک سوال جو مجھے قدم قدم پہ پریشان کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ کیا والدین ہونے کے ناطے ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم اپنے رحم وکرم پر پلنے والے بچوں کو علم اور عقل کے حصول کا آزاد ماحول دیئے بغیر انہیں جو دل کرے بنا دیں۔ مانا کہ سبھی والدین اپنے بچے کو ایک اچھا اور نیک انسان بنانا چاہتے ہیں مگر خود ان کا اپنا اخلاقی نظام اس قدر بے سوچا سمجھا اور خام بنیادوں پہ استوار ہوتا ہے کہ وہ اپنے اچھائی یا برائی کے تصور کو مدلل انداز میں بیان کرنے سے کم وبیش قاصر ہوتے ہیں۔

ہم نے شائد ہی کبھی اس بات پہ غور کیا ہو کہ جن باتوں کو ہم نیکی یا اچھائی سمجھتے ہیں کیا وہ واقعی نیکی یا اچھائی کہلانے کی مستحق ہیں بھی کہ نہیں۔ اور جن باتوں کو ہم نے گناہ یا برائی کے خانے میں رکھ چھوڑا ہے وہ اپنے نتائج کے اعتبار سے گناہ یا برائی ہیں بھی کہ نہیں۔ ہم نے کردار کو سماجی معاملات سے کاٹ کر رسمی عبادات اور مذہبی شعائر کی ادائیگی سے جوڑ دیا ہے۔ کوئی نوجوان شیو بڑھا لے تو محلے کے بزرگ اسے مبارکباد دینے لگتے ہیں۔ گویا ان کے تئیں داڑھی کردار کی کایا کلپ کی علامت ہے۔ جبکہ دوسری جانب صورت حال یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی میں حاجی کا لفظ فراڈیے یا پاجی کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے نیکی اور بدی کے معیار گڈ مڈ ہو چکے ہیں۔ ویسے بھی یہ معیار زیادہ تر کتابی ہیں جن پر بدلتے ہوئے حالات میں عمل کرنا تقریباً ناممکن ہو چکا ہے۔

اگر ہم بچے کی بات کریں تو وہ اپنی ذات میں امکانات کی ایک بے انت کائنات ہے اور والدین کی ذمہ داری یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کے جسمانی وجود کے قائم رہنے کی ضمانت کا بندوبست کریں اور پھر اس کے ذہن میں وقت کے ساتھ ساتھ ابھرنے والے امکانات کے پنپنے کے لیے مکمل احساس کے ساتھ ایک ایسی آزاد اور تعصب سے پاک علمی فضا فراہم کریں جو بچے کو اپنی پسند کا تخلیقی راستہ چننے میں مدد کرے۔ مگر کیا کیا جائے کہ ہمارے سماج کی صدیوں پرانی روایات میں بے سوچے سمجھے جکڑے

والدین کو اس بات کا ادراک ہی نہیں ہے۔ وہ تو بس بچے کو ایک سادہ سے نا سمجھ وجود سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں جس کا ہر سوال اور ہر ضد ان کے نزدیک فضول بات ہے جس کا جواب اسے اکثر ڈانٹ ڈپٹ اور گھرکیوں اور کبھی کبھار تھپڑوں کی صورت میں ملتا ہے۔ یہ رویہ اسے ایک مسلسل کنفیوژن میں ڈالے رکھتا ہے جس کے نتیجے میں وہ درست سوال مرتب کرنا تو دور کی بات، بلکہ سوال کرنے کی صلاحیت بھی کھو بیٹھتا ہے۔ کئی بچے تو اس سلوک کی وجہ سے لکنت کا شکار ہو جاتے ہیں، مگر والدین کے فرشتوں کو بھی اس المیے کی خبر نہیں ہوتی۔ وہ تو بس اس کے کھانے پینے پہننے اور سکول جانے کا انتظام کر کے خود کو مطمئن کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہاں اب اگر کوئی فکر ہے تو محض اتنی کہ بیٹا کب بڑا ہو، کب تعلیم مکمل کرے اور جب کمانے کے قابل ہو تو اس کی اچھے جہیز کے بدلے شادی کر دی جائے۔ اور اسے اپنے ہی جیسی جلد ہی روٹین میں بدل جانے والی بے لطف زندگی دے کر اپنے کامیاب والدین ہونے کا اعلان کر دیا جائے۔

جہاں تک بیٹی کا تعلق ہے معاملہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ قابل رحم ہو جاتا ہے۔ بیٹی تو ایک بوجھ ہے جس پر کی گئی انویسٹمنٹ سے کوئی فائدہ نہیں ملنا۔ اسے تو پال پوس کر، لکھا پڑھا کر بالآخر کسی غیر کے حوالے ہی کرنا ہے۔ بلکہ ایک اضافی مصیبت یہ بھی ہے کہ شادی کے مرحلے تک اس کی عصمت کی پاکیزگی کو بھی یقینی بنانا ہے۔ سو اس کے لئے ضروری ہے کہ چوبیس گھنٹے اس پر نظر رکھی جائے۔ اس پر آزادی اور آزاد سوچ کا ہر لمحہ حرام کر دیا جائے۔ اسے مسلسل احساس دلایا جائے کہ بھائی کے مقابلے میں وہ ایک مختلف، کم تر، کمزور اور نازک وجود کی مالک ہے جو اپنی حفاظت کے لئے قدم قدم پر مرد کی محتاج ہے۔

یہ وہ سوچ ہے جس کی وجہ سے ہم نے اپنی سوسائٹی کے آدھے حصے کے امکانات کو بروئے کار آنے سے روک دیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے جاگیردارانہ روایات کی بنیاد پر مردوں اور عورتوں میں بے جا دوری پیدا کر کے ان کے درمیان نارمل کی بجائے مریضانہ کشش پیدا کر دی ہے۔ اقبال نے تو صرف فنکاروں کے بارے میں کہا تھا کہ 'ہائے بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار' مگر یہاں تو

صورتحال یہ ہے کہ ہر مرد کے اعصاب پر ایک وقت میں کئی کئی عورتیں سوار رہتی ہیں اور جنسی خیالات کی بھرمار انہیں کسی کام جوگا نہیں رہنے دیتی۔ اوپر سے مصیبت یہ کہ وہ اس بات کا اعتراف بھی نہیں کر پاتے بلکہ عموی طور پر خود کو دوسروں کے سامنے عورتوں کے بارے میں بے نیاز ظاہر کرنے کی اداکاری کرنا پڑتی ہے۔

ہمارے ہاں عورت کا تصور بہت ترس انگیز ہے۔ مردوں کی نظر میں وہ یا تو جنسی جبلت کو انگیخت کرنے والا جسم ہے اور یا پھر ایک گھریلو کارندہ جس کا ایک خاص حد میں بند رہنا اس کا ازلی مقدر ہے۔ جس مذہب کو اس کا مرتبہ بلند کرنے کا کریڈٹ دیا جاتا ہے، اسی کے ضابطوں میں اس کی حیثیت کو کمتر بنانے کی شقیں بھی درج ہیں جن کی مدد سے مرد اپنی آقائیت کی سند حاصل کرتے ہیں۔ اگرچہ عورتوں کی برابری اور آزادی کے آرزومندوں کے لیے مذہب کے ٹھیکیداروں کے خوف کی وجہ سے ان معاملات کو زیرِ بحث لانا تقریباً تقریباً ناممکن ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ لاوا اندر ہی اندر پک رہا ہے جو جلد یا بدیر پھٹ پڑے گا۔ اطلاعات اور علم کے جدید ذرائع کی بدولت عورت اپنی ذہنی اور جسمانی ضرورتوں سے پہلے سے کہیں زیادہ آگاہ ہو رہی ہے۔ عدمِ تسکین کا بڑھتا ہوا احساس اسے دھیرے دھیرے بغاوت پر آمادہ کر رہا ہے۔ طلاق کی شرح تیزی سے بڑھ رہی ہے جو مستقبل قریب میں بحرانی صورت اختیار کر لے گی۔ مذہبی اخلاقیات کے مبلغ اس پر خوب شور مچائیں گے اور اسے محض مغربی تہذیب کے اثرات کا شاخسانہ قرار دے کر بری الذمہ ہو جائیں گے مگر کبھی حقیقی تجزیے کا ہنر سیکھنے کی طرف توجہ نہیں دیں گے۔

ہم اپنے جنسی خیالات اور خواہشات کو ہم ایک غلیظ شے سمجھ کر چھپاتے ہیں اسی لئے اس کا اظہار غلیظ ترین گالیوں کی صورت میں کرتے ہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ کھل کر کرتے ہیں۔ یہ بات جنس کے بارے میں ہماری غیر متوازن بلکہ بیمار سوچ کی عکاس ہے۔ سیکس ہمارے لئے ایک شدید لذت انگیز مگر شرم ناک معاملہ ہے۔ اس معاملے میں والدین شدید پریشانی کا شکار ہیں۔ بے مہار الیکٹرانک میڈیا انٹرنیٹ اور موبائل فون کے تیزی سے بڑھتے پھیلتے اثرات نے انہیں بوکھلا کے رکھ دیا ہے۔

ایسے جیسے بظاہر ایک مضبوط مگر اندر سے بوسیدہ چھت برسات میں جگہ جگہ سے ٹپکنے لگ پڑے۔ ایک سوراخ بند کرو تو پانی کسی اور کمزور جگہ کو کھوکھلا کر دے۔ ہم بارش کو روک نہیں سکتے، اور ہمیں روکنا بھی نہیں چاہئے۔ بارش تو زندگی کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کی زد سے گھر کے کمروں کو بچانا بھی ضروری ہے۔ اگر ہماری چھت نہ ٹپکے تو یقین کیجئے بارش ہمارے موڈ اور مزاج کے لئے زود اثر ٹانک میں بدل جائے گی اور ہمارا دل بے ساختہ گانے اور رقص کرنے کے لئے مچل اُٹھے گا۔

غور کریں تو سیکس ہماری زندگی کی بنیاد ہے۔ اس کے بارے میں اگر سوچ میں کوئی ٹیڑھ آ جائے تو زندگی کی ساری اٹھان ٹیڑھی اور مسخ ہو سکتی ہے۔ اس عظیم اور اہم ترین جذبے کی غلط تفہیم کی وجہ سے نہ صرف ہم نے خود کو اس سے حاصل ہونے والے بہشت آسا لطف سے محروم کر رکھا ہے بلکہ دوسروں، خاص طور پر اپنی اولادوں کی زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے، اور ستم ظریفی یہ کہ لطف کی اس غارتگری کا کام ہم مذہب سے کشید کردہ اخلاقیات کے نام پر کرتے ہیں۔

اخلاقیات اور روایات کا اصل کام سماجی زندگی کے بہاؤ کو بلا رکاوٹ مسلسل اور سہل بنانا ہے نہ کہ اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر کے اسے برباد یا گم راہ کرنا۔ اگر اخلاقیات اور روایات زندگی کو آگے بڑھنے سے روکنے لگیں تو سمجھ لیجئے کہ ان کا وقت پورا ہو چکا۔ اب ان کو ماضی کے کوڑے دان میں پھینکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

ہم نے مرد اور عورت کے جس تعلق کو نکاح کے مقدس غلاف میں لپیٹ رکھا ہے کیا کبھی ہم نے اس غلاف کے اندر جھانک کر دیکھا بھی ہے کہ اس تعلق کی حالت کتنی انسانی یا غیر انسانی ہے۔ پورے سماج میں شائد ہی کوئی ایسا جوڑا ملے جسے یہ تعلق بوجھ نہ لگتا ہو۔ ہمیں مردوں کی اکثریت شادی شدہ ہونے کے باوجود اِدھر اُدھر منہ مارتی دکھائی دے گی۔ سوسائٹی میں پراسٹی ٹیوشن کا ادارہ ایسے ہی مردوں کے دم قدم سے قائم ہے۔ ممکن ہے عورت بھی اپنے اندر اس رشتے سے باہر تعلق بنانے یا تانکا جھانکی کی خواہش رکھتی ہو مگر وہ بوجوہ ایسا قدم اٹھانے سے گریزاں رہتی ہے، کیونکہ مرد کے مقابلے میں اس کا بہت کچھ داؤ پہ لگا ہوتا ہے۔ پہلی بات بدکرداری کی تہمت اور دوسری طلاق کی صورت میں بے گھری

کہ والدین اور بھائی اس کے بچوں سمیت اس کا بوجھ اٹھانے کو تیار نہیں ہوتے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر یہ تعلق اتنا ہی مقدس اور خوشی دینے والا ہے تو فریقین اس سے کیوں اُوبھ جاتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری روایتی اخلاقی ضابطوں اور فرد کی حقیقی خوشی میں اب کوئی تال میل نہیں رہا سو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی خلاف ورزی پر مجبور ہو رہا ہے۔

جنسی تعلق کے اور بھی بہت سے زاویے ہیں جن سے کم و بیش ہر کوئی واقف ہے مگر اس پر سنجیدہ مکالمے سے گریزاں ہے۔ جیسے کہ مرد سے مرد کا اور عورت سے عورت کا تعلق۔ خواجہ سراؤں کا طبقہ اس پر مستزاد ہے۔ یہ سارے معاملات انسان کے سب سے منہ زور جبلی جذبے کی اپنے اپنے انداز میں تسکین سے جڑے ہیں۔ ان کو محض ایک نفرت بھری ہونہہ کے ساتھ نفسیاتی بیماری، گناہ، جرم یا ایب نارمیلٹی کہہ کر جان نہیں چھڑائی جا سکتی۔ اگر یہ رجحانات محض غلط سماجی ماحول کا نتیجہ نہیں بلکہ ایسے افراد کی فطرت میں فطرت جانب سے ودیعت کردہ ہیں تو اس معاملے پر روٹین کی سوچ سے ہٹ کر ہمدردانہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اور سوال یہ اٹھتا ہے کہ ہمیں خدا کی جانب سے بنائی ہوئی فطرت پر قدغن لگانے کا کیا حق ہے؟

غور کیا جائے تو اصل مسئلہ سیکس کا جذبہ نہیں بلکہ اس کی غلط تفہیم کا ہے۔ ہم نے اس جذبے کے بارے میں کبھی سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں بلکہ صدیوں سے بنی گھسی پٹی روایات کے ساتھ گھسٹتے چلے آرہے ہیں۔ ہماری روح جگہ جگہ سے جھل کر زخم زخم ہو چکی، اور ہم ہیں کہ اس کا علاج ناکارہ ٹوٹکوں سے کرنے میں لگے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہم پہلے اس جذبے کو سنجیدگی سے سمجھیں اور غور کریں کہ سیکس کا جذبہ اپنی بنیاد میں واقعی ایک مسئلہ ہے بھی کہ نہیں یا اسے ہماری غلط تفہیم اور ہوڑمت طور طریقوں نے مسئلہ بنا دیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں میں نے اپنے تئیں پوری سنجیدگی سے اس مسئلے پر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں زندگی کے طویل تجربے اور سنجیدہ مطالعے کے نتیجے میں اتنا سمجھ پایا ہوں کہ اگر سیکس کے بارے میں ہماری تفہیم درست ہو جائے تو ہماری نجی، خاندانی اور اجتماعی زندگی میں خوش گوار انقلاب آ سکتا ہے۔ ہمیں یوں محسوس

ہوگا جیسے بہت سے بے جا بوجھ ہمارے سر سے اُتر گئے ہیں۔ ہم آہستہ آہستہ ان تمام جیل خانوں سے آزادی پانے لگیں گے جو ہم نے اپنی بے سوچی سمجھی روائتی سوچ سے بہت مضبوط بنا لئے تھے۔

مجھے معلوم ہے کہ یہ کتاب اپنے عنوان اور موضوع کی بدولت ضرورت سے زیادہ توجہ حاصل کرے گی۔ کئی تو اسے محض مزا لینے کی خاطر پڑھیں گیا اور یہی لوگ ہوں گے جو نہ صرف اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے بلکہ الٹا اسے تنقید کا نشانہ بھی بنائیں گے۔

میری پوری کوشش ہوگی کہ کتاب میں عربی فارسی کی بجائے عام طور پر مستعمل انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال ہی کروں تا کہ قاری کو قدم قدم پر لغت سے رجوع کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ میں لغت کے استعمال کے خلاف نہیں ہوں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مشکل الفاظ مطالعے کی روانی توڑ کر پڑھنے والے کو اکثر تحریر سے بے زار کر دیتے ہیں اور یوں ابلاغ کہیں کھو کر رہ جاتا ہے۔ لیجئے قارئین اب کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر میری اس کاوش نے آپ کی پہلے سے بنی تفہیم کو تبدیلی کی جانب مائل کیا تو میں سمجھوں گا میری محنت وصول ہوگئی۔

آخر میں مَیں اس ہستی کا تذکرہ کرنا لازم جانتا ہوں جس نے مجھ جیسے کاہل آدمی سے کبھی پیار اور کبھی دھمکی سے یہ کتاب مکمل کروائی۔ اس ہستی کا نام ہے مہک سلیم جو میری دوست بھی ہے اور بیوی بھی۔ بلکہ میری زندگی میں اس کی شمولیت کتاب کی تصنیف کے وعدے سے مشروط تھی۔ یہ اسی کا کام تھا کہ اس نے مجھے نوکری کی اذیت سے بچا کر اس کام میں لگایا اور اس دوران ہمارے بیٹے نروان کو پالنے کے ساتھ ساتھ گھر کا چولہا بھی بجھنے نہیں دیا۔

چند اور ہستیاں بھی ہیں کہ جن کی مالی معاونت دستیاب نہ ہوتی تو یہ کتاب مسودے کی صورت کسی دراز میں دیمک کی منتظر پڑی رہتی۔ ان میں ڈاکٹر لبنیٰ مرزا، اسلام کیف طھور، منصور نورالدین، رفعت عزیز، محمد اسلم اور میری بیٹی رشم شامل ہیں۔

سعید ابراہیم

سیکس ایک منہ زور جبلت

سیکس میں دلچسپی عین فطری ہے

اگر یہ کہا جائے کہ جیتے جاگتے نارمل انسانوں کو اگر کسی موضوع میں سب سے زیادہ دلچسپی ہے، وہ سیکس ہے تو اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ یقیناً دنیا میں سب سے زیادہ لٹریچر اسی موضوع سے متعلق پڑھا جاتا ہے اور سب سے زیادہ وہی فلمیں دیکھی جاتی ہیں جنہیں عرف عام میں پورن، ایکس ریٹڈ یا بلیو فلمیں کہا جاتا ہے۔ جہاں تک پاکستانیوں کا تعلق ہے تو ہم اس معاملے میں دنیا بھر میں پہلے نمبر پر کھڑے ہیں۔ یہ بات ہماری سوسائٹی کی سیکسوئل فرسٹریشن یا جنسی جذبات پر ناجائز دباؤ کی غمازی کرتی ہے۔

یہ آج کا نہیں صدیوں کا مسئلہ ہے۔ انٹرنیٹ اور وی سی آر سے پہلے ہمارے ہاں فحش کتابوں کا ایک طویل دور گذرا ہے۔ میری عمر کے بہت سے بزرگ یقیناً وہی وہانوی کے نام سے واقف ہوں گے۔ اس فرضی نام سے بے شمار کتابیں گلی محلوں کی آنہ لائبریریوں میں دستیاب تھیں جن کا سرد راتوں میں رضائیوں میں چھپ کر اور گرم دنوں میں نصابی کتابوں میں چھپا کر مطالعہ کیا جاتا تھا۔ ان ناولوں میں جنسی تعلق کے مناظر انتہائی کھلے لفظوں میں بیان کیے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ جنسی اعضا کے وہی نام لکھے جاتے تھے جو اردو کی گالیوں میں عام مستعمل ہیں۔ وہی وہانوی کے فرضی نام سے لکھنے والوں کے پیچھے

ایک معروف ادیب کا نام بھی چھپا ہے جسے ادب آشنا لوگ شوکت تھانوی کے نام نامی سے جانتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہی وہانوی جیسا عجیب وغریب نام انہی کی ایجاد تھا۔ بلیو فلموں کے چلن سے پہلے یہ فحش ناول کثیر تعداد میں دھڑا دھڑ شائع ہوتے اور ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ اکثر حضرات خواتین کے نام سے جنسی ناول لکھتے تھے تاکہ قارئین کی آتش شوق کو مزید بھڑکا سکیں۔ کوک شاستر باتصویر کے نام سے بہت سی کتابیں فٹ پاتھوں پر عام فروخت ہوتی تھیں جس میں دولہا دلہن کو سہاگ رات گزارنے کی کہانی نما ہدایات درج ہوتی تھیں۔ جنہیں دولہا دولہن کی بجائے دوسرے لوگ زیادہ شوق سے دیکھتے تھے۔ پڑھے لکھے نوجوانوں خصوصاً لڑکیوں میں سڈنی شیلڈن کے ناول ابھی تک بہت مقبول ہیں اور شہر کے بک سٹالوں پر عام دستیاب ہیں۔

پاکستان میں اردو زبان کے ڈائجسٹوں کی بھرمار کا ایک دور گزرا ہے جس میں مافوق الفطرت کہانیاں ایک ہمہ صفت خوبرو مسلمان ہیرو کے گرد گھومتی تھیں جو جہاں قدم رکھتا تھا کوئی نہ کوئی حسینہ اس پہ مرمٹتی تھی۔ نسیم حجازی کے اسلامی ناول بھی اس طرح کے کرداروں سے خالی نہیں رہے جن کا مرد مومن ہیرو نوجوان لڑکیوں کے لیے بے پناہ کشش کا حامل ہوتا تھا۔ ہمارے ناول نگار بھلے فحاشی کے علمبردار تھے یا نام نہاد مذہبی مرد کے جنسی یا محبت کے تعلق کو بیان کرنا ان کی مجبوری تھا کہ یہ مسالہ ڈالے بنا کتاب بیچنا آسان نہیں تھا۔ ایسی تحریروں اور ناولوں کا مقصد مذہب یا تاریخ کے پردے میں جنسی جذبات کو انگیخت کر کے پیسہ کمانے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان تصانیف کو کبھی ادبی مقام حاصل نہیں رہا۔

جنسی نارسائی اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے مسائل کے بارے میں سب سے پہلے منٹو اور عصمت چغتائی نے باقاعدہ سنجیدگی کے ساتھ قلم اٹھایا اور خوب اٹھایا۔ ان کا مقصد ہرگز ہرگز قاری کے جنسی جذبے کو انگیخت کرنا نہیں تھا بلکہ ان معاملات کو سماج کے سامنے لانا تھا جن کی حقیقت سے شرفا صاف انکاری تھے۔ منٹو کا افسانہ 'اللہ دتہ' اس کی عمدہ مثال ہے جس میں انہوں نے پہلی بار محرمات کے ساتھ تعلق کو بڑی جرأت کے ساتھ موضوع بنایا۔ اسی طرح لزبین ازم کے موضوع پر سب سے پہلے عصمت

چغتائی نے لکھا۔ اس موضوع پر ان کے افسانے 'لحاف' نے سماج میں منافقانہ تہذیب کے علمبرداروں میں خاصی کھلبلی مچائی۔ سن 32ء میں چند ترقی پسند مصنفوں کا افسانوں کا ایک مجموعہ 'انگارے' کے نام سے چھپا جس نے ہندوستان کی ادبی فضا میں بھونچال کی سی کیفیت پیدا کی مگر اس مجموعے کے اکثر مصنفین بعد میں شائد توبہ تائب ہو گئے۔ ان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی مبانی اور معروف کمیونسٹ لیڈر سید سجاد ظہیر بھی شامل تھے۔ اس مجموعے میں مذہب، جنس اور عورت کی مظلومیت کو موضوع بنایا گیا تھا جسے اس وقت کا سماج اور نام نہاد قانون برداشت نہ کر سکا اور اس پر اسی سال پابندی عائد کر دی گئی۔ ویسے تو حسن عسکری نے بھی اس میدان میں طبع آزمائی کی لیکن وہ 'پھسلن' اور 'حرامجادی' جیسے افسانے لکھنے کے بعد جلد ہی اس ڈگر کو چھوڑ گئے۔ واجدہ تبسم نے اگرچہ اپنا دائرہ حیدر آباد کی بوسیدہ اور منافقانہ اخلاقیات کی پروردہ سوسائٹی کے پوسٹ مارٹم تک محدود رکھا اس لیے ان کے افسانوں میں یکسانیت سی در آئی۔ مگر پھر بھی وہ مسئلے کو سمجھنے کے لئے بہت کچھ دے گئیں۔ خود نوشتی ادب میں جوش صاحب کی 'یادوں کی برات' خاصے کی چیز ہے جو معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ جنسی چٹخارہ بھی رکھتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے لڑکوں اور خواتین کے ساتھ اپنے جنسی معاشقے دھڑلے سے بیان کیے ہیں جن میں آخری عمر میں ایک اٹھارہ برس کی دوشیزہ کی محبت کا قصہ بھی شامل ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مردانگی کے غرور سے بے جا حد تک مملو ہے مگر پھر بھی اپنی ذات کے بارے میں اتنے دھڑلے کے ساتھ اعتراف اور انکشاف کے لیے جوش صاحب تعریف کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔ ممتاز مفتی فرائیڈین ہونے کے ناطے شہرت رکھتے تھے۔ خصوصاً ان کا آٹو بایوگرافیکل ناول 'علی پور کا ایلی' ہماری سوسائٹی کے جنسی معاملات کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں اور کج رویوں کی عمدہ تصویر کشی ہے۔

مزید پیچھے جائیں تو ریختی کے عنوان سے لکھی جانے والی شاعری اور چند ایک مثنویاں سوسائٹی کی سیکسوئل فرسٹریشن اور جنسی معاملات میں شدید دلچسپی کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ لکھنؤ میں ایسے مشاعرے عام تھے جہاں مرد باقاعدہ زنانہ لباس پہن کر شریک ہوتے تھے اور خواتین کے محاورے میں شاعری پیش کیا کرتے تھے۔ طوائف کا کوٹھا تہذیبی ادارے کا مقام رکھتا تھا جہاں 'شریف' اُمراء اپنے بیٹوں کو

ادب اور تہذیب سکھانے کے لیے بھجواتے تھے۔ اردو زبان کے کم و بیش بائیس شعرا ہیں جو اپنی فحش گوئی کی وجہ سے معروف ہوئے۔ اس حوالے سے جعفر زٹلی کا نام خاصہ معروف ہے جو فحش ترین سمجھے جانے والے الفاظ کا اپنے کلام میں بلا تکلف استعمال کرتے تھے۔

فحش گوئی کے الزام سے تو میر، سودا اور نظیر جیسے ثقہ شاعر بھی بچ نہیں پائے۔ کبھی کبھار علامہ اقبال بھی یہ شغل فرماتے تھے اور اپنے خاص خاص دوستوں کو اس کلامِ خاص سے نوازتے تھے۔ مگر عوام الناس کی نظروں سے ان کا یہ پہلو پوشیدہ چلا آتا ہے۔ وارث شاہ کی ہیر میں بھی ایسے کئی ٹکڑے ہیں جنہیں تنگ ذہن ناقدوں نے فحش کہا اور اپنی پاکیزہ ذہنی کا ثبوت یوں دیا کہ نئے ایڈیشنوں میں فحش سمجھے جانے والے اشعار کی جگہ نقطے ڈال دیئے۔ یہی حرکت نظیر اکبرآبادی کی شاعری کے ساتھ بھی کی گئی۔

اردو ناول نگاروں میں مولانا عبدالحلیم شرر اس موضوع پر لکھنے والوں میں اولین درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے دو ناولوں 'دربار حرام پور' اور 'حسن کا ڈاکو' میں فحش منظر کشی کے کئی مرقعے دستیاب ہیں۔ مزید پیچھے جائیں تو عربی لٹریچر سے ترجمہ کردہ الف لیلیٰ بھی ہندوستان میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں عورت اور مرد کے اتصال کو رنگارنگ انداز میں کھل کر بیان کیا گیا ہے۔ ہمارے کئی علماء کے نزدیک تو قصص القرآن میں حضرت یوسف اور زلیخا کا واقعہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سورۃ یوسف کی تفسیر عورتوں کو پڑھانے سے منع کیا ہے۔ ان کے بقول اس کے پڑھنے سے عورتوں کے اخلاق بگڑنے کا اندیشہ ہے۔

اگر فتاویٰ کی کتابوں کو کھول کر دیکھیں تو ان میں مباشرت، طہارت اور غسل کے مسائل نے ایک تہائی سے زیادہ صفحات گھیر رکھے ہیں۔ جملہ مذہبی صحائف اور ضمنی کتب کا طائرانہ سا مطالعہ بھی اس تاثر کو پختہ بنانے کے لیے کافی ہے کہ جنسی معاملات کے حوالے سے مذہبی بنیادوں پر بھی فحاشی کی حدود طے کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

بائبل مقدس میں جلیل القدر پیغمبر حضرت داؤدؑ کے بیٹے کا اپنی سوتیلی بہن کے ساتھ دھوکے سے تعلق بنانے کا قصہ اور باپ کی نسل چلانے کے لیے حضرت لوطؑ کی بیٹیوں کا انہیں مے پلا کر ہم بستر ہونا جنسی

اخلاقیات کے بارے میں اچھے خاصے سمجھدار انسان کو مخمصے میں ڈال دیتا ہے۔ جبکہ دوسری جانب اسی بائبل کے ماننے والے جنسی تعلق سے اس حد تک اباء کرتے ہیں کہ انہوں نے اس تعلق سے پاک تن عورتوں کا پورا ادارہ بنا ڈالا۔ انہوں نے حوا کو آدم کے ساتھ جسمانی تعلق بنانے پر اولین گناہ کا ازلی مجرم قرار دے ڈالا اور حضرت مریمؑ کا کریڈٹ یہ بات بنی کہ انہوں نے کسی مرد کے چھوئے بنا حضرت عیسیٰؑ کو جنم دیا۔

ہمارا جملہ مذہبی لٹریچر بھی اسی طرح کے متضاد واقعات و معاملات سے لبریز ہے۔ ایک طرف عورتوں کے لیے انتہائی پردے کے احکامات ہیں تو دوسری طرف لونڈیوں سے بلا روک ٹوک جنسی تمتع اور ان کی سر بازار خرید و فروخت کے تذکرے بھی تفصیل کے ساتھ مرقوم ہیں۔ حسین ہیکل نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب 'حضرت عمر فاروقؓ' میں اس صورتحال کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

''۔۔۔ ایران و روم کی کنیزیں جن میں اکثر حسین و فتنہ کار ہوتی تھیں، مالِ غنیمت کی طرح فوج میں تقسیم کر دی جاتی تھیں اور بازاروں میں بھی بیچنے کے لیے لائی جاتی تھیں کہ جو کوئی ان سے اپنی خواہشوں کو آسودہ کرنا چاہت انہیں خرید لے۔۔۔۔ عورتوں کے متعلق جو قصے بیان کئے گئے ہیں وہ بہت مشہور اور ان میں سے بعض بڑی شخصیتوں سے منسوب ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حسین کنیزوں کا انتخاب اس دور میں ایک عام سی بات تھی جس سے کسی کو انکار ہوتا تھا نہ معاشرہ اسے قابلِ ملامت سمجھتا تھا۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت خالدؓ بن ولید اور اس مرتبے کے دوسرے صحابہ نے ایران و روم کی کنیزیں اپنے لیے پسند فرمائیں۔۔۔ صاحب اغانی کی روائت ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ لیلیٰ بنت جودی غسانی کے والہ و شیدا ہو گئے۔ انھوں نے اس فتنہ کار حسینہ کو ایک رات بیت المقدس میں دیکھا تھا کہ وہ کنیزوں اور دوسری عورتوں کے جھرمٹ میں چلی جا رہی ہے جو ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جب کسی کو ٹھوکر لگتی وہ تو اس کی زبان سے بے ساختہ اے بنت جودی! نکل

جاتا ہے اور جب کوئی قسم کھاتی ہے تو جنت جودی کی قسم کھاتی ہے۔''

ایک واقعہ بنو ہلال کی ایک عورت ام جمیل سے متعلق ہے جو امراء اور اشراف کے پاس آتی جاتی تھی۔ عہد فاروقی میں بصرہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ کے پاس بھی اس کا آنا جانا تھا۔ یہی بات ان کی معزولی کا باعث بنی۔ اسی واقعہ کے ضمن میں طبری لکھتا ہے کہ عہد فاروقی میں بعض عورتوں کا یہی چلن تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی عرب معاشرہ مردوں کی جنسی خواہش کی من مانے انداز میں تسکین کے لیے آئیڈیل صورت رکھتا تھا جسے مذہبی قانون کا تحفظ بھی حاصل تھا۔

ابتدائی اسلامی دور میں لونڈیوں سے حظ اٹھانے کے علاوہ متعہ یعنی عارضی شادیوں کا رواج بھی عام تھا۔ نئی شادیوں کی خاطر جلدی جلدی طلاق دینے کا رجحان عروج پر تھا۔ متعہ اور طلاق کے حوالے سے حضرت عمرؓ کے اجتہادی فیصلوں کے نفاذ سے کافی تبدیلی آئی مگر لونڈیوں کا معاملہ ویسے کا ویسا ہی چلتا رہا۔ اس عہد کے کچھ واقعات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان کی جنسی جبلت اتنی منہ زور ہے کہ ... ت ترین سزا جیلوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ یہ واقعہ ایک عورت کا ہے جو رات کے وقت اس قدر بلند آہنگ آواز سے مدینے کے خوبروترین شخص نصر بن حجاج کے فراق میں شعر گا رہی تھی کہ اس عفیفہ کی آواز مدینہ کی گلیوں میں گشت کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کے کانوں تک پہنچ گئی۔ شعر کے بول کچھ یوں تھے۔

ہے کوئی صورت میری بادہ نوشی کی

اور ہے کوئی سبیل کہ میں نصر بن حجاج کے پاس پہنچ سکوں

یعنی وہ خاتون اسلامی خلافت کے آئیڈیل ترین عہد میں نہ صرف شراب نوشی کی خواہش کر رہی ہے بلکہ اپنے جیتے جاگتے محبوب کی قربت کے لئے تڑپ رہی ہے۔ نہیں معلوم کہ اس بلند آہنگ اور بے باک خواہش کے نتیجے میں عورت کے ساتھ کیا بیتی مگر تاریخ یہ ضرور بتاتی ہے کہ نصر بن حجاج کا انجام برا ہوا۔ حکم دیا گیا کہ اس کے خوبصورت لمبے بال مونڈ دیئے جائیں۔ جب دیکھا کہ اس کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہیں پڑا تو کہا کہ اس کے منہ پر کالک مل دی جائے۔ مگر اس ترکیب سے بھی اس کا حسن ماند نہ پڑا۔ تب حکم دیا کہ اسے مدینہ بدر کر کے بصرہ بھیج دیا جائے۔ ایک بار گشت کرتے ہوئے انھوں نے

پنہ عورتوں کے منہ سے ایک اور نوجوان کی ابوذیب کی بے مثل خوبصورتی کی تعریف سنی۔ اس نوجوان کو بھی بصرہ میں جلاوطنی کی سزا کا حکم ملا۔ امیر المؤمنینؓ نے ابوذیب کی عورتوں کو لبھانے والی بے پناہ مردانہ وجاہت کی وجہ سے اسے 'عورتوں کا بھیڑیا' کہا۔

یہ واقعات بتاتے ہیں کہ سخت ترین ضابطوں کے اس دور میں بھی عورتیں اپنے جذبات کے اظہار میں کتنی بے باک تھیں کہ بلند آواز سے عشقیہ شعروں میں اپنے محبوب کا نام لیتی تھیں۔ جہاں تک مردوں کا تعلق ہے انھیں شائد اس تردد میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ ان کی دلبستگی کے لیے لونڈیوں کی صورت میں ایران اور روم کی حسیناؤں کے علاوہ بیویوں کے طور پر اپنے ہم کفو عرب اشراف کی خواتین بآسانی دستیاب تھیں۔ وہ کسی بھی پسندیدہ خاتون کو براہ راست یا کسی کے توسط سے نکاح کا پیغام دینے میں آزاد تھے۔

اسلام سے پہلے ہمیں کثیر ازدواجی کا رواج ذرا کم ملتا ہے۔ یہ ترغیب غالباً اس لیے دی گئی کہ مسلمانوں کی اقلیت کم وقت میں اکثریت میں بدل سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جن صحابہ کی عمر قبول اسلام کے وقت زیادہ تھی انہوں نے کم تعداد میں شادیاں کیں اور جو قدرے جوان تھے ان کی شادیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے بالترتیب چار، آٹھ آٹھ اور نو شادیاں کیں جبکہ حضرت علی کے حرم میں وفات کے وقت چار عدد بیویوں کے علاوہ اُنیس لونڈیاں بھی شامل تھیں۔ تاریخ میں حضرت حسن اور حسین کی متعدد شادیاں مذکور ہیں اگرچہ ان کی تعداد پر اختلاف ہے۔ بہر حال مسلمانوں میں کثیر ازدواجی کو مذہبی رعائت کے طور پر لیا جاتا ہے جس کے لیے کئی دلائل دیئے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد کی جنسی تسکین کے لیے ایک عورت کافی نہیں ہوتی جبکہ عورت کے لیے صرف ایک مرد کافی ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ زیادہ شادیاں مرد کو بے راہروی سے محفوظ رکھتی ہیں۔ (کیا یہ دلیل اس بات کی جانب واضح اشارہ نہیں کہ خود مرد یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ بے راہروی کی بیماری کا تعلق ان کی اپنی ذات سے ہے نہ کہ عورتوں سے؟) یہ معاملہ ہندوستانی مسلم سماج میں رائج شادی بیاہ کے رواج سے بہت مختلف تھا کہ ہمارے ہاں تو بیٹے کا صرف ایک رشتہ مانگنے کے لیے والدین کی

جوتیاں گھس جاتی ہیں۔ یاد رہے کہ یہ اس دور کی جھلک ہے جسے اسلامی تاریخ کا سب سے آئیڈیل دور کہا جاتا ہے۔ خلافت راشدہ کے اختتام اور ملوکیت کی ابتدا کے بعد تو خلفاء کے حرموں کی داستان رنگین سے رنگین تر ہوتی چلی گئی اور پھر اس کا تتبع پورے جوش و خروش کے ساتھ ہمیں ہندوستان پر ہزار برس تک حکومت کرنے والے مسلمان بادشاہوں کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے ہاں فحاشی کو سب سے زیادہ آرٹ اور کلچر سے جوڑا گیا۔ خاص طور پر فلم کا شعبہ اس بدنامی میں سب پر بازی لے گیا۔ یہ واحد شعبہ تھا جس میں شریف گھرانوں کی تعلیم یافتہ خواتین آنے سے ہمیشہ گریزاں رہیں۔ اس شعبے میں جس طرح کی بے باکی درکار تھی اس کی اہلیت صرف طوائفوں میں پائی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری فلم انڈسٹری کو سب سے زیادہ ہیروئنیں اسی بازار سے دستیاب رہیں۔ ہمارے ہاں یہ خیال عام ہے کہ فلم میں ہیروئن آنے کے لیے کم از کم پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کا بستر گرم کرنا ضروری ہے۔ کئیوں کے بارے میں تو یہ کہانیاں بھی عام ہیں کہ وہ مہنگے معاوضے پر بالکل عریاں مجرے بھی پیش کرتی ہیں۔

اگر ہم پاکستان کی ماضی قریب کی تاریخ کی جانب نظر کریں تو سب سے پہلے بھٹو دور میں چند پنجابی فلمیں جیسے 'خانزادہ' اور 'خطرناک' بنیں جنھیں اس وقت انتہائی فحش گردانا گیا۔ اس دور میں سینما مالکان بچ بچا کر بلیو فلموں کے ٹوٹے بھی چلا دیا کرتے تھے۔ مگر عریاں فلموں کی وبا نے اصل رنگ اسلامی نظام کے دعویدار جنرل ضیاالحق کے زمانے میں پکڑا جب کئی سینما صرف فحش انگریزی فلموں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئے تھے۔ اس دور میں کئی نمازی پرہیزگاری باریش حضرات چہرہ لپیٹ کر یہ فلمیں دیکھنے آتے تھے اور اپنی نا آسودہ خواہشوں کو ٹھنڈا کیا کرتے تھے۔ یہی وہ دور تھا جب وی سی آر متعارف ہوا، جس کی ڈیمانڈ اتنی زیادہ تھی کہ گلی گلی ٹی وی اور وی سی آر کرائے پر دینے والی دوکانیں کھل گئیں جہاں انڈین فلموں کے ساتھ ساتھ ہر طرح کی دیسی اور ولائتی بلیو فلمیں عام دستیاب تھیں۔ اکثر نوجوان گروپوں کی شکل میں پوری پوری رات یہ فلمیں دیکھتے اور اپنی جنسی آگ کو بھڑکاتے اور بجھاتے تھے۔ اسی زمانے میں تھیٹر سنجیدگی سے محروم ہو کر جگت بازوں کے ہاتھ چڑھا اور آرٹ کے نام پر ایک سے

بڑھ کر ایک فحش جگت تخلیق کی گئی جس میں ماں اور بہن کے رشتے کی سب سے زیادہ تذلیل کی۔ مزید یہ کہ سٹیج ڈرامے میں رقص کے نام پر عریاں اور فحش ڈانس بھی شامل کر دیے گئے۔ اور یوں آرٹ اور ڈلگیرٹی کو ہم معنی بنا دیا گیا۔

ضیا الحق کے دور میں متشدد اور بلیو فلموں سے عوام کی نفسیات کو اتنا بگاڑ دیا گیا کہ سماجی موضوعات کی فلمیں ان کے لیے انتہائی پھس پھسی ہو کر رہ گئیں اور یوں سینما تیزی سے اپنی وقعت کھوتا چلا گیا۔ یہی وہ دور تھا جب سینماؤں کی اکثر عمارتیں پلازوں میں تبدیل ہونے لگیں اور باقی ماندہ پر پھکڑ جگت بازوں نے قبضہ جما لیا جہاں عوام الناس کو اپنی جنسی نارسائیوں کا کیتھارسز کرنے کے مواقع نصیب ہونے لگے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مذہبی واعظین کا فحاشی اور عریانی کے خلاف شور بھی بلند آہنگ ہونے لگا۔ یہ وہ دور تھا جب عورت کے وجود کو مکمل طور پر فحش ڈکلیئر کر دیا گیا۔ اپنے تیئں فحاشی کو ختم کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جہاں کسی ہورڈنگ پر کسی خاتون ماڈل کی تصویر دکھائی دیتی اسے سیاہ پینٹ پھینک کر مسخ کر دیا جاتا۔ مگر اس طریقے سے فحاشی ختم کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ تو خود فحاشی کے خلاف مہم چلانے والوں کے دماغوں میں سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔

ہمارے ہاں عورت، عریانی اور فحاشی لازم و ملزوم گردانے جاتے ہیں۔ یہاں فحاشی کی مروجہ مذہبی تعبیر کے مطابق عورت کے جسم کا ہر حصہ حتیٰ کہ بال بھی ستر کا درجہ رکھتے ہیں، گو کہ عملی زندگی میں اس معیار کی خلاف ورزی کا چلن عام ہے۔ عام فہم کے مطابق عورت ایک انتہائی مختلف قسم کی مخلوق ہے جسے خدا نے مرد کو راحت پہنچانے، اس کی نسل بڑھانے اور حکم ماننے کے لیے پیدا کیا ہے۔ مذہبی علما کے وعظوں کے مطابق عورت کا اصل مقام گھر کی چار دیواری ہے سو اسی لیے اسے تعلیم کے نام پر گھر گرہستی سے متعلق چند باتیں ہی سیکھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ ان کے خیال میں عورت اگر اس دائرے سے باہر قدم رکھے گی تو وہ عورت نہیں رہے گی۔ دلچسپ بات یہ کہ محسنِ قوم سرسید اور حکیم الامت اقبال بھی اس معاملے میں روایتی مُلا کے کاندھے سے کاندھا ملائے کھڑے نظر آتے ہیں۔
(اس حوالے سے تفصیلی تذکرہ آپ اگلے صفحات میں پڑھ سکیں گے۔)

الیکٹرانک میڈیا کے عام ہونے کے بعد ہر فرد، خاص طور پر مذہبی شخصیات اور دائیں بازو کے دانشور اور کالم نگار فحاشی کے خلاف دہائی دیتے نظر آتے ہیں۔ایک کالم نگار کا تو ہر تیسرا کالم اسی موضوع پہ ہوتا ہے۔ان کا بس چلے تو نہ صرف اکثر ٹی وی چینلز کو بند کر دیں بلکہ خواتین کے بھی گھر سے باہر نکلنے پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ان کے نزدیک فحاشی کا مسئلہ مالی کرپشن سے بھی زیادہ اہم ہے۔سوال یہ ہے کہ آخر یہ فحاشی ہے کیا جس نے ہمارے معززین کی نیندیں اڑا رکھی ہیں؟

فحاشی کیا ہے؟

کسی بھی سماجی مظہر کی طرح فحاشی کی بھی کوئی ایسی تعریف متعین کرنا ممکن نہیں جس پر دنیا کی جملہ اقوام کا اتفاق ہو سکے۔ بلکہ ایک ہی علاقے یا ملک میں مختلف طبقات اور ثقافتی گروہوں کے نزدیک بھی اس کا مفہوم الگ الگ ہوگا۔ اگر ہم پاکستان کی بات کریں تو نہ صرف دیہات اور شہر کے باسیوں کی تفہیم مختلف ہوگی بلکہ شہر میں موجود الیٹ، مڈل کلاس اور لوئر کلاس کی تفہیم میں بھی بہت نمایاں اختلاف دیکھا جاسکتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی اپنی کلاس میں بھی لوگ ایک دوسرے سے مختلف رائے کے حامل ہوں گے۔ اور یہ فرق ان کے رہن سہن، روزمرہ کی گفتگو اور لباس میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے مڈل کلاس ایک عمدہ مثال بن سکتی ہے۔ اس کلاس میں لباس اور سوچ کے حوالے سے کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ مڈل کلاس میں جہاں ایک طرف چادر یا سکارف والی خواتین پائی جاتی ہیں وہیں جدید تراش خراش والا لباس پہنے اور زلفوں کو لہراتی خواتین بھی ملیں گی۔ یہ صورتحال اپر مڈل کلاس سے لوئر مڈل کلاس تک میں عام دیکھنے کو ملتی ہے۔ رہن سہن اور لباس کا یہی فرق اس کلاس کے افراد کے تصورِ فحاشی میں بھی منعکس ہوتا ہے۔

اگرچہ مذہبی ذہن کے افراد کو فحاشی کے مظہر کے بارے میں سب سے زیادہ حساس سمجھا جاتا ہے مگر ان کی سوچ سے بھی فحاشی کی کوئی یکساں تعریف اخذ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ حضرات تو ابھی تک یہ طے نہیں

کر پائے کہ عورت کے پردے کی حدود و قیود کیا ہیں اور نہ ہی آج تک یہ قرآن و احادیث سے کوئی یکساں معیار اخذ کر پائے ہیں۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو اب تک خود علماء کے درمیان ہونے والے اختلافی مباحث ختم ہو چکے ہوتے۔ ایک طرف آرتھوڈاکس گروہ ہیں جن کے نزدیک پردے کی شرائط اتنی کڑی ہیں کہ عورت کے ہاتھ اور پاؤں بھی ستر میں شامل ہیں اور دوسری طرف جدید تبدیلیوں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے والے خاندان بھی ہیں جن کے ہاں خواتین کا گھر سے باہر نکلنا، مخلوط اداروں میں تعلیم حاصل کرنا، ملازمت کرنا اور ضروری کاموں کے سلسلے میں اجنبی مردوں سے بات چیت کرنا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ یقیناً ایسی خواتین کو پردے کی سختی سے پابندی کرنے والی خواتین کی جانب سے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

الہامی مذاہب کے پیروکاروں میں عمومی طور پر عورت اور فحاشی کو لازم و ملزوم خیال کیا جاتا ہے۔ یعنی جہاں عورت ہوگی وہیں فحاشی کا امکان بھی پیدا ہو جائے گا۔ اس سوچ کے پیچھے آدم اور حوا کی کہانی کھڑی ہے جس کے مطابق اولین مرد کو عورت کی وجہ سے بہشت بدر ہونا پڑا۔ حالانکہ اس کہانی کے مطابق شیطان کے بہکانے سے پہلے دونوں بہشت میں عریاں گھومتے تھے۔ جب انہیں شیطان کے بہکانے کے بعد برہنگی کا احساس ہوا تو انہوں نے انجیر کے پتوں سے اپنے ستر ڈھانپے۔ تو گویا فحاشی کی وجہ آدم و حوا کی عریانی نہیں بلکہ وہ ذہنی تبدیلی تھی جو شیطان کے بہکانے کے بعد پیدا ہوئی۔ فحاشی کے بارے میں ہماری زُود حسی کو سمجھنے کے لیے یہ بات ایک بلیغ اشارہ ہے۔

مشرقی معاشروں کے باشندوں کی جنسی حساسیت جہاں کہ عورت کو ملفوف رکھنے پر ضد کی حد ز ور دیا جاتا ہے، حد سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ جبکہ وہ مغربی معاشرے جہاں ساحلوں پر مختصر ترین لباس میں دھوپ سینکنے کا چلن عام ہے، وہاں کوئی شاذ ہی کسی دوسرے کو نظر بھر کے دیکھتا ہوگا۔ ہمارے ہاں تو ایسے حضرات بھی ہیں جنہیں پسٹن کی حرکت اور قلم دان میں بھی فحاشی دکھائی دے جاتی ہے۔ ہاتھ اور پاؤں انسانی جسم کے وہ اعضاء ہیں جو کوئی بھی کام کرتے ہوئے سب سے زیادہ استعمال میں آتے ہیں اور یہ ستر میں بھی شامل نہیں ہیں۔ ہاں البتہ کسی سماج میں اگر انہیں بھی ملفوف رکھنے کے اخلاقی

ضابطوں کا نفاذ کر دیا جائے تو یقیناً وہاں کے مردوں کی جنسی خواہش عورتوں کے ہاتھ اور پاؤں دیکھ کر بھی انگیخت ہو جائے گی۔ اور اسے کسی صورت صحت مندرویہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے ہاں جو کلاسیکل شاعری تھی اس میں محبوب کی کمر (جس میں پیٹ بھی شامل ہے) کی نزاکت کا بے جا حد تک تذکرہ ملتا ہے اور شاعر حضرات اس پہ ریشہ ختمی دکھائی دیتے ہیں۔ اب صورت یہ ہے کہ ہندوستانی فلموں نے کمر کے بارے میں ہماری حساسیت کو بہت حد تک نارمل کر دیا ہے۔ مقبول شاعر جون ایلیا نے تو اپنی شاعری میں پیالۂ ناف کی اصطلاح بھی کئی جگہ برتی ہے۔ معلوم نہیں یہ اصطلاح عورت کی قربت سے محروم مردوں کے صبر کا کیا کیا امتحان نہیں لیتی ہوگی۔

پینٹنگ اور سکلپچر میں نیوڈ اور پورن کی اصطلاحیں مروج ہیں۔ نیوڈ سے مراد ایسی بے لباسی ہے جو جذبات میں ہیجان پیدا نہ کرے اور پورن ایسی پینٹنگ، سکیچ یا سکلپچر ہے جو دیکھنے والے کے جنسی جذبات کو انگیخت کرے بھلے اس میں لباس کا مکمل اہتمام ہی کیوں نہ کیا گیا ہو۔ کوئی بھی ایسی سوسائٹی جہاں جسموں کو بے جا طور پر چھپانے کا چلن ہو گا وہاں فحاشی کا احساس چھوت کی بیماری طرح پھیل جاتا ہے۔ بلکہ معاملہ یہاں تک پہنچتا ہے کہ بظاہر عورتیں پردے میں ملفوف ہوتی ہیں مگر مرد انہیں کسی نہ کسی صورت عریاں دیکھنے کی خواہش میں مبتلا رہتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنا تصور اس انتہا تک لے جاتے ہیں کہ اپنے تیئں دیکھ بھی لیتے ہیں۔

فحاشی ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے جس کا تعلق اگر چہ عورت سے جوڑا جاتا ہے مگر درحقیقت یہ مرد کی سوچ سے مخصوص ہے۔ ہم اسے مردوں کی سیکوئل فرسٹریشن کا پیمانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ عورت جتنی زیادہ ملفوف اور مردوں کے لیے اجنبی ہوگی ان کی جنسی خواہش اسی قدر زُود حس ہوتی چلی جائے گی۔ اور جنسی حساسیت کی یہی کیفیت سوسائٹی میں فحاشی کا پیمانہ ٹھہرے گی۔ فحاشی اور چھپانے کا عمل لازم و ملزوم ہیں۔ مغرب کے لوگ ایک کھلی اور آزاد زندگی جیتے ہیں۔ کم و بیش ہر جگہ مرد اور عورتیں مل جل کر کام کرتے ہیں۔ وہاں کسی نوجوان لڑکی یا ادھیڑ عمر کی عورت کو اپنی حفاظت کے جھوٹے احساس کے لیے نقاب اوڑھنے کے ساتھ ساتھ چھوٹے بچے کی انگلی تھام کر باہر نہیں نکلنا پڑتا، جبکہ ہمارے ہاں

یہ منظر روزمرہ کا حصہ ہے۔ وہاں اپنی جنسی خواہش کو چھپانے اور جھوٹ بولنے کا چلن نہیں۔ انہیں کوئی خاتون اچھی لگے تو بڑی آسانی سے پوچھ لیتے ہیں کہ کیا وہ ان کی دوست بننا پسند کرے گی۔ اگر وہ انکار کر دے تو برا نہیں مناتے اور نہ ہی ہماری طرح ان کا گھر تک پیچھا کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہاں سبھی دودھ کے دھلے ہیں مگر کوئی بھی سوسائٹی اپنے اجتماعی اور عمومی رویوں سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ ان کے ہاں فحش ہونے کا مطلب کسی دوسرے کے جنسی جذبات کو زبردستی انگیخت کرنا ہے۔ وہاں لوگ اکثر میلوں ٹھیلوں میں برہنہ شامل ہوتے ہیں مگر نہ تو کوئی اوئی اللہ کی آواز بلند ہوتی ہے اور نہ کوئی اُف اُف کی گردان کرتا دکھائی دیتا ہے۔ کئی مواقع پر خواتین بے لباسی کو احتجاجی مظاہرے کے طور پر استعمال کرتی ہیں مگر شائد ہی کوئی ہو جو ان واقعات کو ایک احتجاج سے زیادہ اہمیت دیتا ہو۔ ہمارے ہاں تو ٹیلی ویژن پر ٹینس کھیلتی ہوئی گوری خواتین کو بھی جنسی مزے کے لیے دیکھا جاتا ہے۔ خواتین کی ریسلنگ ذوق وشوق سے دیکھنے میں بھی یہی راز پنہاں ہے۔ اگر فحاشی کا تعلق سماجی تربیت سے بننے والی سوچ کی بجائے کم لباسی یا برہنگی سے ہوتا تو سب سے زیادہ مغربی ممالک اور افریقہ کے برہنہ اور نیم برہنہ قبائل اس نفسیاتی بیماری کا شکار ہوتے۔ مگر ان قبائل کی خواتین تو برہنہ ہونے کے باوجود اتنے اعتماد سے چل پھر رہی ہوتی ہیں کہ ہماری سرتا پا لپٹی خواتین میں اس اعتماد کا عشرِ عشیر بھی نہیں پایا جاتا۔

اگر ہم یہ کہیں کہ فحش سوچ کا تعلق خاص طور پر مردوں سے ہے نہ کہ عورتوں سے، تو یہ بات کچھ غلط نہیں ہوگی۔ اس کی وجہ شائد یہ بھی ہے کہ مرد ایک ایسا وجود ہے جو دیکھنے کو عام دستیاب ہے، جو کسی برقعے میں ملفوف نہیں پھرتا۔ اس کا نیم برہنہ پایا جانا بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں اور یہ مناظر ہمارے دیہات میں عام ہیں جہاں شدید گرمی میں مرد صرف دھوتی پہننے کا تکلف بھی بمشکل کرتے ہیں اور کئی بار تو اسے بھی لنگوٹ میں بدل لیتے ہیں۔ یہ ایک عام اصول ہے کہ کوئی شے بار بار دکھائی دے تو تجسس اور دلچسپی کھو کر بالکل عام سی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

اگر ہم یوں کہیں کہ فحاشی دراصل وصل سے محرومی کا شاخسانہ ہے اور وہ بھی خاص طور پہ مرد کے لیے، تو کچھ غلط نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جن سوسائٹیوں میں دو افراد کی آزادی سے ملنے والے وصل کے

مواقع بداخلاقی بلکہ حرام کاری کا درجہ رکھتے ہوں، وہاں معمولی سی عریانی یا برہنگی بھی فحاشی کے شدید احساس میں ڈھل جاتی ہے جبکہ مغربی معاشرت میں یہ بیمار احساس قدرے ناپید ہے۔ غور کیا جائے تو فحاشی فحاشی کا شور مچانے والے افراد ہی عریانی کے سب سے زیادہ دلدادہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بظاہر بڑے متشرع اور شریف دکھائی دیتے ہیں مگر ان کے ذہن ہمہ وقت عورتوں کے بارے میں غلیظ جنسی خیالات سے بھرے رہتے ہیں اور جہاں موقع ملتا ہے گٹر کی طرح ابل پڑتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ بیجا پردگی اور فحش سوچ کا چولی دامن کا ساتھ ہے تو بالکل غلط نہیں ہوگا۔

آزادی سے غلامی تک کا سفر

ماضی بعید اور خطۂ عرب کی آزاد عورت

ایک زمانہ تھا جب عورت ایک آزاد ہستی تھی، نہ مرد سے کم تر نہ برتر۔ دونوں کا تعلق بس ایسا ہی تھا جیسے جانوروں میں نر اور مادہ کا، جس میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ عورت اور مرد دونوں کسی بھی مخالف جنس کے فرد سے تعلق بنانے میں آزاد تھے۔ وقت کے بہاؤ میں پھر ایک ایسا پڑاؤ بھی آیا جب ساتھی کا انتخاب اور ان کی تعداد کا اختیار عورت کے ہاتھ میں آ گیا۔ یہ دور کم و بیش پانچ لاکھ برس پر محیط رہا۔ یہ عورت کی مرضی تھی کہ وہ مردوں میں سے کس کو اذنِ باریابی بخشے اور کسے انکار کر دے۔ اس اندازِ زیست کے آثار ہمیں اسلام سے پہلے کی عرب سوسائٹی میں بھی ملتے ہیں جب عورت خیمے کا رخ بدل کر یہ پیغام دیتی تھی اب کون سے مرد کا اس کی زندگی میں داخلہ ممنوع ہو چکا۔ دوسرے لفظوں میں مرد ساتھی کا انتخاب اور اسے طلاق دینے کا حق صریحاً عورت کو حاصل تھا۔

گو یہ اس وقت کی عرب سوسائٹی کا عام چلن نہیں تھا مگر یہ ماضی قدیم میں جاری عورت کی پردھانگی کی ایک اہم علامت ضرور تھا۔ خود پیغمبرؐ کی پہلے نکاح میں حضرت خدیجہؓ کی جانب سے پہل قدمی قبل از

اسلام عورت کی آزاد حیثیت کا اہم ثبوت ہے۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ کا کردار بھی ایک اہم مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اور پھر وہ ریحانہ نام کی خاتون جس نے غلامی کی حالت میں بھی نہ صرف اسلام بلکہ آپ کی زوجیت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تاریخ کے مطابق ریحانہ بی بی نے ازواج پیغمبرؐ کے برعکس غالباً پردے میں رہنا بھی قبول نہیں کیا تھا۔ اسی طرح بنو قریضہ کی اس عورت کی مثال بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے جو ہنستی ہوئی سر کٹانے کے لیے مقتل کی طرف بڑھی تھی۔ بقول حضرت عائشہؓ ''واللہ میں اس عورت کو نہیں بھلاسکتی جو مقتل میں خوش و خرم آئی اور ہنستے ہوئے اپنی گردن جلاد کے آگے رکھ دی۔''

سچ تو یہ ہے کہ اس وقت کے عرب میں عورت ہمیں بہت دبنگ اور آزاد دکھائی دیتی ہے۔ وہ میلوں ٹھیلوں میں کھلے بندوں مردوں سے ملتی، عشوہ و ادا کے تیر چلاتی اور ساقی گری کرتی دکھائی دیتی ہے۔ قبل از اسلام حج سے پہلے عکاظ کا میلہ عربوں کی زندگی میں اہم ترین تہوار کا درجہ رکھتا تھا۔ اس میلے کی عکاسی معروف مصری تاریخ دان حسین ہیکل اپنی کتاب ''حضرت عمر فاروقؓ'' یوں کرتا ہے:

''بعثت نبویؐ سے چند سال پہلے کی بات ہے کہ میں دعتد کا چاند طلوع ہوا اور جزیرہ نمائے عرب کے مختلف گوشوں سے عرب سانڈنی سواروں کا ایک طوفان امنڈ پڑا جو ہر سال حج سے پہلے عکاظ کے میلے میں شرکت کے لیے آتے تھے۔ میلہ مختلف قبائل کے تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جن میں مکہ والوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ بطحا کے وسیع میدان میں جہاں یہ میلہ بھرتا تھا عربوں نے اپنے خیمے گاڑ دیے تھے اور اس کا ایک حصہ تجارت کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اس حصے میں تاجروں نے خیموں کے سامنے اپنی دوکانیں آراستہ کی تھیں جن میں حجازی مصنوعات بہت کم اور شام و یمن کی وہ مصنوعات بکثرت تھیں جو مکہ اور اس قرب و جوار کے لوگ جاڑے اور گرمی کے سفروں میں لائے تھے۔ دوکانوں پر مردوں اور عورتوں کا جمگھٹا تھا جو اپنی اپنی پسند کی چیزیں خرید رہے تھے۔ عورتیں زیادہ تر کپڑے کی دوکانوں پر تھیں۔ مختلف رنگ اور

بناوٹ کے کپڑے اٹھاتیں، اُنھیں الٹ پلٹ کے دیکھتیں اور شام ویمن کے بنے
ہوئے ان نظر فریب کپڑوں میں سے جو کپڑا انھیں پسند آتا خرید لیتیں۔ان میں اگر کوئی
طرح دار حسینہ ہوتی تو بے فکرے نوجوانوں اور پختہ کار مردوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی جو
بظاہر خریداری کے لیے آتے۔لیکن دراصل کپڑوں اور سامان سے زیادہ انھیں اس کافر
ادا کے حسن و جمال سے آسودہ ہونے کا شوق بے چین کرتا۔ان دوکانوں کے قریب
ہی عیش و نشاط کے اڈے تھے جہاں دن کو عموماً اور رات کو خصوصاً نوجوانوں کی ایک بھیڑ
سی لگی رہتی۔ان محفلوں میں عرب کی فتنہ فروش عورتیں بھی بے تکلف شریک ہوتی
تھیں۔رات کے اندھیروں میں بساط طرب بچھائی جاتی اور عرب کے من چلے جام و
ساغر سے کھیلنے لگتے۔"

عربوں کے ہاں ہی نہیں بلکہ حضرت ابراہیم کے زمانے کا بائبل میں حضرت لوط اور ان کی بیٹیوں کے
حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ بیان ہوا ہے جو جنسی تعلق بنانے کے حوالے سے عورت کے آزادانہ
فیصلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ہم یہ قصہ بائبل کے اپنے الفاظ میں ہی بیان کیے دیتے ہیں۔

"اور لوط ضغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا۔اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں۔
کیونکہ اسے ضغر میں بستے ڈر لگا۔اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے
لگے۔تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بڈھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو
دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے۔آ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس
سے ہم آغوش ہوں تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔سو انہوں نے اسی رات اپنے
باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔پر اس نے نہ
جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی۔اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے
کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔آؤ آج رات بھی اس کو مے
پلائیں اور تُو بھی جا کر اس سے ہم آغوش ہو تاکہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔سو

اس رات بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی گئی اور اس سے ہم آغوش ہوئی۔ پر اس نے نہ جانا کہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی۔ سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور بڑی کے ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام موآب رکھا۔ وہی موآبیوں کا باپ ہے جواب تک موجود ہیں۔ اور چھوٹی کے بھی ایک بیٹا ہوا۔ اور اس نے اس کا نام بن عمی رکھا۔ وہی بنی عمون کا باپ ہے جو آج تک موجود ہیں۔"

اگر آدم اور حوا کے قصے پر غور کریں تو وہاں بھی انسان کے پہلی بار ہم آغوش ہونے کے واقعہ میں پہل کرنے کا اشارہ واضح طور پر حوا یعنی عورت کی جانب جاتا ہے جس نے شیطان کے بہکانے پر آدم کو شجر حیات کا پھل گندم یا سیب کھانے کی طرف مائل کیا۔ یہ واقعات بھلے حقیقی نہ بھی ہوں مگر بذاتِ خود ان کی تمثیلی حیثیت بھی مختلف ادوار میں رائج سماجی اقدار کی طرف بلیغ اشارہ کرتی ہے۔

اب اگر مذہبی اساطیر سے نکل کر تاریخ کی دنیا میں قدم رکھیں تو ایسے حقائق منکشف ہوتے ہیں جنہیں اگرچہ ہمارا زنگ آلود ذہن سچ ماننے سے انکار کرسکتا ہے لیکن حقائق تو حقائق ہیں اور وہ ہمارے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے مشروط نہیں ہوتے۔ میکسیکو کے ایک قبیلے 'تارا ہمارے' کے بارے میں ڈاکٹر لمبولٹز لکھتا ہے کہ

> "ملکی قانون لڑکی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ شوہر کا انتخاب خود کرے۔ اسے اپنی پسند کے نوجوان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہر طرح کی پیش قدمی کی اجازت ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے خصوصی ضیافتیں منعقد کی جاتی ہیں جن میں مقامی کشید کردہ شراب وافر مقدار میں پیش کی جاتی ہے۔ لڑکی اپنی پسند کے لڑکے کے سامنے کھڑی ہو کر، ایک ہی جگہ پر پشت کی جانب سے مختلف طرح کے پوز بناتی ہے۔ لڑکا اگر اس کا مطلب نہ سمجھ سکے تو لڑکی کے والدین اس کے والدین سے کہتے ہیں کہ ہماری بیٹی تمہارے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد وہ لڑکی کو لڑکے کے گھر بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ ایک دوسرے سے شناسا ہو جائیں۔ دو تین دن تک وہ ایک دوسرے سے بات چیت

نہیں کرتے۔ بالآخر لڑکی ایک کمبل اوڑھ کر لڑکے کی طرف کنکریاں پھینکتی ہے۔ اگر لڑکا کنکریاں واپس پھینکے تو لڑکی سمجھ لیتی ہے کہ وہ جیت چکی ہے۔ لڑکا اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے کے بعد جنگل کی طرف نکل جاتا ہے اور لڑکی بھی کمبل پھینک کر اس کے پیچھے چل پڑتی ہے۔"

برٹش کولمبیا کے ریڈ انڈئین کے ہاں ایک خاص موسم میں مخلوط رقص کی تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جوڑا جوڑا رقص کے دوران لڑکا جس لڑکی کی بیلٹ پکڑ لیتا ہے اگر وہ اسے قبول کر لے تو دونوں کو اسی تقریب میں میاں بیوی ڈکلیئر کر دیا جاتا ہے۔ ایک دوسرے قبیلے میں اگر لڑکی دوران تقریب اپنی پسند کے نوجوان کے سر یا بازو پہ ہاتھ رکھ دے تو لڑکا اسے بیوی بنا لیتا ہے۔ ہاں البتہ انکار لڑکی کے لیے شرمندگی کا باعث بنتا ہے اور کچھ تو ردعمل میں خودکشی تک کر لیتی ہیں۔

نیوگنی کے اکثر قبیلوں میں شادی تجویز لڑکی کی طرف سے ہی آتی ہے۔ شمالی نیوآئر لینڈ کے قبیلہ ماورمی میں نوجوان لڑکے لڑکیاں جب رات کے وقت اکٹھے ہوتے ہیں تو کئی قسم کی تفریحات سے جی بہلاتے ہیں اور اس دوران انہیں ایک دوسرے کی طرف پیش قدمی کے کھلے مواقع ملتے ہیں۔ ان میں عموماً طور پر پہل لڑکی کی جانب سے ہی ہوتی ہے۔ اس طرح بننے والے جوڑے ایک دوسرے کو اپنا جیون ساتھ بنا لیتے ہیں۔

آسام کے ایک قبیلہ گارو میں روایت کے طور پر لڑکی کا حق ہی نہیں بلکہ فرض ہے کہ وہ اپنا جیون ساتھی خود منتخب کرے۔ جنوبی افریقہ کے قبیلہ زولو کی ایک شاخ ونگونی میں بھی عورت ہی خاوند کا انتخاب کرتی ہے۔ اس قبیلے میں باقاعدہ لڑکی کی بلوغت کی تقریب منائی جاتی ہے اور لڑکی اس تقریب سے فارغ ہوتے ہی سہیلیوں کے ساتھ اپنے پسندیدہ نوجوان کے گھر جاتی ہے۔ ان لڑکیوں کے ہاتھ میں تازہ سبز شاخیں ہوتی ہیں۔ وہاں مترنم گیتوں کے ذریعے اعلان کرتی ہیں کہ انہوں نے دولہا منتخب کر لیا ہے۔

جزائر انڈیمان کے بارے میں ایک رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی دو یا تین شوہر رکھنے کا حق حاصل ہے اور حیرت کی بات یہ کہ ان کے ہاں طلاق کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسی

طرح آئی لینڈز کے قبیلہ ہیڈا کی عورتیں اپنے ہم قبیلہ جتنے مردوں سے چاہیں جنسی تعلق بنا سکتی ہیں۔
ہاں البتہ دوسرے قبیلوں کے مردوں سے شاذونادر ہی تعلق قائم کرتی ہیں۔

جزیرہ نمائے کیلی کے مرد اور عورت بنا کسی تکلف اور رسم کے جسمانی رشتہ بنا لیتے ہیں۔ جزائر ہوائی کے بارے میں ڈاکٹر ریورز کی گواہی ہے کہ بعض عورتیں اپنے شوہروں کی اجارہ داری تسلیم نہیں کرتیں بلکہ خود کو دوسرے مردوں کے لیے بھی دستیاب رکھتی ہیں۔

ہندوستان میں نیل گری کے پہاڑی علاقوں میں ایرولا (Irulas) قبیلے کے بارے میں ہارنیس لکھتا ہے کہ ان کے ہاں شادیوں کے کوئی معاہدے نہیں ہوتے۔ مرد عورتیں جس سے چاہیں جنسی تعلق رکھ سکتے ہیں۔ ساتھ رہنے یا علیحدگی کا اختیار عورت کو حاصل ہوتا ہے۔

برازیل کے ہسپانوی مقبوضہ علاقے متوگروسو کے قبیلہ کیباپو میں جب کوئی لڑکی بلوغت کی سرحد پار کرتی ہے تو اس اپنی پسند کے کسی بھی مرد سے تعلق بنانے کی آزادی مل جاتی ہے۔ حاملہ ہو جانے کی صورت میں مرد اس کے بچے کے دودھ چھڑانے تک تمام اخراجات اٹھانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ 'بیوی' کے گھر میں اس کے ساتھ رہتے ہوئے دوسری عورتوں کے ساتھ بھی تعلق رکھ سکتا ہے۔ پہلی عورت چاہے تو اسی مرد سے دوسرا بچہ بھی حاصل کرسکتی ہے اور کسی دوسرے مرد سے بھی۔

یہ چیدہ مثالیں اگرچہ استثناء کی حیثیت رکھتی ہیں مگر یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ ہم نے جو اپنی سوسائٹی میں رائج عورت اور مرد کے رشتے کی جس صورت کو دائمی سمجھ رکھا ہے، معاملہ ویسا ہرگز نہیں اور نہ ہی ان مثالوں میں ہمیں اس مردانہ غیرت کا کوئی سراغ ملتا ہے جس نے ہماری نفسیات کو مریضانہ حد تک اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور غیرت کے نام پر قتل روزمرہ کا معمول بنتے جا رہے ہیں۔ غور کریں تو اس بداخلاق بلکہ مجرمانہ غیرت نے سوسائٹی کو خوف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا جب اخبارات میں غیرت کے نام پر کسی نہ کسی عورت کے بہیمانہ قتل کی خبر نہ چھپتی ہو۔ درج بالا مثالیں بتاتی ہیں کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب عورت جیون ساتھی کے انتخاب جیسے اہم ترین فیصلے میں کس قدر آزاد تھی اور اس کے نتیجے میں ان قبائل کی زندگی ہم سے لاکھ درجہ زیادہ پرسکون تھی۔

عورت کی سیادت کے پانچ لاکھ سال

علم الانسان کے ماہرین بتاتے ہیں کہ قبل از تاریخ وتہذیب کم وبیش پانچ لاکھ سال کا عرصہ ایسا بھی گزرا جسے مادر سری دور کا نام دیا جاتا ہے یعنی جب مرد کے مقابلے میں عورت کی اہمیت زیادہ تھی۔ اولاد مرد کی بجائے عورت سے منسوب ہوتی تھی کہ ابھی مرد کو اولاد کی پیدائش میں اپنے نطفے کے کردار کا علم ہی نہیں تھا۔ وہ اسے عورت کا ہی کرشمہ سمجھتا تھا۔ عورت مویشی اور زرخیز زمین کی طرح افادہ بخش تھی کہ وہ بچے کو جنم دیتی تھی۔ حاملہ عورت کو الوہیت کا درجہ حاصل تھا۔ چنانچہ دیوی کی صورت اس کے مجسمے بنائے اور پوجے جاتے تھے۔ زمین اور عورت میں زرخیزی کی صفت مشترک تھی۔ کئی اقوام میں اجتماعی طور پر کھیتوں میں جنسی کا رواج تھا تا کہ اس عمل سے زمین کی زرخیزی میں اضافہ ہو۔ عورت اور زمین کے لئے بولے جانے والے الفاظ، ماں اور کوکھ اسی دور کی سوچ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جیسے دھرتی ماں یا دھرتی ماتا اور زمین کی کوکھ۔ انسان ابھی تہذیب کے ضابطوں سے کوسوں دور تھا۔ لباس نام کی کوئی شے متعارف نہیں ہوئی تھی۔ جنسی اعضاء ابھی شرم وحیا کی زد میں نہیں آئے تھے۔ افریقہ کے کئی قبائل آج بھی اُسی دور میں زندہ ہیں۔ کچھ تو آج بھی مکمل بے لباس رہتے ہیں اور کچھ کے ہاں صرف نچلے حصے کو ڈھانپنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

دیوی کے منصب سے عورت کی معزولی

برف کے خوف ناک طوفانوں کی بنا پر جب آدمی نے میدانوں کا رخ کیا تو اسے خوراک کا مسئلہ درپیش ہوا۔ اسے اس کام کے لئے پہلی بار جان لیوا محنت کرنی پڑی۔ یہ کام تھا شکار کی تلاش۔ جانور اس سے کہیں زیادہ تیز رفتار اور تگڑے تھے جنہیں مار گرانا آسان نہیں تھا۔ اس پھرتیلی اور بھاگ دوڑ والی محنت میں عورت حمل اور پہلے سے موجود بچوں سے فطری وابستگی کے سبب مرد کا برابر کا ساتھ دینے سے عاجز تھی، سو پڑاؤ پر ٹھہرنا اس کی مجبوری تھی۔ حالات کی مجبوریاں اور سختیاں انسان کو زندگی کے بچاؤ کے نئے راستے سجھا رہی تھیں۔ جانور شکار کرنے کے لئے پہلے اس نے نوکیلے پتھر ڈھونڈے اور

پھر اسی جدوجہد میں تیر کمان ایجاد کیا جسے چلانے کے لئے مضبوط بازو درکار تھے۔ جانوروں کے تعاقب میں دوڑنے کے عمل نے اسکی ٹانگوں کو مضبوطی اور سختی بخشی اور تیر کمان چلانے کی مشق نے اسکے بازوؤں کے پٹھوں کی مچھلیوں کو اُبھارا۔ عورت اپنے پڑاؤ پر ٹھہرنے کے سبب اس جسمانی تبدیلی سے محروم رہی۔ مگر اسکے پاس بھی دماغ تو بہر حال تھا جو غور و فکر سے فارغ نہیں رہ سکتا تھا۔ عورت بھی اس دوران آرام سے نہیں بیٹھی، جس کا نتیجہ اس صورت میں نکلا کہ اس نے خود رو جئو کو گندم میں بدل دیا۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ یہی گندم بعد میں اس کے نام لگنے والے اوّلین گناہِ عظیم کا استعارہ بنی۔

غلامی کی شروعات

تاریخ یا قبل از تاریخ ادوار پہ نظر ڈالیں تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ عورت کی سب سے بڑی صلاحیت یعنی بچے کی پیدائش ہی اس کی غلامی کا سبب بن گئی۔ افزائش چاہے سرمائے کی ہو، اناج کی یا اولاد کی، یہ ازل سے انسان کی ضرورت چلی آئی ہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب انسان اس راز سے ناآشنا تھا کہ عورت کی کوکھ میں پلنے والے بچے میں اس کا بھی کوئی عمل دخل ہے۔ وہ بچے کی پیدائش کو صرف عورت کا کارنامہ تصور کرتا تھا، سو جیسے اس نے اناج فراہم کرنے والی زمین کو دھرتی ماں یا ماتا کہہ کر تقدیس اور احترام بخشا اسی طرح حاملہ عورت کو بھی دیوی کے سنگھاسن پہ بٹھایا اور اس کی پرستش کو واجب جانا۔ یہ شکار کا دور تھا۔ ابھی انسان کے پاس کوئی ایسی شئے نہیں تھی جسے وہ سالہا سال ذخیرہ کر کے اپنی امارت کا رعب جما سکے۔ ایک معنی میں اپنی غلامی کا راستہ بھی عورت نے خود ہی کھوجا۔ جو عورتیں بوجوہ شکار میں مردوں کا ساتھ نہیں دے پاتی تھیں انہوں نے پیچھے رہ کر خودرو جنگلی جئو کو گندم میں بدلنے کا ہنر دریافت کر لیا۔ گندم ایک ایسی جنس تھی جسے گوشت جیسی جلد خراب ہو جانے والی خوراک کی نسبت کئی برس تک سنبھالا جا سکتا تھا۔ گندم کی پیداوار کا سیدھا مطلب تھا عارضی ذریعۂ خوراک شکار سے کسی حد تک چھٹکارہ۔

برا ہو علم کا جس نے مرد کو سمجھایا کہ عورت بھی ایک کھیتی کی طرح ہے۔ جس میں اگر مرد بیج نہ ڈالے تو اس کی کوکھ ہری نہیں ہو سکتی۔ اور اب تو اس نے عورت کی وساطت سے زمین کی پیداوار کا راز بھی جان لیا

تھا۔ یہی وہ ترقی کا زینہ ہے جب ملکیت کے سانپ نے پھنکارنا شروع کیا۔ طویل عرصہ تک ذخیرہ کی جانے والی اشیاء وجود میں آنے لگیں تو وراثت کا خیال آیا۔ وراثت کے لئے صرف اپنے نطفے سے پیدا ہونے والی اولاد درکار تھی، سو لازم ٹھہرا کہ اپنی عورت کو دوسرے مردوں کی دسترس سے دور رکھا جائے۔ ملکیت کے تصور نے پہلی بار اشیاء کے ساتھ ساتھ عورت اور اولاد کو بھی اپنے حصار میں لیا۔ انسانی ترقی کے پہلے زینے پر ہی عورت فرد سے شے (Commodity) میں بدل گئی۔ عورت کی وفا پر مرد کی بے یقینی خود اس کی اپنی ذات پر بے یقینی کا شاخسانہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ خود ایک عورت تک محدود نہیں رہ سکتا تو عورت کیونکر رہ سکتی ہے۔ سو اس نے اپنے نطفے کے خالص ہونے کو یقینی بنانے کے لئے عورت کو لوہے کے جانگیے پہنائے تاکہ وہ اس کی غیر موجودگی میں کسی اور مرد سے اختلاط نہ کر سکے۔

یہی وہ وقت تھا جب مرد کو یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ عورت کو کیسے اپنے قابو میں رکھا جائے۔ عورت جس خصوصیت کی وجہ سے اب تک پردھان اور قابل احترام چلی آتی تھی، ضروری تھا کہ اس سے اس کی پردھانی اور احترام کا جواز چھینا جائے۔ جہاں دھونس دھاندلی اور کھلی طاقت کام نہ کریں وہاں مذہب بہت کام آتا ہے۔ مذہب جو کہ سراسر تقدیس کے ہالے میں چھپا ہوتا ہے اور جسے بے انتہا طاقت کے حامل ڈرانے والے دیوتا تخلیق کرتے ہیں۔ جو پیدائش کے ساتھ ہی بچے کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب تک وہ ہوش سنبھالتا ہے تو کوئی دیوتا یا خدا اس کے لیے ازلی اور ابدی حقیقت بن چکا ہوتا ہے۔ سادہ لوح عامیوں کے لئے اس سے انکار ان کو تباہ کر دینے والی ناراضگی کا موجب بن سکتا ہے، سو مذہب کے معاملے میں عقل، علم اور دلیل کو ایک طرف رکھنا ناگزیر ٹھہرتا ہے۔ آقائیت کی خواہش مند مردانہ سوچ نے بڑی چالاکی سے دیویوں کو ہٹا کر وہاں مردانہ سوچ کا حامل خدا لا رکھا، جس نے وہی احکامات صادر کرنے شروع کر دیے جو مرد کی حاکمیت کو تقویت دیتے تھے۔ عورت کو باور کروا دیا گیا کہ اس کی حیثیت ہر صورت میں مرد سے کم تر ہے سو یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ مرد کو خدا کے مماثل جانے اور اس کی طرف سے دیئے جانے والے احکامات کے سامنے سر

تھا۔ یہی وہ ترقی کا زینہ ہے جب ملکیت کے سانپ نے پھنکارنا شروع کیا۔ طویل عرصہ تک ذخیرہ کی جانے والی اشیاء وجود میں آنے لگیں تو وراثت کا خیال آیا۔ وراثت کے لئے صرف اپنے نطفے سے پیدا ہونے والی اولاد درکار تھی، سو لازم ٹھہرا کہ اپنی عورت کو دوسرے مردوں کی دسترس سے دور رکھا جائے۔ ملکیت کے تصور نے پہلی بار اشیاء کے ساتھ ساتھ عورت اور اولاد کو بھی اپنے حصار میں لیا۔ انسانی ترقی کے پہلے زینے پر ہی عورت فرد سے شے (Commodity) میں بدل گئی۔ عورت کی وفا پر مرد کی بے یقینی خود اس کی اپنی ذات پر بے یقینی کا شاخسانہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ خود ایک عورت تک محدود نہیں رہ سکتا تو عورت کیونکر رہ سکتی ہے۔ سو اس نے اپنے نطفے کے خالص ہونے کو یقینی بنانے کے لئے عورت کو لوہے کے جانگیے پہنائے تاکہ وہ اس کی غیر موجودگی میں کسی اور مرد سے اختلاط نہ کر سکے۔

یہی وہ وقت تھا جب مرد کو یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ عورت کو کیسے اپنے قابو میں رکھا جائے۔ عورت جس خصوصیت کی وجہ سے اب تک پردھان اور قابل احترام چلی آتی تھی، ضروری تھا کہ اس سے اس کی پردھانی اور احترام کا جواز چھینا جائے۔ جہاں دھونس دھاندلی اور عملی طاقت کام نہ کریں وہاں مذہب بہت کام آتا ہے۔ مذہب جو کہ سراسر تقدیس کے ہالے میں چھپا ہوتا ہے اور جسے بے انتہا طاقت کے حامل ڈرانے والے دیوتا تخلیق کرتے ہیں۔ جو پیدائش کے ساتھ ہی بچے کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب تک وہ ہوش سنبھالتا ہے تو کوئی دیوتا یا خدا اس کے لیے ازلی اور ابدی حقیقت بن چکا ہوتا ہے۔ سادہ لوح عامیوں کے لئے اس سے انکار ان کو تباہ کر دینے والی ناراضگی کا موجب بن سکتا ہے، سو مذہب کے معاملے میں عقل، علم اور دلیل کو ایک طرف رکھنا ناگزیر ٹھہرتا ہے۔ آقائیت کی خواہش مند مردانہ سوچ نے بڑی چالاکی سے دیویوں کو ہٹا کر وہاں مردانہ سوچ کا حامل خدا لا رکھا، جس نے وہی احکامات صادر کرنے شروع کر دیئے جو مرد کی حاکمیت کو تقویت دیتے تھے۔ عورت کو باور کروا دیا گیا کہ اس کی حیثیت ہر صورت میں مرد سے کم تر ہے سو یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ مرد کو خدا کے مماثل جانے اور اس کی طرف سے دیئے جانے والے احکامات کے سامنے سر

تسلیم خم کر دے۔ سو اس طرح اس نے خود کو مجازی خدا کے منصب پر فائز کر لیا، جس کی حکم عدولی خدا کی حکم عدولی کے مترادف ٹھہری۔

اوّلین جنسی گناہ کا الزام عورت کے سر

ایک مردانہ سازش

عورت کی لاکھوں برس سے قائم سیادت آدم کی پسلی سے حوا کی پیدائش کی مذہبی کہانی کی مدد سے منہدم کر دی گئی۔ اب بھلے عورت قیامت تک زچگی کی قیامت سے گزر کر مرد کا آنگن بچوں سے بھرتی رہے لیکن پہلی پیدائش کا کارنامہ تو مرد کے نام لگ چکا۔ اور اب تو اس کارنامے کو عوام الناس کے ذہنوں میں راسخ ہوئے بھی ہزار ہا سال بیت چکے ہیں۔

آدم اور حوا کی کہانی میں گندم کا دانہ کھانے کا استعارہ بھی خوب ہے جو جنس کو گناہ سے جوڑنے کی اولین کاوش دکھائی دیتا ہے۔ گندم کا دانہ عورت کی وجا ئنا جسے ہم شرم کے مارے شرم گاہ کے نام سے بلاتے ہیں سے بے حد مشابہ ہے۔ ہماری الہامی کتابوں میں کسی خاص درخت کا پھل کھانے کا ذکر ہے جس کے نتیجے میں آدم اور حوا کو اچانک ایک دوسرے کے جنسی اعضاء میں کشش کا ادراک ہوا تھا۔ باقی سیب یا دانہ گندم کی کہانیاں تو مذہبی پروہتوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ ہاں البتہ ان کہانیوں کی اہمیت اس لئے مسلمہ ہے کہ یہ عامۃ الناس کے اذہان پر مذہبی سچائی کے طور پر مرتسم ہو چکی ہیں۔ یہودیوں نے پہلی عورت کو پہلے مرد کی پسلی سے پیدا کر کے جنسی عمل کی اہمیت کو پیچھے دھکیلا اور پھر عیسائی ولیوں نے بنا کسی جنسی تعلق کے حضرت عیسیٰ کی پیدائش کو معروف کروایا تاکہ یہ باور کروایا جا سکے کہ حضرت مریم کو کسی مرد نے نہیں چھوا تھا۔ چونکہ ان کے نزدیک آدم اور حوا کا جسمانی تعلق وہ اولین گناہ تھا جس کی وجہ سے انہیں جنت بدر ہو کر زمین پر در بدر بھٹکنا پڑا، سو وہ نہیں چاہتے تھے کہ جنسی تعلق جیسا غلیظ عمل حضرت مریم سے وابستہ ہو جس سے ان کی پاکیزگی پر حرف آئے۔ یہی ولی تھے جنہوں نے جنسی عمل کو گناہ کا درجہ دے کر اپنے پیروکاروں کو تجرد کی زندگی کی طرف مائل کیا اور نن کا پورا ادارہ معرض وجود میں آیا۔

ان اساطیر میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ یہ صرف اتنا بتاتی ہیں کہ انسان کی جنس میں دلچسپی جبلی ہے اور یہ اسکی زندگی کے مختلف معاملات میں کسی نہ کسی طور اظہار کا راستہ پاتی رہی ہے۔ تاریخ کے سیانے تو یہ بھی بتاتے ہیں کہ گنبد اور مینار بھی عورت اور مرد کے جنس سے متعلق اعضاء کے بلیغ استعارے ہیں۔

آدم اور حوا کی کہانی میں عورت کی سیادت چھیننے کے لئے دو طرفہ حملہ کیا گیا۔ ایک تو اسے پہلی پیدائش کے شرف سے محروم کر دیا گیا اور دوسرے اسے اولین گناہ کا مجرم ٹھہرا کر ہمیشہ کے لئے کمتری اور گناہ کے احساس میں مبتلا کر دیا گیا۔ ظلم کی بات یہ تھی کہ عورت نے ان الزامات کو بلا چون و چرا مانتے ہوئے اپنی سیادت کا منصب مرد کے قدموں میں ڈال کر اسے اپنا مالک اور (مجازی) خدا تسلیم کر لیا۔ مرد جو ہماری معاشرت میں اپنی بیوی کا خصم کہلایا، جس کا مطلب ہے دشمن۔ خصومت (دشمنی) کا لفظ اسی سے نکلا ہے۔ یہ عورت کی شکست اور مرد کی برتری کی ابتداء تھی جو بتدریج مستحکم ہوتے ہوتے ایسی معروف حقیقت میں بدل گئی جسے چیلنج کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔

مذہبی اساطیر کے ذریعے عورت کو پیچھے دھکیل کر اس کے لئے علم اور عقل کے حصول کے اکثر دروازے مقفل کر دیئے گئے۔ یہاں تک کہ حیض کے نام پر عبادات میں بھی اس کا حصہ کم کر دیا گیا۔ خون کو ناپاک کہہ کر اسکی نفسیات میں اس کے اپنے بدن کے ناپاک اور غلیظ ہونے کے تصور کو راسخ کر دیا گیا اور یوں خود اسے اپنے ہی بدن سے نفرت میں مبتلا کر دیا گیا۔ یہ اپنی حقیقت میں عورت کو عملی زندگی سے باہر کرنے کی ایک مزید کوشش تھی جو بہت کارگر رہی اور آج تک کارگر چلی آتی ہے۔

عورت کے ناقص ہونے کا افسانہ

عورت کمزور ہے، کم عقل ہے، شاطر ہے، سازشی ہے، دھوکہ ہے۔ یہ ہے ہمارے ہاں کے مردوں کی عورت کے بارے میں عام رائے مگر عجیب بات ہے کہ انہی مردوں کو یہ ناقص مگر خطرناک مخلوق مرغوب بھی بہت ہے۔ کئی تو ایسے بھی ہیں جو اسکی ایک جھلک دیکھنے کو مرے جاتے ہیں۔ ایک جانب عورت کے ناقص اور شاطر ہونے کے پر یقین دعوے اور دوسری جانب اس کے برعکس یہ ڈینگ کہ جناب یہ ہمارا مذہب ہی ہے جس نے عورت کو سب سے زیادہ احترام اور ارفع مقام بخشا۔ سوچنے کی

بات یہ ہے کہ جس عورت کو امام غزالی کے بقول خدا نے اماں حوا کے صرف ایک گناہ (جس میں آدم بھی برابر کا شریک تھا) کی پاداش میں قیامت تک اٹھارہ سزاؤں کا مستحق ٹھہرایا ہو، وہ مذہب کی نظر میں قابلِ احترام کیونکر ہو سکتی ہے؟

عربی زبان جو کہ ہمارے مذہب کی ماخذ ہے اس میں عورت کا مطلب ہے داغ، دھبہ، ناقص، نامکمل۔ عورت کے لفظ سے بدن کے وہ تمام حصے بھی مراد لئے جاتے ہیں جن کے دیکھنے دکھانے سے شرم آتی ہو۔ عربی کے بعد اسلام پر سب سے زیادہ اثر فارسی زبان کا ہے جس میں عورت کا مطلب ہی ننگ، عریانی اور شرم ہے۔ اسی لئے عورتوں کے لیے لفظ مستورات بھی مستعمل ہے جس کا واحد مستور ہے یعنی پوشیدہ۔ یاد رہے کہ مستور کا لفظ ستر سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے بدن کے وہ حصے جن سے شرم کا تصور وابستہ ہو۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو عورت کے پورے بدن سے شرم کا تصور جوڑ دیا گیا۔ فارسی زبان میں عورت کو ضعیفہ (za'ifeh) کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے، جو کہ عربی کے لفظ ضعیف (ضعیف) سے مشتق ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں رواج پانے والی زبان اُردو نے انہی دو زبانوں کے اتصال سے اپنی الگ شناخت بنائی کیونکہ اسلام انہی دو زبانوں کے کاندھوں پہ بیٹھ کر برصغیر میں داخل ہوا تھا۔ ہاں یاد آیا، ایک تیسری زبان ترکی بھی تھی، جس میں عورت کا لفظ بیوی کے معنوں میں مستعمل ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی زبان آسمان سے نہیں اترتی بلکہ انسانوں کے آپسی معاملات اور تجربات سے پھوٹتی، پنپتی اور رائج ہوتی ہے۔ لفظ انسانی سوچ کے عکاس ہوتے ہیں۔ اس زاویے سے دیکھیں تو صاف معلوم ہوگا کہ ہمارے ہاں انسانی مادہ کے لیے رائج الفاظ سراسر مردانہ تعصب کا گھٹیا اظہار ہیں جن کے ذریعے عورت کو کم تر درجے کی مخلوق ثابت کرنے کی خواہش صاف دکھائی دیتی ہے۔ اسی خواہش کا ایک شاخسانہ وہ افسانہ بھی ہے جس میں حوا کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونا بتایا گیا اور خود عورتوں نے بھی اسے ایمان کی طرح قبول کر لیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اس اساطیری قصے نے ان کی حیثیت کو کس سطح پر پٹخ دیا ہے۔

تو کیا عورت واقعی کمزور ہے، کم عقل ہے، شاطر ہے، سازشی ہے، چلتر باز ہے، دھوکہ ہے؟ جی ہاں

بدقسمتی سے عورت ایسی ہی ہے مگر اس الزام کو درست ماننے کے ساتھ ساتھ اس جرم کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ عورت کو ایسا بنانے میں مرد نے ہزار ہا برس محنت کی تب کہیں جا کر وہ عورت کو ایک ناقص اور منفی وجود میں ڈھالنے میں کامیاب ہوا۔ اصل شازشی تو مرد تھا اور ہے جس نے اپنی طاقت میں بڑھاوے کے لئے عورت کو مسلسل کمزور کیا۔ ہاں یہ الگ بات کہ عورت خود اپنے خلاف مرد کے اس غیر انسانی منصوبے میں اس کی معاون بن گئی اور خود پر پابندیاں قبول کر کے گھر کی چار دیواری میں بند ہو کر باہر کی دنیا سے کٹ گئی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عورت کی اس قید میں خود اس کی اپنی تن آسانی کا عمل دخل بھی تھا۔ اور یہ بھی کہ مرد کی جانب سے ڈرائی گئی عورت نے بھی مناسب جانا کہ گھر ہی اس کے لیے محفوظ پناہ گاہ ہے۔

مرد نے عورت کو یہ باور کروایا کہ وہ سرتاپا محض ایک سیکس اوبجیکٹ ہے جسے سماج کے سارے مرد ہوس ناک نظروں سے دیکھتے ہیں اور جہاں جس کو موقع ملے گا، وہ اس پر جھپٹ پڑے گا۔ سو ضروری ہے کہ وہ خود کو ایک نازک اور قیمتی شے سمجھے اور بلوغت کی سرحد پار کرتے ہی شادی کے نام پر کسی مرد کی حفاظت میں دے دے۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ عورت نے بھی اپنی سوچ کو اسی نہج پر ڈھال لیا۔ مذہب کے ذریعے عورت کو باور کروایا گیا کہ اس کا کام مرد سے لذت لینا نہیں بلکہ دینا ہے اور اس کے جواب میں مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ پیسہ کما کر اس کی مادی ضروریات پوری کرے۔ ہمارے ہاں جنسی تعلق کے حوالے سے گالیوں میں مستعمل 'لینے' اور 'دینے' کی اصطلاح اسی سوچ کی عکاس ہے۔ یہی وہ سوچ ہے جس کی بنیاد پر اکثر بیویاں شوہروں کو سیکس دیتے وقت بلیک میل بھی کرتی ہیں۔ اس موقعہ کو مرد سے کئی ایسے مطالبے منوانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جن کا عام حالات میں پورا ہونا ممکن نہیں ہوتا۔

شجرۂ نسب سے عورت کی محرومی

کمزور عورت کو جسمانی اور نفسیاتی حوالے سے مزید کمزور بنا دیا گیا۔ اسے بار بار یہ جتلایا گیا کہ وہ مرد جیسی عمدہ اور مکمل تخلیق نہیں بلکہ صرف اس کی غلاموں جیسی معاون اور جنسی تسکین کا ذریعہ ہے۔ اس کا کوئی شجرۂ نسب نہیں ہوگا۔ وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر جنم دینے کے باوجود خود کبھی اس منصب کی اہل

نہیں بن سکے گی۔ وہ جتنے مرضی بچے پیدا کرلے مگر کوئی بھی اس کے نام سے پہچان نہیں پائے گا (عجب بوالعجبی ہے کہ حشر کے روز معاملہ اس کے برعکس ہوگا جب بچے ماؤں کے نام سے پکارے جائیں گے)۔ بہرحال اس دنیا میں قیامت تک اولاد ہر حالت میں مرد سے منسوب ہوگی اور اسی کا نام ونسب آگے بڑھائے گی۔ وہ لاکھ دردِ زہ سہے، نیندیں برباد کر کے بچوں کو پالے پوسے، بڑا کرے مگر ان کی پہچان باپ سے منسوب ہوگی کیونکہ مردوں نے معیشت پر اپنا تسلط جما کر سماج کو مردانہ مرضی کے ماتحت کرلیا ہے۔ بیٹیوں کو کوئی پہچان نہیں ملے گی کیونکہ خود خدا کو ان سے نسبت پسند نہیں۔ یہ بات ہمیں ان آیات سے یاد آئی جن میں خدا کفار کے حوالے سے گلہ کرتا ہے کہ وہ اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہیں اور میرے لیے بیٹیاں۔ اور اسے سراسر ناانصافی کہا۔ سورۃ نجم کی آیات نمبر 27,28 میں کہا۔ ''(مشرکو!) تمہارے لیے تو بیٹے اور خدا کے لیے بیٹیاں؟ یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ہے۔'' یہ گلہ ایک جگہ نہیں بلکہ اسے سات اور سورتوں میں کئی بار دہرایا۔ یعنی اگر کفار بیٹیوں کی بجائے اولادِ نرینہ کو خدا سے منسوب کرتے تو یہ بات اسے ناراض نہ کرتی۔ سو ہمیں اس بات پر اچنبھا نہیں ہونا چاہئے کہ خدا نے آدم کی تخلیق کی تفصیلات بیان کرتے وقت حوا کا کوئی تذکرہ کیوں نہیں کیا اور شائد اسے کہیں بعد میں پیدا کیا گیا اور وہ بھی آدم کی اداسی دور کرنے کی غرض سے۔ اگر ہم تینوں الہامی مذاہب کا مطالعہ کریں تو یہی خیال راسخ ہوتا ہے کہ حوا کی حیثیت بہرحال ضمنی تھی سو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کہ الہامی مذاہب کے ماننے والوں نے عورت کو مرد سے کمتر درجے پر کیوں رکھا۔

تو جناب من، معروف مذہبی بیانئے کے مطابق عورت کا وجود مرد کی دل بستگی کے لیے ہے۔ اس کا کام تو ایک ڈیکوریشن پیس کی طرح بنا سنورنا ہے تاکہ مرد اس کی جانب ملتفت رہے اور خوش ہوکر جواب میں اسے نان نفقہ دیتا رہے۔ اسے مرد کی طرح طلاق دینے کا حق بھی نہیں ہے، ہاں اتنی مہربانی ضرور کی گئی کہ وہ مرد سے خلع حاصل کرسکتی ہے مگر وہ بھی اس کی اجازت سے۔ نکاح نامے کی شق نمبر 18 میں یہی لکھا ہے کہ کیا دولہا نے لڑکی کو طلاق لینے کا حق تفویض کر دیا ہے؟ ستم ظریفی یہ ہے کہ نکاح لڑکی کا ہوتا ہے مگر نکاح فارم میں درج اس شق کو والد اپنا حق مردانگی سمجھتے ہوئے بچی سے پوچھے اور بتائے بنا قلم زد کر دیتا ہے۔

ہمارے خاندانی نظام میں عورت ایک طرح سے غلام نما مخلوق ہے جس کے کام کا کوئی معاوضہ نہیں بھلے وہ جتنی مرضی مہارت رکھتی ہو۔ اسے دن میں کئی کام نبھانے ہوں گے۔ وہ بیک وقت باورچن بھی ہوگی، جھاڑن بھی، دھوبن بھی، تیماردار بھی، نرس بھی، آیا بھی اور ان کاموں سے تھکنے کے باوجود شوہر کا بستر بھی گرم کرے گی۔ اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کرے گی تو بقول مولانا اشرف علی تھانوی، فرشتے تمام رات اس پر لعنت بھیجتے رہیں گے۔

عورت کی تحقیر

یوں تو عورت کے بارے میں تحقیری رویوں کو ہندوانہ سماجی اقدار کے ساتھ ساتھ امام غزالی اور تھانوی جیسے مذہبی سکالروں نے بھی خوب خوب رائج کیا اور مرد کی ناجائز برتری کو الوہی جواز بخشا۔ امام غزالی نے ایک موضوعی حدیث کی مدد سے بے اولاد عورت کو ٹوٹی ہوئی چٹائی سے کمتر کہا۔ عورت کو کتا، سانپ، بچھو، لومڑی، بندر، خرگوش، کبوتر، الو اور بھینس سے تشبیہ دے کر اسے انسانوں کے زمرے سے خارج کرنے کی کوشش کی۔ مزید یہ کہ آدم و حوا کی اساطیری کہانی کا سہارا لے کر عورت کو قیامت تک کے لئے کئی طرح کی مستقل محرومیوں اور سزاؤں کا حقدار ٹھہرایا۔ جیسے حیض کے دنوں میں عبادت سے معذوری، ملک کی سربراہی اور منصف کے عہدے سے محرومی، ایک وقت میں ایک ہی مرد سے شادی اور حق طلاق سے محرومی۔ شادی کے وقت والدین کا گھر چھوڑنے کی مجبوری اور آدھی گواہی وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح تھانوی صاحب نے بھی عورت کو برے سے برے مرد کو بھی ہر حال میں خوش رکھنے کا سبق پڑھایا۔ سرسید جیسے روشن خیال بھی اس معاملے میں بہت رجعت پسند ثابت ہوئے تھے۔ وہ صرف مردوں کی تعلیم کے حق میں تھے جبکہ عورتوں کو صرف عربی میں قرآن پڑھنے کے قائل تھے مبادا انہیں دین و دنیا کی فہم نہ ہو جائے۔ انھیں جب اس بات کا پتہ چلا کہ کچھ لوگ پنجاب میں عورتوں کے لئے سکول کھولنا چاہتے ہیں تو انھوں نے ضعیف العمری کے باوجود پنجاب کا دورہ کیا اور عورتوں کی تعلیم کے خلاف پورے مذہبی جوش و خروش کے ساتھ مہم چلائی۔ شاعر مشرق بھی اس معاملے میں روایتی فکر سے

نہیں بن سکے گی۔ وہ جتنے مرضی بچے پیدا کرے مگر کوئی بھی اس کے نام سے پہچان نہیں پائے گا (عجب بوالعجی ہے کہ حشر کے روز معاملہ اس کے برعکس ہوگا جب بچے ماؤں کے نام سے پکارے جائیں گے)۔ بہرحال اس دنیا میں قیامت تک اولاد ہر حالت میں مرد سے منسوب ہوگی اور اسی کا نام ونسب آگے بڑھائے گی۔ وہ لاکھ درد زہ سہے، نیندیں برباد کر کے بچوں کو پالے پوسے، بڑا کرے مگر ان کی پہچان باپ سے منسوب ہوگی کیونکہ مردوں نے معیشت پر اپنا تسلط جما کر سماج کو مردانہ مرضی کے ماتحت کرلیا ہے۔ بیٹیوں کو کوئی پہچان نہیں ملے گی کیونکہ خود خدا کو ان سے نسبت پسند نہیں۔ یہ بات ہمیں ان آیات سے یاد آئی جن میں خدا کفار کے حوالے سے گلہ کرتا ہے کہ وہ اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہیں اور میرے لیے بیٹیاں۔ اور اسے سراسر ناانصافی کہا۔ سورۃ نجم کی آیات نمبر 27,28 میں کہا۔ ''(مشرکو!) تمہارے لیے تو بیٹے اور خدا کے لیے بیٹیاں؟ یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ہے۔'' یہ گلہ ایک جگہ نہیں بلکہ اسے سات اور سورتوں میں کئی بار دہرایا۔ یعنی اگر کفار بیٹیوں کی بجائے اولاد نرینہ کو خدا سے منسوب کرتے تو یہ بات اسے ناراض نہ کرتی۔ سو ہمیں اس بات پر اچنبھا نہیں ہونا چاہئے کہ خدا نے آدم کی تخلیق کی تفصیلات بیان کرتے وقت حوا کا کوئی تذکرہ کیوں نہیں کیا اور شائد اسے کہیں بعد میں پیدا کیا گیا اور وہ بھی آدم کی اداسی دور کرنے کی غرض سے۔ اگر ہم تینوں الہامی مذاہب کا مطالعہ کریں تو یہی خیال راسخ ہوتا ہے کہ حوا کی حیثیت بہرحال ضمنی تھی سو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کہ الہامی مذاہب کے ماننے والوں نے عورت کو مرد سے کم تر درجے پر کیوں رکھا۔

تو جناب من، معروف مذہبی بیانئے کے مطابق عورت کا وجود مرد کی دل بستگی کے لیے ہے۔ اس کا کام تو ایک ڈیکوریشن پیس کی طرح بنا سنورنا ہے تاکہ مرد اس کی جانب ملتفت رہے اور خوش ہو کر جواب میں اسے نان نفقہ دیتا رہے۔ اسے مرد کی طرح طلاق دینے کا حق بھی نہیں ہے، ہاں اتنی مہربانی ضرور کی گئی کہ وہ مرد سے خلع حاصل کرسکتی ہے مگر وہ بھی اس کی اجازت سے۔ نکاح نامے کی شق نمبر 18 میں یہی لکھا ہے کہ کیا دولہا نے لڑکی کو طلاق لینے کا حق تفویض کر دیا ہے؟ ستم ظریفی یہ ہے کہ نکاح لڑکی کا ہوتا ہے مگر نکاح فارم میں درج اس شق کو والد اپنا حق مردانگی سمجھتے ہوئے بچی سے پوچھے اور بتائے بنا قلم زد کر دیتا ہے۔

ہمارے خاندانی نظام میں عورت ایک طرح سے غلام نما مخلوق ہے جس کے کام کا کوئی معاوضہ نہیں بھلے وہ جتنی مرضی مہارت رکھتی ہو۔ اسے دن میں کئی کام نبھانے ہوں گے۔ وہ بیک وقت باورچن بھی ہوگی، جھاڑن بھی، دھوبن بھی، تیماردار بھی، نرس بھی، آیا بھی اور ان کاموں سے تھکنے کے باوجود شوہر کا بستر بھی گرم کرے گی۔ اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کرے گی تو بقول مولانا اشرف علی تھانوی، فرشتے تمام رات اس پر لعنت بھیجتے رہیں گے۔

عورت کی تحقیر

خواتین اور عورت کے بارے میں تحقیری رویوں کو ہندوانہ سماجی اقدار کے ساتھ ساتھ امام غزالی اور اشرف علی تھانوی جیسے مذہبی سکالرز نے بھی خوب راسخ کیا اور مرد کی ناجائز برتری کو الوہی جواز بخشا۔ امام غزالی نے ایک موضوعی حدیث کی مدد سے بے اولاد عورت کو ٹوٹی ہوئی چٹائی سے کمتر کہا۔ عورت کو کتا، سانپ، بچھو، لومڑی، بندر، خرگوش، کبوتر، الو اور بھیڑیے سے تشبیہ دے کر اسے انسانوں کے زمرے سے خارج کرنے کی کوشش کی۔ مزید یہ کہ آدم و حوا کی اساطیری کہانی کا سہارا لے کر عورت کو قیامت تک کے لئے کئی طرح کی مستقل محرومیوں اور سزاؤں کا حقدار ٹھہرایا۔ جیسے حیض کے دنوں میں عبادت سے معذوری، ملک کی سربراہی اور منصف کے عہدے سے محرومی، ایک وقت میں ایک ہی مرد سے شادی اور حق طلاق سے محرومی۔ شادی کے وقت والدین کا گھر چھوڑنے کی مجبوری اور [illegible] وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح تھانوی صاحب نے بھی عورت کو برے سے برے مرد کو بھی ہر حال میں خوش رکھنے کا سبق پڑھایا۔ سر سید جیسے روشن خیال بھی اس معاملے میں بہت رجعت پسند ثابت ہوئے تھے۔ وہ صرف مردوں کی تعلیم کے حق میں تھے جبکہ عورتوں کو صرف عربی میں قرآن پڑھانے کے قائل تھے مبادا انہیں دنیا کی خبر نہ ہو جائے۔ انھیں جب اس بات کا پتہ چلا کہ کچھ لوگ پنجاب میں عورتوں کے لئے مدارس کھولنا چاہتے ہیں تو انھوں نے ضعیف العمری کے باوجود پنجاب کا دورہ کیا اور عورتوں کی تعلیم کے خلاف بڑے مذہبی جوش و خروش کے ساتھ مہم چلائی۔ شاعر مشرق بھی اس معاملے میں روایتی ملا سے

کچھ مختلف نہیں تھے۔ وہ عورت کو ہر حال میں ایک نیک بیوی اور اچھی ماں کے طور پر دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ عورت کی آزاد حیثیت اور جدید تعلیم کا تصور ان کے لیے بھی سوہانِ روح تھا جبکہ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جرمنی میں دورانِ تعلیم ان کے اتالیق میں ایک خاتون ایما ویگے ناسٹ بھی شامل تھیں۔ یعنی ہماری قوم کی ذہن سازی کے ان ذمہ داران میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جو عورت کو ایک انسان کی حیثیت سے تسلیم کرنے کو تیار ہو۔

زیور یا غلامی کے نئے روپ

انسان اگرچہ غار کے زمانے سے نکل کر قبائلی، غلام داری اور فیوڈل نظام سے ہوتا ہوا جدید سرمایہ داری دور میں داخل ہو چکا ہے مگر ہم ابھی تک قبائلی، غلام داری اور فیوڈل دور کی اکثر منفی روایات اور اقدار سے جان نہیں چھڑا پائے۔ ہماری زندگی کے نصاب میں عورت آج بھی مرد کی ادھین ہے۔ ہم نے اسے خوبصورت، نرم و نازک اور شرم و حیا کی پتلی کہہ کر حقیقی تبدیلی کے عمل سے الگ کر دیا ہے۔ اسے ماضی میں پہنائے جانے والے جملہ طوق زیور میں بدل کر اس کی جسمانی غلامی کو ذہنی غلامی میں بدل دیا ہے۔ یہ جن زیورات پر عورت بری طرح ریجھتی ہے یہ اپنی اصل میں اس کی غلامی کی ایک بدلی ہوئی مہین اور پُر فریب شکل کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ ہتھ کڑی کنگن اور چوڑیوں میں بدل گئی، پیروں کی بیڑی جھانجھر اور پازیب بن گئی، گلے کا طوق گلوبند، گانی اور نیکلس میں ڈھل گیا اور نکیل نتھ یا تھلی کا روپ دھار گئی۔ (یاد رہے کہ نکیل انتہائی خطرناک جانوروں کو قابو کرنے کے کام آتی ہے اور ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ یہ زیور عورت کو خاص طور پر شادی کے موقع پر پہنایا جاتا ہے۔) گردن میں پہنے جانے والے ایک زیور کو تو آج بھی بڑے شوق سے زنجیر یا زنجیری ہی کہا جاتا ہے۔

عورت کو رنگین پھول دار کپڑوں، گجروں اور زیورات میں الجھا کر زندگی کے میدان کے ایک بڑے حصے سے بیدخل کر کے اس پر مردانہ قبضہ مستحکم کر لیا گیا۔ اور مزید یہ کہ اسے نزاکت کے خوشنما پنجرے میں بند کر دیا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ اس کا کام صرف مرد کو لبھانا اور بے وقوف بنا کر گھر بیٹھے عیاشی کرنا ہے۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ یہ دام ہم رنگِ زمین ہے۔ وہ ویسی ہی بنتی چلی گئی جیسا کہ مردوں نے

اسے بنانا چاہا۔ اب تو یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ عورت کی خود اپنی ذات اور دنیا کے بارے میں کوئی اپنی سوچ ہے بھی کہ نہیں۔ جن عورتوں نے مردانہ سیادت کو چیلنج کرنے کی کوشش کی ان کی ایک مخصوص تعداد مردانی غرت میں خود مرد نما بن بیٹھی۔ یہ ایک مزید مضحکہ خیز صورتحال ہے جس کا چلن تیزی سے ترقی پذیر ہے۔ بلکہ یہ عمل تو بذات خود اس بات کو واضح کرتا ہے کہ مردانگی ہی قابل تقلید ماڈل ہے۔

ہماری عورت کا المیہ

ہم نے تہذیب کے نام پر عورت اور مرد میں بے جا دوری پیدا کر کے عورت کو ایک ایسے فرد میں بدل ڈالا ہے جس کی کوئی کل ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کب کس بات پہ ناراض ہو جائے اور محبت کرتے کرتے کب اتنی نفرت میں مبتلا ہو جائے کہ شوہر کی صورت تک دیکھنا گوارہ نہ کرے۔

مرد کے ساتھ مستقل وابستگی عورت کی سماجی مجبوری ہے جو دھیرے دھیرے اس کی فطرت کا رنگ اختیار کر چکی ہے۔ شوہر اس کے لیے تحفظ کی علامت ہے بھلے وہ نام کا ہی کیوں نہ ہو۔ جب وہ اپنے مرد کے ساتھ کسی دوسری عورت کا نام سنتی ہے تو اس کی کائنات میں طوفان آ جاتا ہے۔ یہ محبت کا نہیں بلکہ ملکیت کا شاخسانہ ہے۔ سائبان کے چھن جانے کا ڈر، بھلے وہ شکستہ ہی ہو۔

اسے بچپن سے ہی باور کروایا جاتا ہے کہ اس کے دماغ کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کی سوچ ناقص ہے سو اس کی رائے کی کوئی وقعت نہیں۔ بدقسمتی سے وہ یہ بات تسلیم بھی کر لیتی ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ تعلیم اور کام کے حوالے اس کا حق انتخاب نہ صرف بہت محدود ہے بلکہ باپ یا بھائی کی مرضی سے مشروط بھی۔ سو اسے صرف بننے سنورنے سے غرض ہوتی ہے کہ وہ اسی طرح نمایاں ہو کر پہچان پا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اکثر بچیاں ہوش سنبھالتے ہی دولہن کے سراپے کو آئیڈیلائز کرنے لگتی ہیں۔

ماؤں کی کوشش ہوتی ہے کہ بیٹیوں کو ممکنہ حد تک سگھڑ بنا دیا جائے۔ سو وہ انہیں سکول جانے کی عمر سے

پہلے ہی گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگا دیتی ہیں۔ تعلیم کے حصول کے دوران بھی گھر کے کام لازمی طور پر اس کی ذمہ داری قرار دے دیئے جاتے ہیں کیونکہ گھریلو کاموں کی تربیت ہی اگلے گھر کے لیے لڑکی کا بہترین اثاثہ سمجھی جاتی ہے۔ یعنی اسے ایک انسان کی بجائے ایک اچھے خدمت گار کے طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ اسے ان کاموں کا اس طرح سے رٹا لگوادیا جاتا ہے کہ انہیں کرتے وقت دماغ کو کوئی زحمت نہیں دینی پڑتی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی ہارمونیم نواز کی انگلیاں لاشعوری طور پر کوئی بھی بنی بنائی دھن بجانے لگیں۔ اگرچہ کوشش یہی کی جاتی ہے کہ بیٹا ہو یا بیٹی، انہیں تخلیقی کاموں جیسے شاعری، موسیقی، مصوری، رقص اور ایسی کتابوں سے ممکنہ حد تک دور رکھا جائے جو ان کے ذہن کو سوال آشنا کریں اور ان میں تخیل کی پرواز کا شوق جگائیں، مگر لڑکی گھر میں مقید رہنے کی وجہ سے آسانی سے ان پابندیوں کا شکار بن جاتی ہے۔ والدین اس کے ذہنی پھیلاؤ کو محدود رکھنے میں زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔

عورت گہرے تفکر کی عادی نہیں ہوتی۔ جب اسے کسی مسئلے کا سامنا ہوتا ہے تو وہ فوراً اس سے نجات چاہتی ہے۔ وہ شوہر سے بھی اپنے جیسی جلد بازی کا تقاضہ کرتی ہے مگر زندگی کا دائرہ مختلف ہونے کی وجہ سے شوہر توجہ سے مسئلے کا جائزہ لینے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ مسئلہ سننے کے بعد خاموشی سے اس کے جملہ پہلوؤں پر غور کرنا شروع کر دیتا ہے، جسے بیوی اس کی بے اعتنائی سے تعبیر کرتی ہے۔ وہ شوہر سے فوری ایکشن کا بار بار تقاضہ کرتی ہے اور کئی بار شوہر بھی اس کے تقاضوں سے گھبرا کر ایکشن کے لیے قدم اٹھا لیتا ہے، جس کا نتیجہ ظاہر ہے نقصان کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

گہرے تفکر کی تربیت نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ عورت دلیل میں کم و بیش کمزور ہوتی ہے۔ اس کمی کو وہ ہٹ دھرمی سے پورا کرتی ہے۔ اگر شوہر مکالمے کا قائل ہو تو وہ بیوی سے اپنی رائے منوانے میں اکثر ناکام رہتا ہے، خاص طور پر وہ جو بیوی کی رائے کو کمزور ثابت کرتی ہو۔ وہ اپنی رائے کو منوانے اور درست ثابت کرنے کے لیے ایسے ایسے دلائل لائے گی جن کا عقل، علم بلکہ متعلقہ واقعے سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوگا۔ غالباً وہ لاشعوری طور پر شوہر کے ساتھ مخاصمت کے جذبے کا شکار ہوتی ہے جو اکثر مواقع پر

کسی نہ کسی طرح کی زبردستی کا مظاہرہ کر چکا ہوتا ہے۔ اسے اس بات کا غصہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اس کی ناپسندیدہ ہستیوں یعنی اپنے گھر والوں سے اپنا تعلق مکمل طور پر قطع کیوں نہیں کرتا۔ وہ نہیں چاہتی کہ شوہر کسی بھی ایسے فرد سے مل کر خوشی حاصل کرے جسے وہ پسند نہیں کرتی۔ بلکہ کئی بار تو معاملہ اس بیمار حد تک جا پہنچتا ہے کہ اسے شوہر کے دوست بھی برے لگنے لگتے ہیں اور وہ جب بھی موقع ملے ان کا طعن و تشنیع کے ساتھ ذکر کرنے سے گریز نہیں کرتی۔ بلکہ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ شوہر کو زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچا سکے۔ گویا اس کی تسکین منفی جذبوں سے مشروط ہو جاتی ہے۔

ہمارے ہاں گھریلو رشتوں میں مکالمہ ممکن نہیں۔ خاص طور پر میاں بیوی کے درمیان۔ یہاں یا تو حکم چلتا ہے اور یا پھر طعن و تشنیع سے بھری گفتگو۔ مرد اور عورت میں اتنی خصومت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے حربوں سے ایک دوسرے کو اذیت پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور پھر یوں ہوتا ہے کہ آپسی جنسی کشش بھی اس حد تک کمزور پڑ جاتی ہے کہ ان کے بیچ بچوں اور یا پھر خاندانی مجبوریوں اور سماجی دکھاوے کے علاوہ کوئی بانڈ نہیں بچتا جو انہیں ایک دوسرے سے وابستہ رکھے۔

مرد کی نظر میں عورت محض ایک پرکشش جسم ہے۔ وہ اسے صرف لطف دینے والی پراڈکٹ کے طور پر دیکھتا ہے۔ سماج کی جانب سے اسے یہ باور کروایا جاتا ہے کہ وہ جسمانی تعلق میں تسکین لیتی نہیں بلکہ دیتی ہے اور اس کے بدلے میں نان نفقے کی حق دار ٹھہرتی ہے۔ اس سوچ کی پشت پر الہام اور مذہبی روایات کھڑی ہیں، جن کے مطابق عورت کو مرد کی راحت کے لیے بنایا گیا نہ کہ عورت کی راحت کے لیے مرد کو۔ سو اسی لیے جسمانی تعلق یک طرفہ بن کر رہ جاتا ہے۔ شوہر کی بلا سے عورت مطمئن ہو یا نہ ہو، اسے تو بس اپنی آگ بجھانے سے غرض ہوتی ہے یا پھر اس کی کوکھ میں بیج ڈالنے سے، جو کہ اس کی مردانگی پر مہر لگانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

عورت بھی مرد کی طرح جنسی جبلت رکھتی ہے مگر اسے شادی کے تعلق میں بھی اس جذبے کے اظہار کی اجازت نہیں۔ مذہب شرم و حیا کے سبق کے ساتھ پورے طمطراق کے ساتھ اس کے اظہار کے راستے میں کھڑا ہے۔ شوہر کے سامنے جنسی خواہش کے اظہار کا مطلب بدکرداری کی مہر لگواتا ہے جبکہ مرد کی جا

وہ جو دست درازی بھی اس کی مردانگی کا فخر کہلاتی ہے۔ وہ جب چاہے اسے اپنے بستر میں بلا سکتا ہے بھلے وہ اس وقت گھر کے کسی ضروری کام میں ہی کیوں نہ مصروف ہو۔ عورت کو جنسی تسکین کے حصول کا حق نہیں ہاں البتہ پریگنینٹ ہونا اس کا فرض ہے۔ پریگنینٹ ہونے اور نہ ہونے کی صورت میں بوجھ عورت کو ہی اٹھانا ہے۔ پہلی صورت میں بچے کا اور دوسری صورت میں بانجھ ہونے کے الزام کا۔ کیونکہ عمومی طور پر مرد کے نامرد ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عورت کے بانجھ پن کا اعلان معمول کی بات ہے مگر مرد اپنی نامردی کا راز حتی الامکان حد تک چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ محبت اور چاہت کا رشتہ ہو تو ممکن ہے یہ المناک صورتحال رونما نہ ہو مگر روایتی رشتوں میں اس المیے سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔

مذہبی سوچ نے عورت کو احساس کمتری کا شکار بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ بھلے اس کا شوہر اس کے بعد کوئی اور شادی نہ کرے مگر مذہب نے اسے بیک وقت چار بیویاں رکھنے کا حق دے رکھا ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ جب چاہے اسے کھڑے کھڑے طلاق دے کر فارغ کر سکتا ہے۔ جبکہ اسے خلع کا حق لینے کے لیے عدالت کے دھکے کھانے ہوں گے جہاں شوہر کے وکیل کی جانب سے لگائے جانے والے اخلاقی الزامات کا بہتان الگ سے بھگتنا ہوگا۔ اگر اتنی ذلت کے بعد خلع مل بھی گیا تو اسے رہائش اور دوسرے اخراجات کا مسئلہ درپیش ہوگا۔ یہاں مرد چالاکی کے ساتھ مذہب کی صرف ان شقوں کے لاگو ہونے پر اصرار کرتا ہے جو بیوی سے جان چھڑانے اور اسے زیادہ سے زیادہ زچ کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ جبکہ وہ ان تمام شقوں سے بھاگنے کی پوری کوشش کرتا ہے جن کا تعلق بیوی بچوں کے اخراجات کی ادائیگی سے ہوتا ہے۔ ایسے فیصلے کی صورت میں مجہول عورت مزید مجہول بن جاتی ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ خود ترسی کا شکار بن جاتی ہے۔ والدین کے لیے ایسا ناپسندیدہ بوجھ کہ اب جسے کسی نہ کسی طرح دوبارہ سر سے اتار پھینکنا ہے۔ بھلے اس کام کے لیے اسے پہلے سے بھی زیادہ گہرے اور کیچڑ بھرے گڑھے میں کیوں نہ پھینکنا پڑے۔

یہ سب وہ عورت جسے معاشرہ خود گھڑتا اور بنتا ہے اور بڑی محنت سے ایک ناپسندیدہ بوجھ میں ڈھالتا

ہے، خاص طور پر والدین کے لیے جو اس کو اگلے گھر رخصت کرنے کے باوجود اس کی ذمہ داریوں سے مکت نہیں ہو پاتے۔ ایک ایسا وجود جس کا نصیب پیدائش سے موت تک شکوک میں گھرا ہے اور پیدائش کے ساتھ ہی دعاؤں کا محتاج کہ خدا بیٹی کے نصیب اچھے کرے۔ بیٹی کی پیدائش دراصل منحوس خدشات کے نا ختم سلسلے کی شروعات ہے جبکہ بیٹے کی پیدائش خوشیوں کے بڑھتے ہوئے خزانے کا خواب۔ یہی سوچ ہے جو لڑکی کا نصیب مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے مگر ہم اپنی ذمہ داری سے بچنے کے لیے اسے ان دیکھے خدا کے نام لگا دیتے ہیں۔ ہم خوف کو اس کی سرشت میں گھول دیتے ہیں۔ وہ ایک ایسی پراڈکٹ ہے جس نے شادی تک اپنی پیکنگ کی حفاظت کرنی ہے۔ مرد کے برعکس اس پر عصمت کی حفاظت کی ذمہ داری اتنے اصرار کے ساتھ ڈالی جاتی ہے کہ وہ جہاں بھی جاتی ہے ایک ان دیکھا خوف اس کے وجود کو گھیرے رہتا ہے۔ اجنبی مرد اسے بو سونگھنے والے کتوں کی طرح لگتے ہیں۔ یہ خوف اسے انسان شناسی کی صلاحیت سے کم و بیش محروم کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بدن کو سرتاپا لپیٹ کر بھی خود کو محفوظ نہیں سمجھتی۔ اور پھر مرد بڑے تیقن سے کہتا ہے کہ دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ عورت کمزور ہے، کم عقل ہے۔ سو مرد کے پیچھے چلنا اور اس کے فیصلے ماننا اس کا مقدر ہے۔

عورت کو ایسا بنانے میں نہ صرف مقامی قبائلی اور جاگیردارانہ کلچر کا ہاتھ ہے بلکہ اس کے ڈانڈے اس خطے سے بھی جڑے ہیں جہاں سے اسلام آیا تھا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ابتدائی مسلم عرب کی معاشرت پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال لی جائے۔

مسلم عرب کی ابتدائی معاشرت

اگر اسلام کی ابتدائی فتوحات کے زمانے کی تاریخ دیکھیں تو وہ کئی کئی شادیوں کے علی الرغم تعداد کی قید سے آزاد لونڈیوں سے تمتع کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ اس زمانے میں متعہ یعنی عارضی شادی کا رواج بھی عام تھا۔ ہمیں عرب کی اس وقت کی فضا جنسی تعلقات کے حوالے سے بہت کھلی ڈلی دکھائی دیتی ہے۔ کسی عورت کی بیوگی یا طلاق کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی بلکہ وہ بلا لحاظ عمر بے حد آسانی کے ساتھ کسی بھی وقت دوبارہ رشتۂ ازدواج میں بندھ سکتی تھی۔ شادی کے قابل عمر کے مرد کسی بھی عورت کو نکاح کا پیغام پہنچانے میں آزاد تھے۔ بلکہ عمر رسیدہ افراد اپنے لئے ہم عمر دوستوں کی بیٹیوں کا رشتہ مانگتے ہوئے بھی کوئی تعجب محسوس نہیں کرتے تھے۔ پردے کا تصور شرفاء کے خاندانوں کی عورتوں تک ہی محدود تھا۔ لونڈیاں کسی پردے کے بغیر سرعام گھومتی پھرتی تھیں۔ بے پردگی ان کا انتخاب نہیں بلکہ ریاست کی جانب سے عائد کردہ تھی تاکہ انہیں شریف اور نجیب آزاد مسلمان عورتوں سے الگ شناخت کیا جا سکے۔ شاعری روزمرہ کی گفتگو میں شامل تھی۔ اگر آپ عرب کی تاریخ پڑھیں تو ہر فرد شاعری کی زبان میں بات کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ عام زندگی ایک خاص طرح کی یک طرفہ رومانویت میں رچی بسی تھی جس کا لطف زیادہ تر مرد ہی اٹھانے کے حق دار تھے۔

مال غنیمت کے طور پر ہاتھ آنے والی عورتوں کی ان کی مرضی کے بغیر بے جان اشیاء کی طرح مردوں میں تقسیم بھی ایک خاص طرح کے جنسی رجحان کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ یعنی مردوں کو جنسی تمتع کے وافر مواقع دستیاب تھے۔ باندیوں کے علاوہ ایک وقت میں چار چار بیویوں کی مذہبی اجازت بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہے کہ اسلام کا جھکاؤ مرد حضرات کے حق تلذذ کی جانب تھا۔ اسلام واضح طور پر عورت کو

ایک وقت میں ایک سے زیادہ مردوں سے (اور وہ بھی نکاح کی شرط کے ساتھ) تعلق بنانے کی اجازت نہیں دیتا، جبکہ مرد کے لئے اس نے بیک وقت کئی عورتوں سے تمتع کے راستے کھلے رکھے ہیں۔ حق طلاق نے چار سے بھی زیادہ عورتوں سے لطف اندوز ہونے کا راستہ کھول دیا تھا۔ یعنی پہلی بیویوں میں سے کسی ایک کو طلاق دی اور نئی کو گھر میں ڈال لیا۔ ازدواجی اور زندگی کے جملہ معاملات کے حوالے سے قرآن شاذ ہی عورتوں سے خطاب کرتا ہے بلکہ وہ براہ راست مردوں سے مخاطب ہوتا ہے اور انہی کے ذریعے عورتوں تک اپنے احکامات کی ترسیل کرتا ہے۔ جنت کی موعودہ حور و غلمان کے حوالے سے تمام آیات کا مخاطب مرد ہی ہیں۔ شائد اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اسلام کے ابتدائی دور میں مذہب کو بچانے کے لئے جو فوج درکار تھی اس میں بھاری بھرکم تلواریں چلانے اور کمانیں کھینچنے کے لئے مردوں پر انحصار ناگزیر تھا۔ جنگ میں جان دینا کوئی آسان کام نہیں تھا سو اس قربانی کے لئے ایسی مراعات کا وعدہ بہت ضروری تھا جو لڑنے والوں کی ایک خاص جبلت کو سب سے زیادہ مرغوب تھیں۔

''ان جنتوں میں چیدہ حسینائیں ہوں گی۔ حوریں جو خیموں میں ٹھہرائی ہوں گی۔
انھیں اپنے شوہروں سے پہلے کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا نہ کسی جن نے۔''
ترجمہ سورۃ رحمٰن: 70,74

''یہ تو ہوگا ہی اور ہم متقی بندوں کی (جنت میں) بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے شادی کرائیں گے۔'' ترجمہ سورۃ دخان: 54

''ہم نے ان کی اُٹھان کا بہترین سامان کیا۔ تو ہم نے انھیں بنایا کنواریاں، اپنے شوہروں کے دلوں کو موہنے والی اور ان کی ہم عمر۔'' ترجمہ: سورۃ واقعہ: 35,37

''متقی لوگوں کے پاس (جنت میں) اپنے شوہروں پر نگاہیں مرکوز رکھنے والی ان کی ہم عمر بیویاں ہوں گی۔ یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے بدلہ کے دن کے لیے وعدہ کیا جا رہا تھا۔ (جنتی پکار اٹھیں گے) بے شک یہ ہماری روزی ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی۔''

ترجمہ سورۃ ص: 52,54

جنگ کے دوران عورتوں کا کام صرف زخمیوں کی مرہم پٹی اور پانی پلانے تک محدود تھا اور ویسے بھی انھیں فطری اور سماجی طور پر اپنے شوہروں کے ساتھ وفاداری کا پابند اور ثانوی حیثیت کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ عورتوں کے لیے براہ راست مردوں جیسے کسی مراعاتی وعدے کا تذکرہ نہیں ملتا۔ الہامی متن میں مردوں کی جنسی خواہش کی حتی الامکان حد تک تکمیل کے راستے کھولنا اور پھر مرنے کے بعد بھی نیک مردوں کے لیے حوروں کا وعدہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اسلام مردوں کی حد تک جنسی جبلت کی تسکین کو انتہائی حد تک تسلیم کرتا ہے لیکن عورتوں کے باب میں کم و بیش خاموش ہے۔

اسلام کے نام پر عورت مرد کے میل ملاپ کے ضمن میں جس طرح کے سخت پردے اور شرم و حیا کی تہذیب کا تصور ہمارے ہاں معروف ہے، اُس وقت کی عرب سوسائٹی میں دو طرح کے معاملات ایسے تھے جو ہماری اس سادہ فہمی کی تردید کرتے ہیں۔ ایک تو جنگ میں پکڑی گئی عورتوں کے ساتھ بلا نکاح جنسی تعلق کی مذہبی اجازت اور دوسرا نکاح متعہ جسے اگرچہ مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت آج درست نہیں مانتی لیکن وہ یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے دور تک عارضی نکاح کی پریکٹس رواج میں تھی۔ ایران کے اہل تشیع آج بھی متعہ کو عین اسلامی مانتے ہیں اور بوقتِ ضرورت اسے پریکٹس بھی کرتے ہیں۔ اسی کی دہائی میں اپنے دورِ اقتدار میں ایرانی صدر اکبر ہاشمی رفسنجانی نے نوجوانوں کو متعہ کی عام اجازت بخشی۔ بلکہ انھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ایسے افراد کو کسی مولوی کے پاس جانے، متعہ کو رجسٹرڈ کروانے اور گواہوں کا بندوبست کرنے کا تردد کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ دوسرے فرقے نکاح متعہ سے ابا اور برأت کا اظہار کرتے ہیں لیکن عرب علما نے شرائط سے [illegible] کے ساتھ نکاح مسیار کے نام پر عارضی جنسی تعلق کا راستہ کھول دیا ہے۔ یعنی آپ کسی بھی دوسرے شہر میں ایک عارضی بیوی رکھ سکتے ہیں جسے آپ نہ صرف نان نفقہ فراہم کرنے کی پابندی سے آزاد ہوں گے بلکہ وہ اپنے والدین کے ساتھ ہی رہائش پذیر رہے گی۔ بس جب بھی آپ کسی کام کے سلسلے میں اس شہر میں قیام کریں گے، آپ عورت کی رفاقت سے محروم نہیں رہیں گے۔

یہ متعہ کیا ہے؟

جہاں تک متعہ کا تعلق ہے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ کوئی بھی فرد اپنی وقتی جنسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنی محرمات کے سوا کیمونٹی کی کسی بھی کنواری، مطلقہ یا بیوہ عورت سے رجوع کرنے کا حق رکھتا تھا جس کے لئے صرف دو شرطوں کا پورا ہونا ضروری تھا۔ ایک یہ کہ مرد کے پاس عورت کو دینے کے لئے کوئی نقدی یا شے ہو اور دوسرا یہ کہ عورت کو اس تعلق پہ کوئی اعتراض نہ ہو۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا کوئی سوسائٹی مردوں کو اپنی جنسی خواہش کی تسکین کے لئے اس سے زیادہ آزادی فراہم کر سکتی ہے؟

آج جب ہم متعہ کے بارے میں سوچتے ہیں ہمارے ذہن میں اُس وقت کی عرب سوسائٹی کے بارے میں کچھ سوالات کا ابھرنا بالکل فطری ہوگا۔ مثلاً ایک ایسے مذہب پر عمل پیرا سوسائٹی جو مرد اور عورت دونوں کی عصمت وعفت کی حفاظت پر بہت زیادہ زور دیتا ہو، جہاں پردے کی پابندی کا یہ عالم ہو کہ بینا عورت کے لئے نابینا شخص کو دیکھنے کی بھی ممانعت ہو اور جہاں پردے کے پیچھے سے بھی کسی عورت کا غیر مرد سے ملائم آواز میں کلام کرنا منع ہو، وہاں کوئی مرد کس طرح سے کسی خاتون کو جا کر براہ راست یہ پوچھتا ہوگا کہ کیا وہ اس کے ساتھ رقم یا کسی شے کے عوض ایک طے شدہ عرصہ کے لیے جنسی تعلق بنانے کے لئے تیار ہے۔ اور پھر اس خاتون کے گھر والے اس عارضی جنسی تعلق کو (چاہے وہ مذہب کے مقدس نام پر ہی کیوں نہ ہو) کیسے قبول کر لیتے ہوں گے۔ اور اگر یہ مان لیا جائے کہ اس سماج میں خاندان کے دباؤ سے مکمل آزاد عورتیں موجود تھیں تو پھر ان کی سماجی حیثیت ایک طوائف سے مختلف کیا تھی جو کہ محض جنسی لذت کا ایک کھلونا سمجھی جاتی ہے۔ اگر نکاح کی یہ رسم رائج تھی (جیسا کہ نیچے بیان کئے گئے واقعات سے تصدیق ہوتی ہے) تو ظاہر ہے یہ تعلق زنا کی طرح خفیہ نہیں بلکہ نکاح کی طرح کسی حد تک اعلانیہ ہوتا ہوگا اور مرد اور عورت کے رشتہ دار بھی ان کے اس عارضی تعلق سے نکاح کی طرح ہی آگاہ ہوتے ہوں گے۔ لیکن پھر ایک اور سوال بھی اٹھتا ہے کہ ہم اس تعلق کو طوائفیت کی صورت سے کیونکر ممیز کر سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ ایسا تعلق بناتے وقت چند مذہبی کلمات پڑھ کر یا کسی الوہی ہستی کو گواہ بنا لیا جائے۔ ہم مغربی سماج کو اسی بنیاد پر بداخلاق گردانتے ہیں کہ وہاں بن

بیا ہے تعلقات نہ صرف عام ہیں بلکہ انہیں والدین اور سوسائٹی سے چھپایا بھی نہیں جاتا۔ اور مزید یہ کہ ان تعلقات میں طوائف کے ساتھ تعلق یا شریف عورت کے ساتھ متعہ کی طرح کوئی رقم بھی طے نہیں کرنی پڑتی۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ یہ تعلق دو بالغ افراد کی آزاد مرضی اور ایک دوسرے کے لئے پسندیدگی بلکہ محبت کی بنیاد پر طے پاتا ہے جو کہ بادی النظر میں متعہ اور طوائف بازی کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ انسانی اور کاروبار سے مبرا دکھائی دیتا ہے۔

متعہ کے بارے میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایات

حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ لڑائیوں پر جایا کرتے تھے اور ہمارے لیے کوئی سامان نہ ہوتا تھا (جس سے جنسی خواہش پوری کی جاتی) تو ہم نے کہا ہم خصی نہ ہو جائیں؟ حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور ہمیں اجازت دی کہ ہم عورتوں سے کچھ لباس وغیرہ کے عوض متعہ کر لیا کریں۔

(صحیح بخاری مطبوعہ مصر جلد 3، صفحہ 146)

جابر بن عبداللہ اور سلمہ بن الاکوع سے روایت ہے کہ وہ کسی لشکر میں تھے اور حضور ﷺ کی طرف سے ایک آدمی نے آکر کہا "متعہ کی اجازت ہے۔"

(صحیح بخاری جلد 3، صفحہ 150۔ صحیح مسلم صفحہ 450)

سبرہ جہنی کی روایت ہے کہ ہمیں حضور ﷺ نے متعہ کی اجازت دی۔ میں اور ایک دوسرا شخص ساتھ ساتھ گئے۔ ہم بنو عامر کی ایک عورت کے پاس پہنچے اور اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے اجرت کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے اپنی چادر اور میرے ساتھی نے اپنی چادر کی پیشکش کی۔ اس آدمی کی چادر مجھ سے بہتر تھی مگر میں اس کی نسبت بہتر جوان تھا۔ عورت کبھی مجھے دیکھتی اور کبھی اس کی چادر پر نظر ڈالتی تو اس کی جانب راغب ہو جاتی۔ چہروں پہ نظر ڈالتی تو مجھے پسند کرتی۔ پھر اس نے میرے حق میں فیصلہ دیا اور کہا تمہاری چادر میرے لئے کافی ہے۔ میں تین دن تک اس کے ساتھ رہا۔

(صحیح مسلم صفحہ 451)

ایک روائت کے مطابق یہ واقعہ فتح مکہ کا ہے جہاں صرف پندرہ روز ٹھہرنے کا بیان ہے۔

متعہ کے بارے میں آج تک اتفاق نہیں ہو سکا کہ آیا یہ قرآنی حکم تھا اور یہ بھی کہ یہ حکم آج بھی قائم ہے یا منسوخ ہو چکا ہے۔ ہاں البتہ اس بات سے کوئی فرقہ انکار نہیں کرتا کہ یہ ہجرت کے بعد بھی (کم و بیش غزوۂ اوطاس تک) عمل میں آتا رہا تھا۔ کنزالاعمال میں درج روایات کے مطابق متعہ حضرت عمرؓ نے منسوخ کیا۔ اسی لیے اہل تشیع کا موقف یہ ہے کہ متعہ سے حضورﷺ نے منع نہیں فرمایا بلکہ یہ حضرت عمرؓ کا تعزیری حکم تھا جو انھوں نے بعض وقتی مفاسد دیکھ کر نافذ کیا تھا۔

متعہ باقی ہے یا منسوخ ہو چکا، اس سوال سے قطع نظر ہر حساس ذہن جب اس کے نفاذ کی عملی صورتوں پر غور کرتا ہے تو چکرا کر رہ جاتا ہے کہ آخر ہمارے مذہب کے نفاذ کے آئیڈیل ترین دور میں ایسا کس طرح ممکن ہوتا ہوگا کہ دو افراد کو راستے میں کوئی اجنبی عفیفہ نظر آئے اور ان میں سے ایک اپنی چادر یا کسی اور شے یا نقدی کے عوض اسے متعہ کے نام پر تعلق قائم کرنے کے لیے راضی کر لے۔

مفتوح اقوام کی عورتوں کا معاملہ

ایک زمانہ تھا جب کوئی فوج دشمن کا علاقہ فتح کرتی تھی تو فاتح فوج کے سپاہی فتح کے ہنگام میں بطور انعام اپنی جملہ جبلتوں کو مکمل وحشت کے ساتھ تسکین دینے کے لئے آزاد چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ مگر اسلام نے ایک راستہ یہ نکالا کہ مفتوحہ دشمن کے پکڑے گئے مردوں اور عورتوں کو ریاستی انتظام کے ساتھ مال غنیمت کی طرح فاتح فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اب اس کے بعد یہ نئے مالکان کی صوابدید تھی کہ وہ ان غلاموں اور لونڈیوں کو اپنی خدمت کے لئے مختص کر لیں یا کسی دوسرے کو فروخت کر دیں۔ اس معاملے میں غلام عورتوں کے لیے ایک اضافی اُفتاد یہ تھی کہ وہ دوسری خدمات کے علاوہ اپنے مالک کی جنسی تسکین کی بھی پابند تھیں اور لونڈی ہونے کے ناطے انہیں انکار کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں ان کے لیے انسانی حقوق کے تمام ضابطے منسوخ قرار پاتے تھے۔ یہ ایک ایسی سماجی قدر تھی جسے ریاستی سطح پر اس وقت کے قانون کی حیثیت حاصل تھی۔ یعنی صحرائی مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر انسانی تکریم کے بارے میں اسلام کی جانب سے بیان کردہ اعلیٰ اخلاقی معیاروں کے

باوجود اس معاملے میں کوئی چبھن محسوس نہیں کرتا تھا۔ ہمارے آج کے مذہبی سکالرز کو یہی مشکل درپیش ہے کہ وہ اس وقت کی مروجہ غلامی اور انسانی احترام کے بارے میں اسلام کے آفاقی قسم کے بیانات میں کیسے تطابق پیدا کریں۔ اگرچہ آج یہ سوچنا بھی مشکل لگتا ہے کہ جنگ کی صورت میں دوبارہ غلامی کے چودہ سو برس پرانے ضابطے نافذ کئے جا سکتے ہیں مگر ایک مذہبی سکالر سید ابوالاعلی مودودی صاف صاف یہ کہتے ہیں کہ کفار سے جنگ کی صورت میں ہمیں ضمیر کی کسی ملامت کے بغیر آج بھی ان ضابطوں کو خدائی احکامات کے طور پر نافذ کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان کے بقول قرآن کی کسی بھی آیت سے غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں احکامات کی تنسیخ ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں یہ الگ بات کہ وہ اس غیر انسانی ادارے کو تاویلات کے جال اور لفظوں کے ہیر پھیر سے جنگی صورتحال میں ایک بہترین خدائی حل ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے لاحاصل دلائل دیتے ہیں کہ جو شاید خود خدا کا منشا بھی نہ ہوں۔

عورت اور مولانا مودودی

بلا نکاح تمتع کے حق میں مولانا مودودی کی تاویلات

مولانا مودودی کی حیثیت ایک ایسے مذہبی سکالر کی ہے جنہوں نے باقاعدہ ایک جماعت بنا کر اپنی مذہبی سوچ کی اس منصوبے کے ساتھ تبلیغ کی کہ برصغیر کے پڑھے لکھے طبقے اور خاص طور پر نوجوان طلباء کو اپنے فہم اسلام کا ہم نوا بنا کر اقتدار میں آ سکیں۔ ان کے مداحین نے انھیں ایک جدید اسلامی مفکر ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کی اور وہ اپنے اس پراپیگنڈے میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے، جبکہ ان کی کتب کا سرسری سا مطالعہ بھی اس تاثر کے ابطال کے لئے کافی ہے۔ مولانا کی تحریریں صاف بتاتی ہیں کہ ان کی شخصیت میں ایک جاگیردارانہ سوچ کا حامل مولوی چھپا بیٹھا ہے جو صرف مغربی سکالرز کی تحریروں کے حوالوں، انگریزی زبان کی جدید اصطلاحات، مناسب الفاظ کے چناؤ اور جملہ سازی کی مہارت کی وجہ سے جدید دکھائی دیتا ہے۔ مولانا کا ایک کمال یہ تھا کہ وہ ہر طرح کی تاویلات کے ماہر تھے اور اپنے قاری کو گھمانے کا فن خوب جانتے تھے۔ کئی جگہ تو وہ اپنے ہی موقف سے اس انداز میں پھر جاتے تھے کہ ان کی تحریر کے سحر میں مبتلا قاری اس تضاد کو جان ہی نہیں پاتا تھا۔ یہاں مولانا کا تذکرہ اس حوالے سے ضروری ہے کہ ان کی مذہبی فکر کو دورِ حاضر کی بہترین اور نمائندہ فکر کے طور پر

پیش کیا جاتا ہے اور اس مقصد کے لیے ان کی جماعت کو تعلیم یافتہ افراد کی کھیپ کے علاوہ ہر طرح کے وسائل بھی وافر مقدار میں میسر ہیں اور انہیں بین الاقوامی سطح پر نیٹ ورک بھی دستیاب ہے جو مولانا کی فکر کے جدید ہونے کے تاثر کو (جھوٹا) اعتبار بخشتا ہے۔ ہم نے ان کی کتب سے جو حوالے اخذ کیے ہیں وہ اس تاثر کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ حوالے یہ بتاتے ہیں کہ عورت کے بارے میں مولانا مودودی کی سوچ ویسی ہی مردانہ نوعیت کی ہے جیسی کہ کسی قبائلی یا فیوڈل طبقے سے تعلق رکھنے والے انسان کی ہو سکتی ہے۔ ان کا بس چلے تو وہ اپنے پیروکاروں کے ذریعے آج بھی وہ دور واپس لے آئیں جب جنگوں میں دشمن کی عورتوں کو بھیڑ بکریوں کے طور پر آپس میں بانٹ لیا جاتا تھا۔ نہ طلاق اور عدت کا تکلف اور نہ نکاح کا تردد۔ جب تک من چاہا انہیں استعمال کیا اور دل بھر گیا تو دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالا یا بہت ہوا تو کسی اپنے کو تحفتاً بخش دیا۔

لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع کے بارے میں مولانا مودودی کی تاویلات مضحکہ خیز دلچسپی سے خالی نہیں۔ انکا کہنا ہے کہ نکاح کی عادی طبیعتیں خوامخواہ لونڈیوں سے بن نکاحے تعلق سے الرجک ہیں جبکہ جنگ میں پکڑی گئی عورتوں کا اس سے بہتر انتظام کوئی ہو ہی نہیں سکتا کہ انہیں جنگجوؤں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان کے خیال میں اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ عورتیں پورے سماج کو گندہ کر دیں گی۔ گویا ان عورتوں کے ساتھ زبردستی کا جسمانی تعلق ان کے نزدیک پاکیزہ عمل ہے اور وہ بھی اس حالت میں کہ وہ اپنی قوم کی شکست اور اپنے پیاروں کے قتل کے تازہ تازہ صدمے سے دوچار ہوں۔ مولانا صاحب ایک سوال کے جواب میں اپنی کتاب 'تفہیمات' حصہ دوئم میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''رہی پہلی شکل، یعنی حق ملکیت کی بنا پر تمتع کرنا، تو وہ بھی جائز ہے اس لئے کہ قرآن مجید میں ملک یمین کی بنا پر تمتع کی صریح اجازت دی گئی ہے اور اس کے ساتھ کوئی شرط یا قید بھی نہیں لگائی گئی ہے۔ اس میں بظاہر جو کراہت نظر آتی ہے وہ محض ایک وہمی کراہت ہے۔ چونکہ طبیعتیں نکاح کے عام اور معروف طریقے کی خوگر ہو چکی ہیں اس لئے لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت اور مرد کا وہی تعلق جائز ہے جس میں قاضی صاحب آئیں،

دو گواہ ہوں، ایجاب و قبول ہو اور خطبۂ نکاح پڑھا جائے۔ اس کے سوا جو صورت ہے وہ محض شہوت رانی ہے۔ لیکن اسلام کوئی رسمی مذہب نہیں بلکہ ایک عقلی مذہب ہے۔ وہ رسم کو نہیں حقیقت کو دیکھتا ہے۔ نکاح سے ایک عورت جو ایک مرد کے لئے حلال ہوتی ہے تو آخر اسی بنا پر حلال ہوتی ہے کہ اللہ کے قانون نے اس کو حلال کیا ہے۔ اسی طرح اگر ملکِ یمین کی بنا پر اللہ کا قانون اس کو حلال کرے تو اس میں کراہت کی کون سی بات ہے؟ نکاح کا مقصد انسان کے جذبۂ شہوت رانی کو ایک حد کے اندر محدود کرنا اور ایک ضابطے سے منضبط کرنا اور مرد و زن کے تعلق کو ایک باقاعدہ و تمدنی تعلق کی صورت میں قائم کرنا ہے۔ اسی لئے اعلان کی شرط لگائی گئی ہے کہ سوسائٹی میں یہ امر معلوم و مشتہر ہو جائے کہ فلاں عورت فلاں مرد کے لئے مختص ہو چکی ہے، اس کے بطن سے جو اولاد ہوگی وہ فلاں شخص کی ہوگی۔ اور اس عورت کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا زوجی تعلق نہ ہوگا۔ یہ سب اغراض ملکِ یمین سے بھی پوری ہو سکتی ہیں۔ سوسائٹی میں یہ امر معلوم و مشتہر و معلوم ہوتا ہے کہ فلاں لونڈی فلاں شخص کی مملوکہ ہے۔ کسی دوسرے کے لئے اس لونڈی سے زوجی تعلق پیدا کرنا جائز نہیں جب تک کہ مالک اپنی رضامندی سے اس کو نکاح میں نہ دے دے۔ لہٰذا ایک عورت کا مرد کے لئے مخصوص ہونا اس صورت میں بھی ویسی ہی قطعیت اور شہرت کے ساتھ واقع ہوتا ہے جس طرح کہ نکاح کی صورت میں ہوا کرتا ہے۔ مالک کے تصرف میں آ جانے کے بعد ایک عورت اگر صاحبِ اولاد ہو جائے تو وہ اس خاندان کی فرد بن جاتی ہے۔ اس کو امِ ولد کہا جاتا ہے۔ مالک کی وفات کے بعد وہ آپ سے آپ آزاد ہو جاتی ہے۔ اس کی اولاد جائز سمجھی جاتی ہے اور اپنے باپ سے شرعی ورثہ پاتی ہے۔ اس اولاد کے قانونی حقوق وہی ہوں گے جو شریعت میں صلبی اولاد کے لئے مقرر ہیں۔ پھر کیا یہ نکاح کی طرح باقاعدہ زوجی تعلق نہیں ہے؟''

کتنی دلچسپ مگر مضحکہ خیز بات ہے کہ لونڈیوں کے ساتھ بن نکاحے اور وہ بھی ان کی عزت نفس کو روند بنائے گئے تعلق کو جواز عطا کرنے کے لئے مولانا کو نکاح جیسے اہم اور مقدس مذہبی معاملے کو بھی معطل کرنے میں ذرا باک محسوس نہیں ہوتا۔ ایسی مردانہ زبردستی تو طوائف کے ساتھ تعلق میں بھی نہیں کی جاتی جسے مذہب زنا جیسے سخت جرم سے تعبیر کرتا ہے اور جس کی واضح سزا موجود ہے۔ لونڈی کے ساتھ زبردستی جنسی تعلق بنانے کے برعکس طوائف ایک مالی معاہدے کے تحت طے شدہ وقت کے لیے مرد کو اپنے جسم کا اختیار دیتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مولانا کے تاویلاتی موقف کے بعد نکاح ایک اضافی اور رسمی سا معاملہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ مولانا کا کمال ہے کہ وہ انشاء پردازی کے زور پر ایک سربسر غیر انسانی بلکہ عورت کی عزت کی پامالی کے ساتھ بنے والے تعلق کو بھی یوں گلیمرائز کرتے ہیں کہ وہ قابل افتخار دکھائی دینے لگے۔ ان کی تحریر سے یہ تاثر بنتا ہے کہ قیدی بن جانے والی کافر عورتوں کو خدا کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ وہ ایک غیر انسانی قوم کے چنگل سے نکل کر بہترین انسانوں کے جنسی تصرف میں آ گئی ہیں۔ کیا ہوا اگر ان کی کوکھ کے جنے اور ان کے گھر والے قتل ہو گئے یا ان سے دور کر دیئے گئے۔ کیا یہ کم فخر کی بات ہے کہ اب وہ کفر کی بجائے مسلمانوں کے بچے پیدا کریں گی، اور مزید ثواب کی بات یہ کہ بے نکاحے تعلق کے باوجود وہ بچے حرامی نہیں کہلائیں گے۔ ہاں یہ الگ بات کہ ان عورتوں کو زوجہ کی بجائے ام الولد کا امتیازی نام دیا جائے گا اور وہ بھی اولاد پیدا کرنے کی صورت میں۔

لونڈیوں کو مخصوص افراد کے تصرف میں دیئے جانے کے بارے میں مولانا کی دلیل یہ ہے کہ اگر ان عورتوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ سوسائٹی میں فسق و فجور کے جراثیم پھیلا دیں گی۔ یعنی مولانا نے خود سے یہ تصور باندھ لیا کہ کافر ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ ایسی اخلاق باختہ ہوں گی جنہیں اپنے بدن کی عزت و حرمت کا کوئی احساس یا پاس نہیں ہوگا (گویا یہ وصف تو صرف مسلمان عورتوں سے مخصوص ہے)، اور وہ جگہ جگہ حرام کاری کرتی پھریں گی۔ لیکن سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ حرام کاری کریں گی کس کے ساتھ؟ ظاہر ہے مردوں کے ساتھ، اور وہ بھی صاحب ایمان مردوں کے ساتھ۔ اور

بقول مولانا

''ایک طرف سوسائٹی خراب ہوگی اور دوسری طرف خود ان (لونڈیوں) کی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے ذلت کے داغ لگ جائیں گے۔''

یعنی اگر ایک غیر مرد (ان کی مرضی کے خلاف) ان سے جسمانی تعلق بنائیں تو یہ عین اخلاقی طریقہ کہلائے گا اور اگر وہ اپنی مکمل مرضی کے ساتھ کسی کو اپنا ساتھی بنائیں تو ان کی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے ذلت کے داغ لگ جائیں گے۔ لیکن سوال تو یہ اٹھتا ہے کہ جناب کیا اس اہل ایمان وایقان سوسائٹی کے مردوں کا کردار اس قدر کمزور ہوگا کہ وہ آوارہ پھرتی کسی بھی لونڈی کے غمزوں کا شکار ہو کر اپنا ایمان کھو بیٹھیں گے اور ان پر جھپٹ پڑیں گے۔ اور کیا مولانا اس حقیقت سے آگاہی نہیں رکھتے کہ لونڈیوں کو نہ صرف پردہ کرنے سے زبردستی روکا گیا بلکہ مرد خریداروں کو ان کے عریاں جسموں کو (سوائے شرمگاہ کے) چھو کر چیک کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اب یہ بات تو مولانا مرحوم کا دکیلانہ دماغ ہی بتا سکتا تھا کہ ان باتوں سے عورت ذات کے لیے کون سا احترام ثابت ہوتا ہے۔

مولانا ایک جانب تو لونڈیوں کی ملکیت اور ان سے ان کی مرضی کے بنا ان پر مالکان کے جنسی تصرف کو نکاح کے مماثل قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف آزاد عورتوں کے مقابلے میں انہیں انتہائی کمتر حیثیت کی حامل بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی کتاب کا ایک پیرا ملاحظہ کیجئے!

''مرد کو جو حاکمانہ اختیارات محض خاندان کے نظم کی خاطر دیئے گئے ہیں ان سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ ظلم نہ کر سکے، اور ایسا نہ ہو کہ تابع ومتبوع کا تعلق لونڈی اور آقا کا تعلق بن جائے۔''

یعنی آزاد عورت کے معاملے میں نکاح کے باوجود وہ آقا اور لونڈی جیسے رشتے کو ظلم کہہ کر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں مگر کفار کی عورتوں کے ساتھ بن نکاحے اور غلامانہ رشتے کو بھی وہ عزت اور افتخار کا نشان ثابت کرتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ دونوں صورتوں میں مرد کو ہی عورت کا حاکم اور مالک مانتے ہیں۔ اب ان تصورات کی موجودگی میں مولانا کس منہ سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کے بیان کردہ

بقول مولانا

''ایک طرف سوسائٹی خراب ہوگی اور دوسری طرف خود ان (لونڈیوں) کی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے ذلت کے داغ لگ جائیں گے۔''

یعنی اگر ایک غیر مرد (ان کی مرضی کے خلاف) ان سے جسمانی تعلق بنائیں تو یہ عین اخلاقی طریقہ کہلائے گا اور اگر وہ اپنی مکمل مرضی کے ساتھ کسی کو اپنا ساتھی بنائیں تو ان کی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے ذلت کے داغ لگ جائیں گے۔ لیکن سوال تو یہ اٹھتا ہے کہ جناب کیا اس اہل ایمان وایقان سوسائٹی کے مردوں کا کردار اس قدر کمزور ہوگا کہ وہ آوارہ پھرتی کسی بھی لونڈی کے غمزوں کا شکار ہو کر اپنا ایمان کھو بیٹھیں گے اور ان پر جھپٹ پڑیں گے۔ اور کیا مولانا اس حقیقت سے آگاہی نہیں رکھتے کہ لونڈیوں کو نہ صرف پردہ کرنے سے زبردستی روکا گیا بلکہ مرد خریداروں کو ان کے عریاں جسموں کو (سوائے شرمگاہ کے) چھو کر چیک کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اب یہ بات تو مولانا مرحوم کا وکیلانہ دماغ ہی بتا سکتا تھا کہ ان باتوں سے عورت ذات کے لیے کون سا احترام ثابت ہوتا ہے۔

مولانا ایک جانب تو لونڈیوں کی ملکیت اور ان سے ان کی مرضی کے بنا ان پر مالکان کے جنسی تصرف کو نکاح کے مماثل قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف آزاد عورتوں کے مقابلے میں انہیں انتہائی کمتر حیثیت کی حامل بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی کتاب کا ایک پیرا ملاحظہ کیجئے!

''مرد کو جو حاکمانہ اختیارات محض خاندان کے نظم کی خاطر دیئے گئے ہیں ان سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ ظلم نہ کر سکے، اور ایسا نہ ہو کہ تابع ومتبوع کا تعلق لونڈی اور آقا کا تعلق بن جائے۔''

یعنی آزاد عورت کے معاملے میں نکاح کے باوجود وہ آقا اور لونڈی جیسے رشتے کو ظلم کہہ کر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں مگر کفار کی عورتوں کے ساتھ بن نکاحے اور غلامانہ رشتے کو بھی وہ عزت اور افتخار کا نشان ثابت کرتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ دونوں صورتوں میں مرد کو ہی عورت کا حاکم اور مالک مانتے ہیں۔ اب ان تصورات کی موجودگی میں مولانا کس منہ سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کے بیان کردہ

آپ نے ادا فرمایا دیا ہے اور ان عورتوں کو جو (احکامِ الٰہی کے مطابق) آپ کی مملوک ہیں، جو اللہ نے آپ کو مالِ غنیمت میں عطا فرمائی ہیں۔''

مزید آگے چل کر سورۃ النساء کا حوالہ دیتے ہیں:

''اور شوہر والی عورتیں (بھی تم پر حرام ہیں) سوائے ان (کافروں کی قیدی عورتوں) کے جو تمہاری ملک میں آجائیں۔''

عورتوں کی حیثیت کو کمتر ثابت کرنے کے حوالے سے مولانا مودودی کے تصورات بالکل روایتی مُلاؤں جیسے ہیں جبکہ انشاء پردازی میں ملفوف دلائل ان سے بھی کہیں زیادہ خطرناک۔ ان کی تحریروں میں پائے جانے والے تضادات اپنی مثال آپ ہیں۔ اپنی تصنیف 'پردہ' میں دعوے کے انداز میں یوں رقم طراز ہیں:

''۔۔۔ اسلام نے عورت کو جیسے وسیع تمدنی و معاشی حقوق دیئے ہیں، اور عزت و شرف کے جو بلند مراتب عطا کئے ہیں، اور ان حقوق و مراتب کی حفاظت کے لیے اپنی اخلاقی اور قانونی ہدایات میں جیسی پائیدار ضمانتیں مہیا کی ہیں، ان کی نظیر دنیا کے کسی قدیم و جدید نظامِ معاشرت میں نہیں ملتی۔''

یہ وسیع تمدنی و معاشی حقوق اور انکی پائیدار ضمانت کی صورت کتنی 'دل کشا' اور ستم ظریفانہ ہے، اسے جاننے کے لئے بھی ہم مولانا کی اسی کتاب 'پردہ' سے ایک اقتباس پیش کئے دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ

''غرض ہر طریقہ سے عورت کے گھر سے باہر نکلنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور اس کے لیے قانونِ اسلامی کی پسندیدہ صورت یہی ہے کہ وہ گھر میں رہے۔''

مزید فرماتے ہیں کہ

''جس طرح شادی شدہ عورت اپنے شوہر کی تابع ہے اسی طرح غیر شادی شدہ عورت اپنے خاندان کے ذمہ دار مردوں کی تابع ہے۔۔۔ نظامِ معاشرت کو اختلال و برہمی سے محفوظ رکھنے اور خاندان کے اخلاق و معاملات کو اندرونی و بیرونی فتنوں سے بچانے

کی ذمہ داری مرد پر ہے، (یہ بات لکھتے وقت وہ عربی سماج میں ریاست کے حکم کے مطابق بے پردہ پھرنے والی لونڈیوں کو بالکل بھول جاتے ہیں، گویا وہ عورتیں نہیں بلکہ پلاسٹک کی بے جان گڑیاں تھیں جن سے نظام معاشرت میں اختلال و برھمی کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ مصنف) اور اس نظم کی خاطر عورت پر یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ جو شخص اس نظم کا ذمہ دار ہو اس کی اطاعت کرے، خواہ وہ اس کا شوہر ہو، یا باپ یا بھائی۔"

یعنی عورت کی آزادی کی انتہا بھی ہے کہ وہ کسی نہ کسی صورت مرد کی اطاعت گزار اور اس کی مرضی کی غلام ہو۔ مولانا کے بقول اسلام نے عورت کو جو وسیع تمدنی و معاشی حقوق دیئے ہیں، اور عزت و شرف کے جو بلند مراتب عطا کئے ہیں، وہ سب کے سب گھر کی "وسیع و عریض" چار دیواری تک ہی محدود ہیں۔ ان کے خیال میں اگر عورت اس حد سے باہر قدم دھرے گی تو سماج میں ایسا بھونچال آئے گا کہ سماج اختلال (یعنی جنون) اور برہمی کا شکار ہو جائے گا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ جنون اور برہمی مردوں میں ہی پیدا ہوگی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا اس ذکی الحس مرد کو ہی شوہر، باپ اور بھائی کی شکل میں عورت کی عزت و عفت کی گارنٹی اور نگرانی کا ذمہ دار بھی قرار دیتے ہیں۔ گویا ہر مرد کو چاہئے کہ وہ دوسرے تمام مردوں کو ایسا بھیڑیا سمجھے جو اس کی خواتین کو گھر سے باہر دیکھتے ہی جنسی جنونی میں بدل جائے گا اور ان کی عزت سر بازار تار تار کر دے گا۔

غور کیا جائے تو روایتی مذہبی علما اور نام نہاد جدید سکالرز کے نزدیک عورت کو عزت و شرف کے بلند مراتب عطا کرنے کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ عورت کو مذہب کے نام پر باہر کی دنیا کے تجربات سے کاٹ کر گھر کی محدود دنیا میں بزور تحکم بند کر دیا جائے، جہاں ہر سال بچے پیدا کرنے، امور گھر کے کام کاج، اور اپنی ہم جنسوں کے ساتھ چغلیاں کرنے کے علاوہ اس کا اور کوئی کام نہ ہو۔ معلوم نہیں ایسی صورتحال میں وہ عظیم کردار کی مالک اور دانش کی حامل ماں کیونکر وجود میں آ سکتی ہے جس کا منصب اولاد کو بہترین انسان بننے کی تربیت دینا ہے۔ تو جناب یہ ہے مولانا کا جدید اسلامی فہم جس

میں عورت کو ایک آزاد انسان کے طور پر فیصلہ سازی کا حق حاصل نہیں ہے مگر دعویٰ یہ ہے کہ عورت کے لیے دینی منصب اور طرز زندگی عزت اور افتخار کا وہ بلند ترین مقام رکھتا ہے جہاں کسی اور قوم کی سوچ بھی پر نہیں مار سکتی۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہ چاہیں گے کہ مذہب کے ایک بنیادی ماخذ یعنی احادیث کا جائزہ لے لیا جائے کہ ان میں عورت کا کیا مقام اور کردار متعین کیا گیا ہے۔

گھر کے نچلے حصے میں رہتے تھے اور وہ گھر کے اوپر رہا کرتی تھی۔ والد بیمار ہوئے تو اس نے نبی پاکؐ کی خدمت میں بھیج کر عرض کیا اور معلوم کیا (کہ کیا وہ شوہر کی اجازت کے بغیر والد کی تیمارداری کر سکے)۔ آپؐ نے فرمایا اپنے شوہر کی بات مانو۔ چنانچہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا، پھر اس نے نبی پاکؐ کے پاس آدمی بھیج کر معلوم کیا آپؐ نے فرمایا شوہر کی اطاعت کرو۔ پھر نبی پاکؐ نے اس عورت کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ اللہ نے تمہارے شوہر کی اطاعت کی وجہ سے تمہارے والد کی مغفرت کر دی ہے۔" (مجمع جلد۔۔۔ صفحہ ۱۳۸)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول پاکؐ نے فرمایا

"اگر میں کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے۔" (ترمذی جلد ا صفحہ ۱۳۹)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

"جب شوہر اپنی عورت کو بستر پر بلائے اور عورت نہ جائے تو فرشتے اس عورت پر صبح ہونے تک لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔" (بخاری جلد ۲ صفحہ ۲۸۲)

حضرت طلقؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا

"مرد جب اپنی ضرورت سے عورت کو بلائے تو عورت فوراً آجائے چاہے وہ تنور پر کیوں نہ بیٹھی ہو۔" (ترمذی)

حضرت زید بن ارقمؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

"عورت اللہ کا حق ادا کرنے والی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ شوہر کا پورا حق ادا نہ کرے۔ اگر شوہر اسے بلائے اور وہ اونٹ کی پالان پر ہو تب بھی وہ انکار نہیں کر سکتی۔" (طبرانی، ترغیب)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

"کسی عورت کے لیے درست نہیں کہ وہ شوہر کی موجودگی میں روزہ (نفلی) رکھے ہاں مگر اس کی اجازت سے۔ اگر اس نے (بلا اجازت) روزہ رکھا تو بھوکی پیاسی رہی اور قبول نہ کیا جائے گا۔" (مجمع۔۔۔ صفحہ ۳۱۰)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

''جب عورت اپنے شوہر سے (غصہ کی وجہ سے) الگ بستر پر رات گزارے تو اس پر فرشتے لعنت بھیجتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ شوہر کے پاس آ جائے۔'' (بخاری۔مسلم)

شوہر سے طلاق مانگنے پر جنت حرام

حضرت ثوبانؓ سے مروی ہے کہ نبی پاکؐ نے فرمایا

''جو عورت اپنے شوہر سے بلا کسی ضرورت شدیدہ و پریشانی کے طلاق مانگے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔'' (ابن ماجہ۔ابوداؤد۔ترمذی)

خلع کا مطالبہ کرنے والی عورت منافق ہے

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا

''شوہر سے علیحدگی چاہنے والی خلع کا مطالبہ کرنے والی عورت منافق ہے۔'' (مشکوۃ۔نسائی)

شوہر کی بلا اجازت نکلنے پر لعنت

حضرت [illegible] سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

''جب عورت شوہر کی ناراضگی میں نکلتی ہے تو آسمان کے سارے فرشتے اور جس جگہ سے گزرتی ہے ساری چیزیں سوائے انسان اور جن کے، وہ سب لعنت کرتے ہیں۔'' (طبرانی۔ترغیب)

کثرت سے بچے جننے والی

حضرت [illegible] سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

''خوبصورت بانجھ عورت کو چھوڑ دو اور کالی بچے جننے والی عورت کو اختیار کرو کہ تمہاری کثرت کی وجہ سے میں دیگر امتوں پر فخر کروں گا۔'' (بیہقی۔کنز۔جامع صغیر)

عورت کا گھر سے باہر نکلنا

حضرت [illegible] سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

''عورت پردہ ہے اور جب عورت گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے جھانکتا ہے۔ عورت کے لیے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ تقرب یہ ہے کہ وہ گھر کے کسی گوشے میں رہے۔'' (ترمذی۔ طبرانی۔ کنز)

ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

''عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں مگر شدید ضرورت کی بنیاد پر۔'' (طبرانی۔ کنز العمال)

بناؤ سنگھار کرنے والی عورتیں

میمونہ بنت سعدؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

''جو عورت اپنے شوہر کے علاوہ زینت و سنگھار کرکے چلی، قیامت کے دن سخت ظلمت و تاریکی میں ہے۔'' (ترمذی۔ جامع صغیر)

اشعریؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

''جب عورت عطر لگا کر لوگوں کے پاس سے گزرے تاکہ لوگ اس کی خوشبو سے محظوظ ہوں تو وہ عورت زانیہ ہے۔'' (کنز العمال)

عورت کے لیے دو ہی محفوظ مقام ہیں

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

''عورتوں کے لیے دو ہی مقامات قابل ستر ہیں۔ ایک شوہر کا گھر اور دوسرا قبر۔''

عورت کے لیے امارت و دنیاوی عہدہ

حضرت ابی بکرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

''وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے اپنا حاکم اور والی عورت کو بنایا۔''

عورتیں اور جہنم

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

''ننانوے عورتوں میں سے ایک جنت میں جائے گی اور باقی جہنم میں۔'' (ابو الشیخ۔ کنز العمال)

اسامہ بن زید سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

''میں نے اپنے بعد عورتوں کے فتنہ سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں چھوڑا جو مردوں کے لیے تکلیف دہ ہو۔''

عورت اور نحوست

ابن عمر سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

''نحوست تین چیزوں میں ہے۔ عورت گھر اور گھوڑے میں۔''

عورت کو مارنا پیٹنا

اشعث بن قیس سے روایت ہے۔

''حضرت عمر سے دوستی کے روز جب رات ڈھلنے لگی تو آپ نے کھڑے ہو کر اپنی عورت کو مارا۔ میں ان دونوں کے بیچ آ گیا۔ جب وہ اپنے بستر پر جانے لگے تو مجھ سے کہا، یاد رکھ! نبیؐ فرماتے تھے کہ مرد سے اپنی بیوی کو مارنے کے متعلق سوال نہ کیا جائے گا۔'' (ابن ماجہ)

عورت اور ہمارے شاعرِ مشرق

اسی سلسلے میں لگے ہاتھوں شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال کے تصورات کا تذکرہ اور جائزہ بھی ہو جائے کہ ان کا مرتبہ ہمارے ہاں حکیم الامت کا ہے اور انہیں دانائے راز بھی کہا جاتا ہے۔ مروجہ تعلیمی نصاب، نگارشات، مذہبی اور اردو اخبارات و جرائد میں انہیں آفاقی سطح کے جدید فکر کے حامل فلسفی، شاعر اور دانشور کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جبکہ ایران کے آرتھوڈاکس ملائی اور معکوس انقلاب میں ان کے جدید فکری جڑیں بھی تلاش کی جاتی ہیں۔ مگر افسوس کہ عورت کے معاملے میں علامہ کی فکر میں بھی ہمیں کم و بیش انہی تصورات سے واسطہ پڑتا ہے جن کا تجزیہ ہم مولانا مودودی کے حوالے سے اوپر کر چکے ہیں۔ کئی معاملات کے حوالے سے اقبال جہاں ہمیں اپنی شاعری اور نثر میں بہت جدید نظر آتے ہیں وہیں عورت کے معاملے میں وہ بھی کٹھ ملائیت اور فیوڈل سوچ کے اسیر دکھائی دیتے ہیں۔ انداز بیان سے علاوہ ہمیں ان کے اور مولانا مودودی اور بہشتی زیور کے مصنف مولوی اشرف علی تھانوی کے تصورات میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ اقبال اپنی شاعری میں عورت کے مقام کو بیان کرنے کے لئے امومت کا لفظ بار بار برتتے ہیں جو کہ عربی زبان کے لفظ اُم سے مشتق ہے۔ ہم اسے آسان لفظوں میں 'مادریت' یا 'مامتا' بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ عورت کو صرف ماں کے رشتے

میں محدود کر کے اس کی ایک فرد کے طور پر شناخت کو اوجھل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ وہ عورت کو یہ کہہ کر بہلانے کا جتن کرتے ہیں کہ یہ کوئی کمال کی بات نہیں کہ وہ علم و فضل میں ارسطو اور افلاطون بننے کی کوشش کرے بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ وہ ارسطو، افلاطون اور بوعلی سینا جیسی ہستیوں کو جنم دے کر اپنی آغوش میں ان کی تربیت کرے۔ بصد معذرت یہ سراسر عورت کو بے وقوف بنانے کی چال ہے۔ اسے سب شناخت عظمت کا جھانسہ دیکر اپنی انفرادی شناخت کو قربان کرنے کا سبق پڑھایا جا رہا ہے۔

از امومت ﷺ و تاب جوئے ما

موج و گرداب و حباب جوئے ما

تمدنی معاشرے کی تمام تر رونقیں اور سرگرمیاں جذبہ امومت کے طفیل ہیں۔

اقبال بھی عورت مرد کی مساوات کی بجائے مرد کی حاکمانہ اور عورت پر نگران ہونے کی حیثیت کے قائل ہیں۔

اک زندہ حقیقت میرے سینے میں ہے مستور

کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی

نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا

اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا سرد

معذرت ہمارے شاعر مشرق کا وژن جو دیکھتے ہی دیکھتے ان کے انتقال کے بعد تیزی سے شکست ہوتا چلا گیا۔ صاف دکھائی دیتا ہے کہ اقبال عورت کو ماں اور بیوی کے علاوہ اور کسی حیثیت میں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ ایک ایسی حیثیت جو سراسر مرد کی زیر نگرانی اور دست نگر ہو۔ یہاں نسوانیت زن کی اصطلاح تو اور بھی معنی خیز ہے جو سیدھا سیدھا عورت کو ایک جنسی وجود کے طور پر دیکھنے کی سوچ پر دلالت کرتا ہے۔

اقبال بھی عورت کو عام مردوں کی طرح محض ایک جسم سمجھتے ہیں جس میں اس کی سیکسویلیٹی جسے عرف عام میں عصمت کا نام دیا جاتا ہے، ان کے نزدیک ذہن کے مقابلے میں کوئی خاص مقام نہیں رکھتی۔ وہ ہر حالت میں عورت کو مستور رکھنے پر مُصر ہیں بھلے اس کے لئے اسے علم اور تعلیم سے محروم ہی کیوں نہ رکھنا پڑے۔ان کا یہ شعر

عصمتیں علم پر مقدم ہیں

آج بہتر ہے بیٹیاں نہ پڑھیں

اسی خواہش کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اقبال کی یہ صرف خواہش ہی نہیں تھی بلکہ انہوں نے اپنی بیٹی پر کالج کے دروازے بند کر کے اپنی سوچ کا عملی ثبوت بھی فراہم کیا۔ اور ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ وہ علم، تعلیم اور شعور سے محروم اسی عورت کی گود میں افلاطون اور بوعلی سینا جیسے نابغے پلنے کی توقع کرتے ہیں جبکہ ہم نہیں جانتے کہ افلاطون اور بوعلی سینا جیسے لوگوں کی عالم کے طور پر شہرت میں ان کی ماؤں کا ہاتھ تھا بھی اور ان کی لیاقت زمانے کا ثمر۔

صدیوں سے یہ سوچ رائج چلی آ رہی ہے کہ عورت کو اپنے کسی بھی معاملے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ یہ مرد کا حق ہے کہ وہ عورت کو بتائے کہ اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ الہامی کتب سمیت دنیا بھر کا اخلاقی لٹریچر اسی انداز فکر سے بھرا پڑا ہے۔ اقبال بھی اسی گھسی پٹی فیوڈل سوچ کے نمائندہ تھے۔ اسی لئے وہ نہ صرف خواتین کی علیحدہ یونیورسٹی کے حامی تھے بلکہ ان کے لئے مردوں سے مختلف نصاب بنانے کے حامی بھی۔ یعنی وہ عورتوں کو وہی نصاب پڑھانا چاہتے تھے جو ان کی مردانہ سوچ کے مطابق درست تھا۔ ایک جگہ تو انہوں نے اس کی مختصر تفصیل بھی بیان کر دی۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ

"عورتوں کو ابتداء میں ٹھیٹھ مذہبی تعلیم دی جائے اور اس کے بعد اسلامی تاریخ، علم تدبیر خانہ داری اور اصول حفظ صحت وغیرہ جیسے مضامین پڑھائے جائیں جن سے وہ اپنے فطری فرائض زوجیت و امومت خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔"

یعنی ان کی سوچ قوم کو عورت کو زوجیت اور امومت (یعنی بیوی اور ماں) کے دائرے سے باہر دیکھنے کے لئے بالکل تیار نہیں۔ لیکن یہ باتیں شاید وہ صرف قوم پر لاگو کرنا چاہتے تھے جبکہ اپنے لئے انہوں نے تین خواتین کو حلقہ زوجیت میں لینے کے ساتھ ساتھ غیر خواتین کے ساتھ عشق اور محبت کے تمام ممکنہ راستے کھلے رکھے۔ ان میں دو خواتین کا نام تو کتابوں میں محفوظ ہو چکا۔ ایک عطیہ فیضی اور دوسری ایما ویگے ناسٹ جو اقبال کی جرمن زبان کی استاد تھیں۔ یہ خاتون اقبال سے دو برس چھوٹی تھیں۔ یاد رہے کہ اقبال کی عمر اس وقت تیس برس تھی۔ یعنی وہ کوئی ناسمجھ اور لاابالی نوجوان نہیں تھے بلکہ شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے، تب تک ان کی شاعری اور نظریات بھی خاصے معروف ہو چکے تھے۔ انہیں اس وقت نہ تو اپنے تجویز کردہ جذبہ امومت کا احساس تھا اور نہ ہی مخلوط محفلوں پہ کوئی اعتراض۔ شاید اپنی ذات کے لئے ان کے پیمانے اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے تجویز کردہ پیمانوں سے بالکل مختلف تھے۔

اقبال زندگی کے آخری سانس تک ان دونوں خواتین کے ساتھ جذباتی طور پر بندھے رہے۔ اقبال کو ایما ویگے ناسٹ سے خاص التفات تھا جس کا سبب ان کی بے پایاں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ان کا مشرقی رویہ بھی تھا۔ ایما کی آنکھیں گہری نیلی، سیاہ بال اور قد سات فٹ پانچ انچ تھا اور اس پر غیر معمولی ذہانت اور سلیقہ گویا سونے پر سہاگے والی بات تھی۔ ممکن تھا وہ اقبال کی دوسری بیوی بن جاتیں مگر اقبال اور ایما کی خواہش کے باوجود ان کے خاندان نے انہیں ہندوستان جانے کی اجازت نہیں دی اور یوں اقبال کو نارسائی کا زخم سہنا پڑا۔ نارسائی کا یہ دکھ ایما ویگے ناسٹ کے نام ان کے خطوط میں صاف دیکھا جا سکتا ہے۔

"افسوس کہ جرمن زبان سے میری محدود واقفیت ہمارے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل ہے۔ اگر میرے خط مختصر ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میرے پاس لکھنے کو کچھ نہیں، بلکہ یہ کہ میرا ذریعہ اظہار ناقص ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اپنی ٹوٹی پھوٹی جرمن سے آپ کو تکلیف پہنچاؤں، لیکن یہ رکاوٹ آپ کے لیے نہیں، چنانچہ مجھے آپ سے مکمل اظہار کی امید ہے۔

Wenn meine briefe kurz sind, es ist nicht weil ich nichts zu schreiben habe sondern fehlt mir den genauen ausdruck fur meine gedanken. Auch wunsche Ich nicht mit meinem schlechtes Deutsch Sie zu beleidigen. Aber diese hindernis existiert nicht bei Ihnen, und Ich kann hoffen alles von Ihnen zu horen. ?? It is unhappy that the speed of my little known ship with the language like a wa between you and me is. If my letters are short, it is not because I have nothing to write, but I lack the exact expression for my thoughts. Also I do not want to offend you with my bad German. But this hindrance does not exist for you and hope to hear from you al

ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں اس وقت تک آپ کو خط نہیں لکھوں گا جب تک آپ مجھے وہ خط نہیں بھیجتے جو آپ نے پھاڑ ڈالا ہے۔"

پھر لکھا

"میری شدید خواہش ہے کہ میں دوبارہ آپ سے بات کر سکوں اور آپ کو دیکھ سکوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا کروں۔"

"آپ سے دوستی کرنے والے کے لیے ممکن نہیں کہ وہ آپ کے بغیر جی سکے۔"

"کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں تلون شعار ہوں؟ یہ بالکل ناممکن ہے۔۔۔ میں ہمیشہ آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں اور میرا دل ہمیشہ بڑے خوبصورت خیالوں سے معمور رہتا ہے۔ ایک شرارے سے شعلہ اٹھتا ہے اور ایک شعلے سے ایک بڑا الاؤ روشن ہو جاتا ہے، لیکن آپ سرد مہر ہیں، نفرت شعار ہیں۔ جو جی میں آئے، آپ کیجیے، میں بالکل چپ رہوں گا اور ہمیشہ صابر و شاکر رہوں گا۔"

"میں اگلے برس یورپ واپس آنے اور آپ سے ملنے کی امید رکھتا ہوں۔ مت بھولیے گا کہ اگرچہ کئی ملک اور سمندر ہمیں ایک دوسرے سے جدا کریں گے، پھر بھی ہمارے

درمیان ایک غیر مرئی رشتہ قائم رہے گا۔ میرے خیالات ایک مقناطیسی قوت کے ساتھ
آپ کی طرف دوڑیں گے اور اس بندھن کو مضبوط بنائیں گے۔"

"کچھ عرصہ بعد جب میرے پاس کچھ رقم جمع ہو جائے گی تو میں یورپ میں اپنا گھر
بناؤں گا۔ یہ میرا خواب ہے اور مجھے یقین ہے کہ سب پورا ہوگا۔"

اب ایک خط عطیہ فیضی کے نام جس میں وہ والدین کی طرف سے زبردستی کی جانے والی پہلی شادی کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔

"وہ مجھ پر میری بیوی مسلط کر رہے ہیں۔ مَیں نے اپنے والد صاحب کو لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی ٹھہرانے کا کوئی حق نہ تھا، بالخصوص جبکہ مَیں نے ایسے کسی حبالۂ عقد میں داخل ہونے سے دوٹوک انکار کر دیا تھا۔ مَیں اُس کا نان نفقہ برداشت کرنے کو تو ضرور آمادہ ہوں، لیکن اسے اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی اجیرن بنانے کے لیے قطعی تیار نہیں ہوں۔ ایک انسان ہونے کے ناطے میرا بھی خوشی پر حق ہے۔ اگر سوسائٹی یا نیچر مجھے اس سے محروم کرتی ہے تو مَیں دونوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہوں۔ اس مصیبت کا واحد علاج یہی ہے کہ مَیں اس بدنصیب ملک کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ جاؤں یا پھر شراب نوشی میں پناہ لوں کہ خودکشی کا مرحلہ آسان ہو جائے۔"

یہ خطوط نقل کرنے کا مقصد قطعاً اقبال کی کردارکشی ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ اقبال کی عشق و محبت میں وارفتگی، شدت اور بے باکی کے الرغم مزاج کی ناموافقت کی بنا پر اپنی پہلی منکوحہ بیوی سے نفرت یا بیزاری کا کھلا اظہار انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔ جبکہ ان کے نظریاتی تصورات بالکل یوٹوپیائی اور کسی زاہد خشک جیسے تھے جن میں عشق و محبت کے جذبے کی کہیں رسائی دکھائی نہیں پڑتی۔ یہ نظریات سراسر خیالی تھے کیونکہ وہ خود عملی طور پر عمر بھر ان کی الٹ سمت میں چلتے رہے۔ اقبال اپنی عملی زندگی میں ایک زندہ دل انسان تھے۔ وہ یورپ میں مخلوط محفلوں سے جی بھر کر لطف اندوز ہوتے تھے اور بقول عطیہ فیضی دوستوں پر فی البدیہہ ہزلیہ اشعار بھی کہتے تھے مگر انہیں لکھنے سے منع کر دیتے تھے۔ انہوں

کرتے تھے۔ گویا اقبال نہیں چاہتے تھے کہ عوام الناس کے سامنے ان کی زندگی کے وہ معاملات آئیں جنہیں اگرچہ وہ غلط جانتے تھے مگر اپنے فطری تقاضوں کے مطابق لطف کی خاطر کرنے پر بھی مجبور تھے۔ یہ ایک مبلغ کا عام مسئلہ ہے کہ وہ لوگوں کو ایسے بھاشن دینے کا عادی ہوتا ہے جن پر عمل پیرا ہونا کم وبیش ناممکن ہوتا ہے۔ اور یہی بات ان لوگوں کے فلسفۂ حیات کی ناکامی کی وجہ بن جایا کرتی ہے۔ غور کریں تو اقبال ہمیں اس ناکامی کی زندہ مثال دکھائی دیں گے۔ اسی لیے اقبال نے خود اعتراف کیا کہ وہ کردار کے نہیں بلکہ صرف گفتار کے غازی ہیں۔

اقبال بڑا اُپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

اقبال کی زندگی کا جائزہ لیں تو ان کی شخصیت جذبات اور عقل کے منطقوں میں تقسیم دکھائی دیتی ہے۔ عورت کے معاملے میں عقلی طور پر زاہد خشک اور جذباتی سطح پر ایسے رومانی کہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ خواتین سے راہ و رسم۔ اوپر سے تین تین شادیوں کا معاملہ مستزاد۔ یہ ہمارے اس قومی شاعر کا المیہ ہے جن کا ہماری منافق مڈل کلاس نے ان کی عملی زندگی کے بالکل برعکس خیالات پر مبنی شاعری کی مدد سے اقبال کا ایک غیر حقیقی امیج بنایا اور اپنی تحریروں اور تقریروں سے ایسا پراپیگنڈا کیا کہ اقبال کی زندگی سے حقیقی عورت کا وجود ایک گناہ سمجھ کر خارج کر دیا۔ عوام کے سامنے اقبال کو ایک انسان کی بجائے الوہی شخصیت بنا کر پیش کیا، ایک ایسی شخصیت جس کا اتباع حقیقت کی دنیا میں ممکن ہی نہیں تھا۔ اس لیے یہ کہنا مناسب لگتا ہے کہ سرسید اور اکبر الہ آبادی کی طرح اقبال کے رجعت پرستانہ تصورات نے پاکستانی عورت کی بطور انسان ترقی کو زک پہنچائی۔

اقبال اور کثرتِ ازدواج

اقبال روایتی سوچ کے حامل ایک ایسے مسلمان تھے جو ایک کے بعد دوسری شادی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں عورت وہی کردار نبھانے کے لیے پیدا کی گئی ہے، ایک

بیوی کا اور دوسرا ماں کا۔ ان کی پہلی شادی کریم بی بی سے ہوئی جو انتہائی ناپسندیدگی کے ساتھ تقریباً سولہ برس تک گھسٹتی رہی، پھر بالآخر انہوں نے تنگ آ کر انہیں طلاق دے دی۔ ان خاتون سے اقبال کے ایک بیٹا آفتاب اقبال اور بیٹی معراج پیدا ہوئے، جن کے بارے میں علامہ کے اکثر مداحین بھی بالکل بے خبر ہیں۔ یہ دونوں بچے باپ کی شفقت پدری سے آخر دم تک محروم رہے۔

ہم اوپر عطیہ فیضی کا تذکرہ کر آئے ہیں جن پر اقبال پوری طرح سے فریفتہ تھے مگر انہوں نے اقبال کو عاشقانہ دوستی کے دائرے سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ جب اقبال نے انہیں اپنی پہلی بیوی کے حوالے سے شکایت سے بھرپور خطوط لکھے تو ان کو یہی امید تھی کہ وہ ان کی اذیت بھری زندگی پر ترس کھاتے ہوئے ان سے شادی کر لیں گی مگر انہوں نے ان دوستوں سے نفسیاتی مدد مانگنے کا مشورہ دے ڈالا جو اقبال کے لیے شدید مایوسی کا باعث بنا۔

علامہ کے لیے یہ زمانہ شدید جذباتی بحران کا زمانہ تھا سو انہوں نے اس فرسٹریشن میں بلا سوچے سمجھے سردار بیگم سے نکاح کر لیا۔ ابھی رخصتی بھی نہیں ہوئی تھی کہ انہیں چند خطوط موصول ہوئے جن میں سردار بیگم کی کردار کشی کی گئی تھی۔ علامہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ انہیں فوراً طلاق بھجوا دی اور مزید جلد بازی کرتے ہوئے اپنی بہن کے کہنے پر ایک ایسی خاتون سے شادی کر لی جس کے بارے میں انہیں شب زفاف گزارنے کے اگلے دن پتہ چلا کہ وہ تو خاصی کم شکل ہیں۔ یہ ایک اور صدمہ تھا جو علامہ کو سہنا پڑا۔ اسی دوران انہیں معلوم ہوا کہ ان کی دوسری منکوحہ کے بارے میں جو خطوط لکھے گئے وہ بالکل جھوٹے تھے اور ان کی اپنی بہن جو کہ ان کی پہلی بیوی کی ہم نام تھیں، نے ان کی اپنی بیٹی معراج اقبال سے لکھوائے تھے۔

سردار بیگم کی خوبصورتی قابل تعریف تھی سو علامہ کو اس بات کا شدید تاسف ہوا کہ انہوں نے بنا کسی چھان بین انہیں طلاق کیوں دے دی۔ ادھر سردار بیگم نے بھی خط لکھ ڈالا کہ وہ ابھی تک ان کی منتظر بیٹھی ہیں۔ دوستوں سے مشورہ کیا تو پتہ چلا کہ حلالہ ناگزیر ہے۔ پھر ایک مولوی صاحب سے فتویٰ لیا گیا جو علامہ کی خواہش کے عین مطابق تھا کہ چونکہ علامہ صاحب نے سردار بیگم سے شب زفاف نہیں

نافذ تھی سو ان کے معاملے میں حلالہ کا شرعی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ مگر اقبال نے اپنے دل کی تسلی کے لیے ان سے دوسری بار نکاح کرنا مناسب سمجھا۔ اس طرح یہ ان کی چوتھی شادی تھی۔ اسی دوران جب وہ دو بیویوں کی ذمہ داری نبھا رہے تھے، ان کی پہلی بیوی بھی سیالکوٹ سے بچوں کو لے کر آ گئیں اور یوں انہیں تعدد ازدواج کا تلخ مزا سہنا پڑا۔

سردار بیگم اپنی خوبصورتی کی بنا پر علامہ کی سب سے چہیتی بیگم تھیں جن کے بطن سے جاوید اقبال اور منیرہ پیدا ہوئے مگر اقبال کے تساہل اور خانگی ذمہ داریوں کے بوجھ نے اس رشتے کو بھی بہت جلد شکووں میں بدل دیا۔ جاوید اقبال اپنی سوانح ''اپنا گریباں چاک'' میں اپنی والدہ کی علامہ سے برہمی اور بیزاری کا تذکرہ یوں کرتے ہیں

''میری والدہ کا اصرار تھا کہ والد باقاعدگی سے وکالت کریں کیونکہ گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ نیز کرایہ کی کوٹھی میں رہنے کی بجائے اپنا گھر بنوائیں۔ یہ منظر اب تک میری نگاہوں کے سامنے ہے کہ والدہ میرے والد کے ذاتی کمرے میں کھڑی انہیں کوس رہی ہیں اور روتے روتے کہہ رہی ہیں کہ میں اس گھر میں لونڈی کی طرح کام کرتی ہوں اور ساتھ ہی پیسے بچانے کی کوشش میں بھی لگی رہتی ہوں۔ دوسری طرف آپ ہیں کہ بجائے کیسوں سے پیچھا چھڑا کر بستر پر دراز شعر لکھتے رہتے ہیں اور جواب میں میرے والد لیٹے ہوئے بغیر کچھ بولے ہوئے کھسیانی ہنسی ہنس رہے ہیں۔''

یہ ہمارے دانائے راز فلسفی کی صورتحال تھی جو مذہب کی روشنی میں عورت اور مرد کے تعلق کے بارے میں پورے فلسفیانہ یقین کے ساتھ نہ صرف ایک واضح موقف رکھتے تھے بلکہ یورپ میں رائج یک زوجی کو اپنے شذرات میں تمسخر کا نشانہ بھی بناتے تھے مگر اپنی خانگی زندگی میں مکمل طور پر ایک ناکام شوہر ثابت ہوئے۔ حالت یہ تھی کہ پہلی بیوی کریم بی بی کی والدہ اپنی بیٹی کو لاہور سے یہ کہہ کر واپس لے گئیں کہ اقبال ایک نہایت غیر ذمہ دار داماد ہیں۔ جبکہ ان کی چہیتی بیوی نے بھی نہ صرف انہیں بیکار اور غیر ذمہ دار ہونے کا طعنہ دیا بلکہ یہ شکوہ بھی کیا کہ اقبال کے گھر میں ان کی حیثیت ایک باندی سے

زیادہ کچھ نہیں۔ اور جواب میں علامہ کے پاس ایک کھسیانی ہنسی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ممکن ہے اقبال کا عورت کے بارے میں مذہبی تصور وہی ہو جو اشرف علی تھانوی نے احادیث اور ہندوستان کی زوال زدہ تہذیبی روایات کے حوالے سے اپنی کتاب بہشتی زیور میں پیش کیا تھا۔

اشرف علی تھانوی، جاگیردارانہ سوچ کی کلاسیکل مثال

بہشتی زیور ایک ایسی تصنیف ہے جو ایک وقت تھا کہ ہمارے ہاں کی مردانہ سوچ کو بہت مرغوب تھی اور آج بھی مرغوب ہے۔ یہ کتاب آج بھی مذہبی کتب کے ہر سٹال پہ عام دستیاب ہے مگر اب اس کی حیثیت اس دور کی مروجہ سوچ کے ریکارڈ سے زیادہ نہیں رہی۔ ورنہ تو ایک زمانہ وہ بھی گزرا جب یہ مسلمان لڑکی کے جہیز کا لازمی حصہ ہوتی تھی۔ اس کتاب کے مصنف کی سوچ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ مرد پیدائشی آقا ہے اور عورت پیدائشی غلام۔ بس اسے یہ خوف دامنگیر ہے کہ کہیں عورت جدید تعلیم کے نتیجے میں اپنی ذات کی اہمیت سے آگاہ ہو کر مرد کی غلامی سے انکار نہ کر دے۔ غالباً مردوں کے اسی خوف نے مولانا سے یہ کتاب تصنیف کروائی۔

اشرف علی تھانوی کی دس حصوں پر مشتمل کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ آزادی صرف مرد کا حصہ ہے اور اس آزادی کا مطلب یہ ہے کہ وہ جتنی بازاری عورتوں سے تعلق رکھے یا اپنی کمائی کو جیسے چاہے خرچ کرے، بیوی کو روک ٹوک تو دور کی بات پوچھنے کا حق بھی نہیں ہے۔ اگر مرد

کام ہے کہ منت سماجت کرکے اس کا غصہ ٹھنڈا کرے۔ بھلے عورت کا کوئی قصور نہ بھی ہو وہ پھر بھی شوہر سے معافی مانگے۔ مولانا خواتین کے لیے صرف دینی تعلیم کے حق میں تھے اور وہ بھی ایسی جس کی ان جیسے علماء اجازت دیں۔ ان کے تئیں عورتوں کو مکمل قرآن پڑھنے سے گریز کرنا چاہئے جیسے کہ سورۃ یوسف۔ ان کے خیال میں یہ ایک عشق و عاشقی کا قصہ ہے جس کے پڑھنے سے عورتوں کے اخلاق خراب ہو سکتے ہیں۔

نہیں کسی صورت عورت کا گھر سے نکلنا گوارا نہیں۔ بلکہ ان کے نزدیک دس بارہ برس کے لڑکوں کا گھر میں داخل ہونا بھی نامناسب ہے۔ یوں لگتا ہے وہ شادی کے بعد عورت کو مکمل طور پر شوہر کی قید و غلامی میں رکھنے پر بضد ہیں اور اسے بیرونی دنیا سے کاٹ کر اس قدر سادہ معصوم اور جاہل رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ مرد کی جانب سے ہونے والے ظلم اور زیادتی کو بھی جنت کمانے کا ذریعہ سمجھے اور اس کی شکر گزار رہے۔ ان کی کتاب سے اس حدیث کا حوالہ زبان زد خاص و عام ہے جس میں شوہر کی جنسی خواہش سے انکار پر بیوی کو رات بھر فرشتوں کی جانب سے لعنت ملامت کی نوید سنائی گئی ہے۔

یہ مولانا کا نظریہ اسلام تھا جس کی برصغیر کے مسلمان مردوں کی اکثریت گرویدہ تھی۔ خود عورتیں بھی یہی سمجھتی تھیں کہ خدا ان سے مرد کی غلامی کروا کے خوش ہوتا ہے اور اللہ اور اللہ کے رسول کا یہی حکم ہے جو مولانا اشرف علی تھانوی اپنی کتاب میں بیان فرما رہے ہیں۔ جبکہ مخالف فرقے اس کتاب کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس حوالے سے سید باقر علی شاہ کی تصنیف ''بہشتی زیور کا خود ساختہ اسلام'' مارکیٹ میں دستیاب ہے جس میں ان کے خیالات کو شریعت کے خلاف ثابت کیا گیا ہے۔

مولانا کی سوچ چونکہ جاگیردارانہ مردانگی کے جذبے سے لبریز تھی، اسی بنا پر وہ جنسی لطف کو بھی یکطرفہ طور پر مرد کا حق ہی مانتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب میں مردانہ طاقت کی بحالی کے کئی مجرب نسخے بھی پیش فرمائے ہیں جن میں سوزاک اور آتشک کا علاج بھی بتایا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر بہشتی زیور سے ایک نسخہ پیش خدمت ہے۔

''طلا مقوی اعصاب اور عضو میں درازی اور فربہی لانے والا۔

چیونٹے بڑے بڑے سات عدد قبرستان سے لائیں ایک ایک کو مار کر فوراً دو تولہ روغن
چنبیلی میں ڈالتے جائیں پھر شیشی میں کر کے کاگ مضبوط لگا کر ایک دن رات بکری
کی مینگنیوں میں دفن کر دیں پھر نکال کر خوب رگڑیں کہ چیونٹے تیل میں حل ہو جائیں
پھر نیم گرم ملیں۔ ترکیب ملنے کی یہ ہے کہ پہلے عضو کو ایک موٹے کپڑے سے خوب ملیں
جب سرخی پیدا ہو جائے فوراً یہ تیل مل کر چھوڑ دیں پندرہ بیس دن ایسا ہی کریں۔"

ان پڑھ آدمی کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بات کی تصدیق کرنے کی نہ تو صلاحیت رکھتا ہے اور نہ ہی جرأت۔ اور خاص طور پر کوئی ایسی بات جو اللہ اور رسول کا نام لے کر بیان کی جا رہی ہو۔ وہ تو بس اپنی خدمت نفسیت کی بنا پر مذہب کے نام پر آمنا وصدقنا کہہ کر اپنی گردن بڑے سے بڑے ظالم کے سامنے جھکا دیتا ہے۔ دوسرے مذہبی علما کی طرح مولانا اشرف علی تھانوی بھی اس راز سے خوب واقف تھے۔ آج بھی بہت سے لوگ بہشتی زیور کو قرآن اور حدیث کی طرح قابل احترام مانتے ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی کی
تہذیبِ جدید سے دشمنی

اکبر الہ آبادی اس دور میں پیدا ہوئے جب مسلمان انگریز کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد شدید احساسِ کمتری اور محرومی کا شکار تھے۔ اس صورتحال نے اجتماعی طور پر مسلمانوں میں ایک ایسی ردعمل کی ذہنیت پیدا کر دی تھی کہ وہ فاتحین کی ہر قدر کو رد کرنے پر تل گئے تھے۔ اکبر الہ آبادی اس رویے کی کلاسیکل مثال ہیں۔

ان کی شہرت دو حیثیت سے ہے۔ ایک تو طنزیہ شاعری اور دوسرا انگریزی تہذیب سے نفرت۔ ہاں یہ عجب بات ہے کہ جس تہذیب سے انہیں نفرت تھی اس کے نمائندہ حکمرانوں سے انہیں خان بہادر کا خطاب وصول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوا۔ بلکہ الٹا اس بات کا قلق تھا کہ ان کے ہم عصر سید صاحب کو سر کا خطاب کیوں ملا۔ وہ خود کو سرسید کے پائے کا نابغہ سمجھتے تھے مگر ان جیسی اہمیت نہ ملنے پر غصہ اور جلن محسوس کرتے تھے۔ اسی جلن نے ان سے سرسید کے خلاف مضامین لکھوائے اور ادب کے پائے سے گری ہوئی سوقیانہ طنزیہ شاعری بھی لکھوائی۔ سرسید چونکہ انگریز سرکار سے غیر مشروط وفاداری رکھتے

تھے سو اکبر نے نہ صرف اپنی شاعری میں سرسید کو طنز اور طعن کا نشانہ بنایا بلکہ ان کے ساتھ ذاتی دشمنی کو انگریزی تہذیب تک پھیلا دیا۔ محققین کا یک خیال یہ بھی ہے کہ یہ مضامین اور انگریزی تہذیب پر طنزیہ شاعری سرسید کی قدر دانی سے جلن اور ان کے مقابلے میں زیادہ شہرت کے حصول کی خواہش کا نتیجہ تھے۔ تعلیم یافتہ عورت سے تو انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ اور اس بارے میں اظہار کرتے وقت وہ مسخرہ بازی کی حدوں کو چھونے لگتے تھے۔ بلکہ خود ان کا انداز بیان ان کی سیکسوئل فرسٹریشن کا صریح شاہد بن جاتا ہے اور پڑھنے والا سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کیا مشرقی تہذیب کے دل دادہ کو یہ بیان زیب دیتا ہے۔ موصوف کی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو

حرم میں مسلموں کے، رات انگلش لیڈیاں آئیں
پئے تکریم مہماں بن سنور کے بیبیاں آئیں
طریق مغربی سے میل آیا، کرسیاں آئیں
دلوں میں ولولے اٹھے، ہوس میں گرمیاں آئیں
امنگیں طبع میں ہیں، شوقِ آزادی کا بلوا ہے
کھلیں گے گل تو دیکھو گے، ابھی کلیوں کا جلوہ ہے

در حقیقت تو وہ انگریزی تہذیب کی بے حیائی اجاگر کر رہے ہیں مگر ان کے اپنے اندر سے چور ٹھرکی شوقین مزاج صاف جھانکتا دکھائی دے رہا ہے جو ہوس میں گرمیاں آنے اور کلیوں کے پھولوں میں بدلنے جیسے عمل دیکھنے کا شدت سے منتظر ہے۔

یہ لکھتے ہیں

گھر سے جب پڑھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں
دل کش و آزاد و خوش رو، ساختہ پرداختہ
یہ تو کیا معلوم کیا موقعے عمل کے ہوں گے پیش
ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بے ساختہ

یہاں کنواری لڑکیوں کا تذکرہ بھی ان کی بیمار نفسیات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ آگے چل کر تو وہ بالکل پورنوگرافی پر اتر آتے ہیں۔ کہتے ہیں

ممکن نہیں اے مس تیرا نوٹس نہ لیا جائے
کال ایسے پری زاد ہوں اور کِس نہ لیا جائے

یہ شعر بظاہر ایک جدید تعلیم یافتہ لڑکی پر طنز ہے مگر اس کے پردے میں اکبر الہ آبادی کی جنسی فرسٹریشن اچھل اچھل کر باہر آ رہی ہے۔ اگلے دو اشعار بھی اسی کیفیت کے نمائندہ ہیں

تھی مرے پیش نظر وہ بت تہذیب پسند
کبھی وہسکی مجھے دیتی تھی کبھی شربت قند
رات مس سے جو کلیسا میں ہوا میں دوچار
ہائے وہ حسن، وہ، شوخی، وہ نزاکت، وہ ابھار

بوسہ یا کِس (kiss) ایسا لفظ ہے جس کا آج بھی ادب میں تذکرہ معیوب ہی سمجھا جاتا ہے چہ جائیکہ آج سے ڈیڑھ دو صدی پہلے اور وہ بھی مغربی تہذیب کو فحش کہنے والے مذہبی ادیبوں کے قلم سے۔ اکبر یہ لفظ مزے لے لے کے استعمال کرتے ہیں۔ اور پھر انگریزی تہذیب کی مخالفت میں وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ وہ عیسائیوں کی عبادت گاہ کلیسا کو ایک عشرت کدہ کے طور پر پیش کر رہے ہیں جہاں شراب کے ساتھ ساتھ نظر بازی بھی چل رہی ہے۔

تہذیب مغربی میں ہے بوسے تلک معاف
اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

یہ انگریز حکمرانوں کا حوصلہ تھا کہ ان کی تہذیب پر سرِ عام گند اچھالنے والے ادیب کو انہوں نے خان بہادر کا خطاب دیا۔ اکبر حسین تبدیلی کے خلاف ردِ عمل کا شکار ایک ناکام شخصیت کی کلاسیکل مثال ہیں جو یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ وقت کا پہیہ الٹا گھمانا ممکن نہیں۔ ہاں البتہ انہوں نے انگریزی تہذیب سے خوفزدہ ذہنوں کو متوجہ کر کے ہندوستانی عورت کی ترقی کا سفر ضرور مشکل بنایا۔ آج ڈیڑھ صدی بعد بھی

پیچھے کی جانب سفر کرنے کے خواہشمند اُن کا یہ قطعہ بڑے جوش سے گنگناتے ہیں:

بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کے پردے کو کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

شاید اکبرالٰہ آبادی جیسے نابغوں کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وقت انہیں ماضی کے کوڑے دان میں پھینک کر کتنا آگے نکل جائے گا۔ یہ ایک ایسی سوچ کا نوحہ ہے جو حالات کو سمجھنے کی دانش سے محروم ہوتی ہے۔ یہ وہ دانشور تھے جو اپنی محدود سوچ کی وجہ سے اپنی ناک سے ایک انچ آگے دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

مسلم یا مشرقی تہذیب

جب ہم مسلم تہذیب کی بات کرتے ہیں تو لامحالہ ہمیں اس کی ابتداء اُس وقت سے کرنی پڑے گی جب اسلامی ریاست کا ایک باقاعدہ ادارہ وجود میں آ چکا تھا۔ گو اسلامی ریاست نے عزت کی حفاظت کے نام پر مسلمان عورتوں کے لیے چادر اور چاردیواری کا پردہ لازمی قرار دے دیا تھا لیکن جنگ میں ہاتھ آنے والی عورتوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ نکاح کے سلسلے میں آزاد مسلم عورت کو دیئے گئے مرضی کے اظہار کے حق کی تمام تر تشہیر کے باوجود لونڈیوں کے حوالے سے معاملہ بالکل الٹ تھا۔ اس بارے میں امام ابن جریر طبری اور امام فخر الدین رازی کی تفاسیر سے بالترتیب دو بیانات قابلِ غور ہیں۔

''شریف عورتیں اپنے لباس میں لونڈیوں سے مشابہ بن کر گھر سے نہ نکلیں کہ ان کے چہرے اور سر کے بال کھلے ہوئے ہوں بلکہ انہیں چاہئے کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں تاکہ کوئی فاسق انہیں چھیڑنے کی جرأت نہ کرے۔''

''اللہ تعالیٰ نے آزاد عورتوں کو چادر اوڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ بدکار عورتیں نہیں ہیں۔ کیونکہ جو عورت اپنا چہرہ چھپائے

گی، حالانکہ چہرہ ستر میں داخل نہیں ہے، اس سے کوئی شخص یہ توقع نہیں کرسکتا کہ وہ اپنا ستر غیر کے سامنے کھولنے پر راضی ہوگی۔ اس طرح ہر شخص جان لے گا کہ یہ باپردہ عورتیں ہیں، ان سے زنا کی امید نہیں کی جاسکتی۔"

اوپر کوٹ کیے گئے دونوں بیانات اس بات کی تصدیق کے لیے کافی ہیں کہ پردہ (جو کہ عزت اور شرافت کی علامت تھا) صرف فاتح مسلمانوں کی عورتوں پر لاگو ہوتا تھا جبکہ لونڈیوں کے لیے بے پردہ رہنے کا حکم تھا۔ ان کے بارے میں تصور یہ تھا کہ ان کے لیے عورت ہونے کے باوجود عصمت وعفت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اسی حوالے سے ایک اور روائت قابلِ ذکر ہے۔

حضرت انس سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ہماری ایک لونڈی کو دیکھا جس نے سر پر اوڑھنی اوڑھی ہوئی تھی تو حضرت عمرؓ نے اسے مارا اور کہا کہ آزاد عورتوں کی مشابہت اختیار مت کرو۔

(کتاب الصلوٰۃ۔ مصنف ابن ابی شیبہ)

یہ سماجی ضابطہ دراصل عورتوں کو نہ صرف شریف اور بدکار کے دائروں میں تقسیم کرتا تھا بلکہ 'بدکار' عورتوں یعنی لونڈیوں کو شرافت کے دائرے میں داخل ہونے سے بھی روکتا تھا۔ شائد اس وقت کے شرعی ضابطوں کے مطابق وہ عورتیں نہیں بلکہ محض لوٹ کا مال تھیں جن کی ملکیت کا معاملہ خلیفۂ وقت یا سپہ سالار کا صوابدیدی اختیار تھا۔ انصاف کا تعلق صرف تقسیم سے تھا کہ جہاد میں حصہ لینے والوں کو مراعات کے طور پر کوئی نہ کوئی کنیز ضرور ملنی چاہئے تا کہ وہ بنا کسی سماجی معاہدے کی ذمہ داری اٹھائے بغیر اپنی جنسی ضرورت کر سکے۔ حضرت خالد بن ولید تو خوبصورت عورتوں کو اپنے تصرف میں لانے کے لیے خود کو خلیفۂ وقت کو مطلع کرنے کا مکلف بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس حوالے سے تاریخ میں مالک بن نویرہ کو قتل کرنے کے فوراً بعد اس کی خوبصورت بیوی ام تمیم کو اپنی زوجیت میں لینے کا معاملہ خاصہ معروف ہے۔ بعد میں یہ بات حضرت عمرؓ اور خالد بن ولیدؓ کے درمیان شدید نزع کا باعث بھی بنی اور امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بیچ بچاؤ کرانا پڑا کیونکہ یہ ایک ایسا نازک مرحلہ تھا جب خالدؓ منکرین زکوٰۃ کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے۔

عباسی دور میں لونڈی اور غلام سازی کی صنعت کا فروغ

آج کے زمانے میں متعہ جائز ہے یا حرام، اس سے قطع نظر پچھلے ابواب میں بیان کردہ روایات اس بات کی بہر حال دلیل ہیں کہ عرب سوسائٹی میں ایک خاص وقت تک مردوں کو جنسی تمتع کی حد سے زیادہ آزادی دستیاب تھی۔ خلافت کے ملوکیت میں بدل جانے کے بعد شائد عام آدمی کو یہ آزادی میسر نہیں رہی مگر شاہی دربار نے اپنے لیے مذہبی تاویلات کے زور پر جنسی آزادی بلکہ انتہائی حد تک عیاشی کے تمام راستے کھلے رکھے۔ عرب میں جنگوں میں ہاتھ آنے والی لونڈیوں کی رائج ثقافت نے عباسیوں کے دور میں ایک نیا روپ اختیار کیا۔ جب فتوحات کا سلسلہ قدرے مفقود ہونے کی وجہ سے دشمن کی عورتوں کی ترسیل رک گئی تو اپنے ہی سماج میں لونڈی اور غلام سازی کا کام شروع کر دیا گیا۔ اب ہوا یہ کہ شہروں اور قبائل سے معصوم بچے اغوا کر کے انہیں اپنے ڈھنگ سے پالنے اور تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے کا کام شروع ہوا۔ بچیوں کو علم و ادب کے ساتھ ساتھ رقص اور موسیقی کے ہنر سے آشنا کیا جاتا اور انھیں غمزہ و ادا اور حاضر جوابی کے ہتھیاروں سے لیس کیا جاتا۔ لڑکوں کو آختہ کر کے گھڑ سواری، تیر اندازی اور فنِ سپاہ گری میں مشاق بنایا جاتا۔ مردوں کی جنسی جبلت کو لبھانے اور انگیخت کرنے والی یہ لڑکیاں اور خواجہ سرا مخصوص منڈیوں میں منہ مانگے داموں فروخت ہوتے۔

خلیفہ ہارون رشید کا ایک واقعہ بڑی دلچسپی کا حامل ہے۔ موصوف کا دل ایک کافر ادا مغنیہ پر آ گیا تو اس کی چہیتی بیوی زبیدہ نے خلیفہ کی توجہ اس کی طرف سے ہٹانے کے لیے خود دس کنواری کنیزوں کا تحفہ پیش کیا تا کہ وہ ان کی صحبت میں مغنیہ کے عشق کو فراموش کر دے۔ (عرب اسلام از فلپ ہٹی۔ ترجمہ مطبوعہ دار المصنفین صفحہ 124) یاد رہے کہ یہی وہی زبیدہ خاتون ہیں جن کے بارے میں ہمارے نصاب میں بچوں کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ ان کے محل سے مسلسل قرآن مجید کی تلاوت کی آواز شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی صورت میں آتی رہتی تھی۔

خلیفہ المتوکل کے حرم میں چار ہزار کنیزیں تھی جن میں ایک بھی ایسی نہیں تھی جس سے وہ متمتع نہ ہوا ہو۔ سپین کے خلیفہ عبدالرحمان سوم کے حرم میں چھ ہزار تین سو کنیزیں تھیں۔ ہندوستان کے مغل حکمران،

راجہ اور نواب بھی اسی روایت پر عمل پیرا رہے۔شائد مسلم حکمرانوں کے ہاں طاقت اور عیاشی لازم و ملزوم تھے۔احساس جرم مٹانے یا پھر عوام کے سامنے ان کی عیاشیوں کو عین جائز ثابت کرنے کے لیے انھیں درباری علماء کی خدمات میسّر تھیں۔

لونڈیاں کے ستر کے بارے میں فقہی احکامات

مالکی فقہ کی معروف کتاب الشرح الصغیر کے مطابق ''لونڈی اجنبی مرد کا جتنا جسم دیکھ سکتی ہے، مرد اس سے بڑھ کر اس کا جسم دیکھ سکتا ہے۔وہ صرف اس کا چہرہ اور ہاتھ پاؤں دیکھ سکتی ہے، جبکہ غیر محرم مرد اس کی ناف سے گھٹنوں تک کے حصے کے علاوہ باقی سارا بدن دیکھ سکتا ہے۔'' (الجزء الاوّل، صفحہ 290)

حنفی فقیہہ امام جصاص کے مطابق اجنبی مرد کسی لونڈی کے بال، بازو، پنڈلی، سینہ اور پستان دیکھ سکتا ہے۔

اطلاق (مصنف عبدالرزاق) میں ''باب الرجل یکشف الامۃ حین یشتریہا'' میں صحابہ و تابعین کے متعدد آثار نقل کیئے گئے ہیں، جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

''سعید ابن المسیب نے کہا کہ لونڈی خریدنے کا ارادہ ہو تو شرم گاہ کے علاوہ اس کا سارا جسم دیکھا جا سکتا ہے۔''

''حضرت علیؑ سے لونڈی کی پنڈلی، پیٹ اور پیٹھ وغیرہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ کوئی مضائقہ نہیں۔لونڈی کی کوئی حرمت نہیں۔وہ (بازار میں) اسی لیے تو کھڑی ہے کہ ہم (دیکھ بھال کر) اس کا بھاؤ لگا سکیں۔''

عبداللہ بن عمرؓ کے تلامذہ بیان کرتے ہیں کہ جب انہیں کوئی لونڈی خریدنا ہوتی تو اس کی پیٹھ، پیٹ اور پنڈلیاں ننگی کر کے دیکھتے تھے۔اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر دیکھتے تھے اور سینے پر پستانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر دیکھتے تھے۔

مجاہد کا بیان ہے کہ ایک موقع پر ابن عمرؓ بازار میں آئے تو دیکھا کچھ تاجر لوگ ایک لونڈی کو خریدنے کے

لیے اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے آ کر اس کی پنڈلیاں ننگی کر کے دیکھیں، پستانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر اس کو جھنجھوڑا اور پھر خریدنے والوں سے کہا کہ خرید لو۔ یعنی اس میں کوئی نقص نہیں۔

مغلیہ دور کے آخری ایام کی ایک جھلک

مغل بادشاہ محمد شاہ کے دربار میں تین سو برہنہ کسبیاں ہر وقت محوِ رقص رہا کرتی تھیں۔ جب وہ تھکن سے چور ہو جاتیں تو مزید تین سو تازہ دم رقاصائیں ان کی جگہ لے لیتیں۔ شراب کا دور ہمہ وقت چلتا رہتا تھا۔ قلعہ کے اندر کا منظر یہ تھا ہتھیار بند دوشیزائیں پہرہ دیتیں جن کا زیرِ ناف حصہ بالکل عریاں ہوتا اور ناف سے اوپر تک زرق برق پوشاک سے آنکھوں کو خیرہ کرتا ہوا۔

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ عیش پرستی میں باپ سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت چار مربع میں پھیلے ہوئے زنانہ محل میں گزرتا جس میں ہزاروں خوبصورت لڑکیاں جمع کی گئی تھیں۔ وہ کئی کئی ماہ تک کسی مرد کا چہرہ نہیں دیکھتا تھا۔ مردانہ کھیلیں بھی وہ زنان خان میں ہی کھیلتا جس میں تقریباً مکمل عریاں عورتیں اس کے ساتھ شامل ہوتیں۔

شاہ عالم کی عیاشی کا یہ عالم تھا کہ اس کا حرم پانچ سو عورتوں پر مشتمل تھا۔ اس کا بیٹا شاہ عالم بھی عیاشی میں باپ سے کم نہیں تھا۔ صرف اٹھارہ برس کی عمر میں اس نے اپنے محل میں اٹھارہ بیویاں ڈال رکھی تھیں۔

یو پی کی فیوڈل تہذیب اور ہماری مشرقی روایات

مغلیہ دربار اپنی طاقت اور شان و شوکت کی بنا پر مسلمانوں کے لئے اعلیٰ تہذیبی معیار کی حیثیت رکھتا تھا۔ دربار سے کسی بھی حیثیت میں وابستگی عزت اور شان کی علامت تھی۔ بادشاہ کی طرح اشرافیہ بھی ہاتھ سے کام کرنے کو عار جانتے تھے۔ ان کی زندگی میں طوائف ناگزیر حیثیت کی حامل تھی۔ علم و ادب اور نشست و برخاست میں ان عورتوں کی تہذیبی پختگی اور پُرکاری کا یہ عالم تھا کہ اشراف اپنی اولادوں کو سماجی آداب اور ادبی ذوق سکھانے کے لیے فخریہ ان کے کوٹھوں پر بھیجا کرتے تھے۔ مگر سچ کہیں تو یہ ساری تہذیب ایک آرائشی جھنجنے جیسی تھی جس کا مغز محض چند بیکار کنکریاں ہوتی ہیں۔ مردوں کی زندگی کا

محور و مقصد بٹیر لڑانا، شطرنج یا چوسر کی بازی لگانا، بیکار کے شعر و سخن کے مشغلے میں وقت برباد کرنا اور طوائف کے کوٹھے پر داد عیش دینا تھا۔

عورت کے بارے میں مردوں کی سوچ شدید افراط و تفریط کا شکار تھی۔ ایک جانب یہ صورت کہ طوائف کی صورت میں عورت کے بنا زندگی کا تصور ناممکن اور دوسری جانب اسے نظر انداز کرنے کا یہ عالم کہ شاعری میں محبوب کو مذکر کے صیغے میں باندھا جاتا تھا۔

آپ اردو کے کلاسیکی اساتذہ کا تمام کلام پڑھ جائیے، مجال ہے اس میں کہیں مونث کے صیغے کی ایک جھلک بھی دکھائی دے جائے۔ اکثر شعرا جن کی شاعری میں تصوف کے تصورات کی فراوانی تھی بیانگ دہل امرد پرست تھے۔ میر کا معروف شعر اسی بات کا اعلانیہ اعتراف ہے کہ

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

ہاں البتہ ریختی کا معاملہ بالکل الگ نوعیت کا ہے جو بذاتِ خود اس ساری صورتحال کا ایک کج رو ردعمل معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایسی معاشرت جہاں گھر زنان خانے اور مردان خانے میں تقسیم تھے۔ شرفاء کی بیگمات سات پردوں میں بند تھیں۔ کہیں بھی آنے جانے کے لئے پردوں سے ڈھکی پالکیاں استعمال ہوتی تھیں۔ طوائفیں اپنے مربی مالکان کی تنہائی تک محدود تھیں۔ ایسی معاشرت میں مرد شعراء کا زنانہ لباس پہن کر مشاعروں میں شریک ہونا اور عورتوں کے محاورے میں اوچھی بازاری شاعری کرنا دراصل اس دور کی جنسی گھٹن اور کج روی کی واضح علامت تھا۔ اس دور میں فحش گو شعراء کی ایک طویل فہرست ملتی ہے جو اس دور کے معاشرے کی سیکسوئل فرسٹریشن کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ہمارے ہاں فحاشی کے خلاف دہائی دینے والے کم و بیش سبھی ادیب اور دانشور آج بھی یوپی کی اسی بیمار اور زوال زدہ فیوڈل تہذیب کو ہماری مشرقی اقدار کہہ کر آئیڈیلائز کرتے ہیں۔ کسی نے اس تہذیب کا حقیقی چہرہ دیکھنا ہو تو واجدہ تبسم کے افسانے پڑھ لے۔ اس حوالے سے عصمت چغتائی کا افسانہ 'لحاف' بھی خاصے کی چیز ہے۔

یہ مشرقی اقدار ہیں کیا؟

ہمارے ہاں مشرقی یا مذہبی اقدار کے خطرے میں ہونے کا بہت شور ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر یہ اقدار ہیں کیا۔ غور کیا جائے تو ہماری مشرقی اقدار کا مرکزی نقطہ جاگیردارانہ روایات کے عین مطابق مردانہ اور زنانہ دائروں کی ممکنہ حد تک علیحدگی ہے۔ سخت پردہ، شرم وحیا اور عصمت وعفت کی حفاظت کا تصور اسکے مددگار عناصر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بیوی کے لئے شوہر اور اولاد کے لئے باپ اور دوسرے بزرگوں کی بے چون و چرا اطاعت لازمی امر سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں حکمرانوں کی اطاعت بھی لازمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ استاد روحانی باپ کا درجہ رکھتا ہے جبکہ استانی کے لئے ایسا کوئی بیان نہیں ملتا کہ وہ روحانی حوالے سے کیا مقام رکھتی ہے۔

عورت کا کام باہر کی دنیا سے کٹ کر صرف گھرداری، بچوں کی تربیت اور شوہر کی خدمت گزاری ہے جبکہ مرد کے لئے پوری دنیا کھلی ہے جہاں وہ طوائف کے پاس جائے، محبوبہ کے ساتھ ڈیٹ مارے یا لونڈوں کو رکھے۔ مذہبی تعلیم بنیادی اہمیت رکھتی ہے مگر اس پر سوال اٹھانا گمراہی اور جان کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ جبکہ دنیاوی تعلیم کی حیثیت ثانوی ہے جس کا تعلق تربیت کی بجائے محض روزگار کی مجبوری سے جڑا ہے۔ موسیقی، مصوری، ڈرامہ اور فلم لہو ولعب کا درجہ رکھتے ہیں۔ لطیفہ گوئی اور بلند بانگ قہقہہ فحاشی اور بدتہذیبی کی علامت ہیں۔

آئیڈیل مشرقی عورت وہ ہے جسکا بال تک دکھائی نہ دے اور غیر مردوں تک اس کی آواز کی رسائی ممکن نہ ہو۔ مردوں کی نظریں مستور عورتوں کے سامنے بھی جھکی رہیں اور اگر غلطی سے اٹھ بھی جائیں تو دوسری بار اٹھنے کی نوبت نہ آئے۔ گھر میں لکھنوی تہذیب جیسے ادب آداب کا چلن ہو اور مقامی زبان کی بجائے نستعلیق اردو بولی جاتی ہو۔ میاں بیوی کے رشتے کو کسی گناہ کی طرح بچوں سے چھپایا جائے اور شوہر چوروں کی طرح رات کے اندھیرے میں بیوی کے بستر میں جائے۔ شوہر اولاد کی موجودگی میں بیوی کے نزدیک بیٹھنے سے گریز کرے مبادہ کہ بچوں کے اخلاق پر برا اثر پڑے۔ بچوں کو بلوغت کے باوجود جنسی معلومات سے دور رکھا جائے اور یہ معلومات اولاد کو انتہائی محتاط اور رازدارانہ انداز

میں حجلۂ عروسی میں جانے سے کچھ دیر پہلے فراہم کی جائیں۔

یہ ہے ہماری مشرقی تہذیب جس کا رونا روتے روتے ہمارے دائیں بازو کے دانشوروں اور کالم نگاروں کی ہچکی بندھ جاتی ہے۔ غور کیا جائے تو ان مشرقی اور مذہبی اقدار کا اس خطے سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے جہاں سے اسلام آیا تھا۔ یہ تو سراسر لکھنوی اشرافیہ کی زوال زدہ تہذیب کا تطہیر شدہ ایڈیشن ہیں جن کا نظارہ کسی پاکستانی فلم یا ٹی وی کے ڈرامے میں ہی ممکن ہو سکتا ہے یا پھر سوسائٹی سے کٹے ہوئے گنتی کے چند اُردو بولنے والے مہاجر گھرانوں میں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان جملہ تہذیبی اقدار کا پاکستان میں بسنے والے کسی کلچرل گروہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ نام نہاد مشرقی اور مذہبی اقدار سراسر مصنوعی، کتابی اور ناقابلِ عمل ہیں۔ یہ اقدار دراصل ہماری مڈل کلاس کا نمائشی بیانیہ ہیں جو اس نے اپنی جھوٹی نیک نامی کا تاثر قائم رکھنے کے لیے گھڑ رکھی ہیں۔

ہماری دیہاتی تہذیب

ہمارے ہاں آبادی کا ایک غالب حصہ دیہات میں رہتا ہے جن کی معیشت زراعت سے جڑی ہے۔ عورت زرعی معیشت کا انوٹ حصہ ہے۔ وہ نیک پروین بن کر گھر میں نہیں بیٹھ سکتی۔ اسے اُپلے بھی لگانے ہیں، چولہا جلانے کے لئے ایندھن بھی سر پہ اٹھا کر لانا ہے اور کنوئیں یا ٹیوب ویل سے پانی بھر کے بھی لانا ہے۔ گھر کے مردوں کے ساتھ مل کر کھیتوں میں پنیری بھی لگانی ہے اور پکی ہوئی فصل بھی کاٹنی اور سنبھالنی ہے۔ ان سارے کاموں کے لئے اسے کم وبیش مرد جیسا کردار ہی اپنانا پڑتا ہے سو وہ یہ کام خود کو برقعے یا چادر میں لپیٹ کر نہیں کر سکتی۔ اور پھر دیہاتی گھروں میں کموڈ اور سیوریج سسٹم بھی نہیں ہوتا، سو رفع حاجت کے لئے کھیتوں میں ہی جانا پڑتا ہے۔ یہ سلسلہ آج کا نہیں بلکہ صدیوں سے چلا آتا ہے۔

فحاشی کے خلاف زور شور سے بات کرنے والے دانشور اور مبلغ اپنی گفتگو اور تحریروں سے جو منظر پینٹ کرتے ہیں اس میں دیہاتی زندگی مکمل طور پہ غائب ہوتی ہے۔ انہیں بھی غالباً اس بات کا ادراک ہے کہ اس معاملے میں وہ کوئی بھاؤ دینے سے قطعاً قاصر ہیں۔ اگر عورت کا ہاتھ منہ اور سر بیر ڈھانپے بغیر

گھر سے باہر نکلنا فحاشی ہے تو اس معیار کے مطابق ہمارے دیہات سے زیادہ فحش مقام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

انسانی نفسیات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کوئی بھی کام جب معمول کا درجہ حاصل کر لے تو اس سے چونکنے کا عنصر منہا ہو جاتا ہے۔ اس سے لوگوں کی زندگی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ انکی حسیات میں کوئی بھونچال نہیں آتا۔ مگر مذہب کی تنگ نظر اور عورت دشمن تفسیر میں پھنسے ہوئے بیمار اذہان معمول کی زندگی کو بھی فحش بنا کر دکھانے میں لگے رہتے ہیں۔ اگر ان افراد کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو ممکن ہے انکی ذاتی زندگی میں پیوست کئی طرح کی نفسیاتی کجیوں کے بلیغ اشارے سامنے آئیں۔

والدین کی صورتحال

اولاد کے بارے والدین کی کج فہمی

سیکس ایک جبلی اور فطری معاملہ ہے جسے مخصوص طرز کی سماجی تربیت سے کسی حد تک سدھایا اور کنٹرول ضرور کیا جا سکتا ہے مگر پھر بھی یہ ایسا منہ زور جذبہ ہے جو تمام تر سماجی دباؤ کے باوجود اپنی تسکین کے رستے تلاش کر لیتا ہے۔ مشرقی سماج کے قانون ساز افراد، اخلاقی اور مذہبی مبلغ اور ان کی تبلیغ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہونے والے سربراہان خاندان اس جذبے کے حوالے سے اپنے جملہ اذیت ناک ذاتی تجربات کے باوجود اپنی اولاد کے لیے اس جذبے کو مناسب رستہ فراہم کرنے کی بجائے اسے مسلسل دبانے بلکہ مٹانے کے کارِ لاحاصل میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ جب وہ لڑکپن کی عمر میں داخل ہو رہے تھے تو ان کی کیا کیفیت تھی۔ انہیں جنسی جذبہ کس کس طرح سے پریشان کرتا تھا۔ ان کے اندر کیسے کیسے سوال جاگتے تھے مگر انہیں یہ سوال کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ مخالف جنس کیونکر انہیں ایک دم سے بے محابہ کشش کرنے لگ گئی تھی اور پھر یہ کشش انہیں کیسے کشاں کشاں لئے پھرتی تھی۔ ان کے کلاس فیلوز میں ایسے لڑکے بھی تھے جنہیں 'خراب' سمجھا جاتا تھا

اور وہ لڑکیوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی کہانیاں سنا کر 'شریف' بچوں کے جذبات بھڑکاتے تھے۔ اور پھر ان جذبات کے نکاس کے دو ہی راستے بچتے تھے، ایک تو ماسٹربیشن اور دوسرا اپنے ہم عمروں کے ساتھ جسمانی تعلق کی کوئی نہ کوئی صورت۔ اور یا پھر گھر میں مہمان کے طور پہ آئی ہوئی کسی کزن کو چوری چھپے چھونے کے بہانے کی تلاش۔ مگر گھر کے کسی فرد کے ہاتھوں پکڑے جانے کی صورت میں بدنامی اور مار پیٹ جو شخصیت میں ناقابلِ علاج بگاڑ پیدا کر سکتی ہے۔ اور پھر احساسِ جرم کا ایک لامتناہی سلسلہ جو زندگی بھر کا روگ بن کے رہ جاتا تھا۔

مگر شادی کے بعد اور خاص طور پر اولاد کی پیدائش کے بعد وہ تو جیسے اپنے ماضی کے اس حصے کو بالکل ہی بھول بیٹھتے ہیں۔ ہاں اگر انہیں کسی بات کا خیال ہے تو بس یہ کہ بچوں کو ہمہ وقت جیلر کی نظر سے دیکھا جائے تاکہ وہ 'خراب' ہونے سے بچ جائیں مگر اس بے کار مشق کے نتیجے میں یہ جذبہ دبنے کی بجائے اکثر مسخ شدہ شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ والدین کو بھنک تک نہیں پڑتی کہ ان کی اولاد کن راستوں پہ گامزن ہے۔ اساتذہ اور والدین بچوں کو جھوٹے اور ناقابلِ عمل اخلاقی اسباق کے ٹیکے لگائے چلے جا رہے ہیں مگر نتیجہ الٹ نکل رہا ہے۔

اساتذہ اور والدین کی مشترکہ شکایت یہ ہے کہ بچے خودسر اور بے راہ رو ہوتے جا رہے ہیں۔ اکثر والدین کی سطحی تفہیم یہی ہے کہ ان کی اولاد کے دوست ہی اس بگاڑ کی اصل وجہ ہیں اور دلچسپ بات یہ کہ جن بچوں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے ان کے والدین کی بھی الزام لگانے والوں کی اولاد کے بارے میں بھی یہی رائے ہوتی ہے۔ یہ دوطرفہ الزام تراشی ظاہر کرتی ہے کہ والدین مسئلے کی اصل وجوہ جاننے سے یا تو بالکل ہی قاصر ہیں اور یا پھر اپنی ذمہ داریوں سے فرار کی کوشش میں ہیں۔ اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ والدین، اساتذہ اور مذہبی ادارے مشترکہ طور پر اس مسئلے کی ذمہ داری سوسائٹی اور الیکٹرانک میڈیا پر بھی ڈال دیتے ہیں جہاں ان کے بقول بھارتی اور مغربی ثقافت کا راج ہے۔ ان مسائل سے نمٹنے کے لئے جس ذمہ دارانہ ادراک کی ضرورت ہے، ریاست سے لیکر خاندان کے ذمہ داران تک ہر کوئی اس سے آنکھیں بند کئے بیٹھا ہے۔

اولاد کے سوالوں سے گریز

ہمارے ہاں سیکس ایک تباہ کن بم کی طرح ہے جو گھر میں یا ارد گرد کسی وقت بھی چل سکتا ہے، تباہی پھیلا سکتا ہے۔ ہم سہمے ہوئے والدین ہیں۔ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ یہ بم صرف ہمارے ہاتھوں میں رہے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ یہ ہمارے لئے نہیں صرف ہماری جوان ہوتی ہوئی اولاد کے لئے خطرناک ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے بچے کس عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ ہم بچے کی پیدائش کو خوش نصیبی بھی مانتے ہیں، خاص طور پر لڑکے کی۔ انکی پیدائش پر مٹھائیاں بھی بانٹتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ہوش سنبھالنے کے بعد یہ پوچھ بیٹھے کہ وہ کیسے وجود میں آیا تھا تو ہمیں مصیبت پڑ جاتی ہے۔ یک نارمل عمل کو بچے کا عام سا سوال فحش بنا دیتا ہے۔ ہم خوفزدگی اور بوکھلاہٹ میں اسے الٹی پلٹی جوابات سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں بچہ حقیقت نہ جان لے۔ ایک جانب ہم نے اپنے تئیں نکاح کے دو بول پڑھوا کر اپنے اور بیوی کے جسمانی رشتے کو جائز اور پاکیزہ بنا لیا ہوتا ہے لیکن ہم اپنی سمجھدار ہوتی اولاد سے اسی جائز تعلق کو فحش سمجھ کر چھپا رہے ہوتے ہیں۔ یہ ہے وہ دوئی جس پر ہم بنا سوچے سمجھے عمل پیرا ہیں۔ ہمارے پاس اس سوال کا کوئی مناسب جواب نہیں ہوتا کہ ہم بچوں کے سوال کا درست جواب کیوں نہیں دے پاتے۔ ہمارا نام نہاد پاکیزہ تعلق بچوں کے ایک حقیقی سوال کا علمی جواب دینے سے فحاشی میں کیوں بدل جاتا ہے۔ سوال تو یہ بھی ہے کہ کیا تولید کا عمل واقعی فحش ہے یا ہم نے اپنی بے علمی اور غلط تربیت کے نتیجے میں اسے گندا مان لیا ہے۔ عام آدمی کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنی تربیت کے گھسے پٹے طریقوں پر کبھی غور نہیں کرتا بلکہ مزید یہ کہ اپنی اولاد پر بھی بلا سوچے سمجھے انہی طریقوں کو لاگو کر کے انکی زندگیوں کو مجہول بنا دیتا ہے۔

بچے کا ماحول کتنا ہی بند محدود یا سادہ کیوں نہ ہو تجسس کہیں نہ کہیں سے جاگ پڑتا ہے۔ وہ اکثر سوچتا ہے کہ وہ کس طرح سے اس دنیا میں وارد ہوا تھا، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اسے والدین، بزرگوں اور اساتذہ سے اپنی ہی پیدائش کے بارے میں جاننے کی اجازت نہیں ہوتی۔ تجسس پھر کچھ اور راستے تلاش کرتا ہے جیسے دوستوں کے ذریعے بلیو فلموں تک رسائی جن میں وہ کچھ دکھایا

جاتا ہے جس کے بارے میں بات کرنا تو دور کی بات سوچنا بھی گناہ تصور ہوتا ہے۔

ہمارے بچے بات کرنا چاہتے ہیں مگر۔۔۔

ہمارے بچے ہم سے بات کرنا چاہتے ہیں مگر ہمارے پاس وقت ہونے کے باوجود ان کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ جب وہ بہت چھوٹے ہوتے ہیں تو ہمارے نزدیک یا تو ان کی باتیں خوش وقتی کا ذریعہ ہوتی ہیں یا پھر یکسر بے معنی۔ اور جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں تو ہم ان کی بات سننے کی بجائے یکطرفہ پندونصائح کا طریقہ اپنا لیتے ہیں جس میں بچوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور یوں ہم انجانے میں انہیں خود سے دور کر دیتے ہیں۔ ہمیں لگتا ہے جیسے بچوں کے ساتھ ان کی دلچسپیوں کے بارے بات کرنے سے ہم بزرگی کے منصب سے معزول ہو جائیں گے اور ہم نے بڑے بن کر جو احترام پایا ہے اسے کھونا پڑے گا۔ سو بزرگی کا بھرم قائم رکھنے کے لئے ہم رعب اور نصیحتوں کو حربے کے طور پر برتتے ہیں۔ مگر جواب میں ایک مصنوعی احترام کے سوا ہمارے کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔

حالات نے ہمیں کولہو کے بیل کی زندگی جینے پر مجبور کر رکھا ہے۔ اور اس بے معنی طرزِ حیات نے ہمیں زندگی کو خوش، پر جوش اور پر لطف بنانے کے ہنر سے محروم کر دیا ہے۔ ہم نے شائد ہی کبھی خود سے یہ سوال پوچھا ہو کہ ہم اس دنیا میں کیا لینے آئے ہیں اور کیا دے کر جائیں گے؟ ہم نے شادی کیوں کی؟؟؟ اب ہم اولاد کس لئے پیدا کئے جا رہے ہیں؟؟؟ کیا صرف اس لئے کہ وہ ہماری (عارضی نوعیت کی) جائیداد اور بے معنی زندگی کے وارث بنیں اور ہماری طرح ایک بے لطف اور بے سمت زندگی گزار کے مر جائیں۔

یقیناً ہر ایک والدین کو اپنے بچوں سے پیار ہوتا ہے اور وہ اپنے تئیں ممکنہ حد تک ان کے بھلے کا بھی سوچتے ہیں۔ لیکن پیار ہونے اور پیار کرنا آنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پیار تو ایک معنی میں جبلت اور قربت کا فطری نتیجہ ہے مگر اسے عمل میں ڈھالنے اور اس کے عمدہ نتائج کے حصول کے لیے شعوری ذمہ داری شرط کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر اولاد کے ساتھ پیار سے شعوری ذمہ داری کو منہا کر دیا جائے تو یہی پیار ان کے بچے کو غیر انسان بھی بنا سکتا ہے۔ اور ہماری سوسائٹی ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

ہم تمام عمر ایک خودغرضانہ زندگی جیتے ہیں جس کے مقاصد جانوروں کی زندگی سے زیادہ مختلف اور بلند نہیں ہوتے۔ عمومی طور پر ہمارا مقصد دولت کمانے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا جس کے ذریعے ہم رسم ورواج کو شاندار طریقے سے نبھا کر اردگرد کے لوگوں اور رشتہ داروں میں خود کو نمایاں کرسکیں۔ شائد ہم صرف مرنے کے لئے پیدا ہوتے تاکہ مرنے کے بعد زندہ رہنے کے لئے۔ اس کام کے لئے جانور پن سے اوپر اٹھنا شرط ہے۔

اپنے ہی گھر میں اجنبی

ہماری سوسائٹی ایک ناخوش بلکہ مبتلائے اذیت سوسائٹی ہے جہاں دکھاوے کے احساس اور اخلاق کا چلن عام ہے۔ ہر فرد اپنے ہی گھر میں اجنبی ہے، اپنے اپنے خانے میں بند۔ والدین اور بہن بھائی قریب ترین رشتے ہیں مگر وہ اک دوجے کے حال کے محرم نہیں۔ ان کے ساتھ دل کی بات شیئر کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ شیئر ہو بھی تو کیسے کہ ذلت انگیز رویہ اور گوشمالی کا ڈر ہمیں ایسا کرنے ہی نہیں دیتا۔ والدین کو بھی کسی نے نہیں سکھایا کہ اولاد ان سے احساس بھرے شفیق سلوک کی خواہش رکھتی ہے۔ اکثر والدین نے اپنے اکھڑے ہوئے غصیلے رویوں سے ہمیشہ اپنی اولاد کو مایوس کرنے کے عادی ہوتے ہیں، خصوصاً باپ تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ انہیں یہی سکھایا گیا ہوتا ہے کہ اولاد کی غلطیوں پر کسی ممتحن کی طرح نظر رکھنی ہے۔ انہیں بزرگوں کی جانب سے یہی سبق دیا گیا ہوتا ہے کہ اولاد کو اچھا بنانے کا یہی نسخہ کیمیا ہے کہ ان سے جیلر کی طرح پیش آؤ۔ اس نسخے کا ایک جزیہ بھی ہے کہ بچے کی جائز تعریف میں بھی بخل سے کام لیا جائے مگر اس کی کسی بھی چھوٹی بڑی غلطی کو کسی صورت معاف نہ کیا جائے۔ غلطی کا غلطی ثابت ہونا ضروری نہیں، ہاں بس والدین کا اسے غلطی سمجھنا ہی کافی ہے۔

بزرگ کبھی غلطی نہیں کرتے

اولاد اور والدین میں مکالمے کا شدید فقدان ہے اور اس کی بنیادیں اس وقت رکھ دی جاتی ہیں جب بچہ توتلی زبان میں سوال پوچھنے شروع کرتا ہے اور اسے ہر سوال پر ڈانٹ، جھڑک کر خاموش رہنے کا

سبق دیا جاتا ہے۔ ابھی تو اس نے سوچنے کا عمل شروع کیا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کے ارد گرد یہ سب کیا ہے۔ ابھی تو 'کیوں ہے' کا مرحلہ بھی آنا تھا، مگر اسے تو 'کیا ہے' کے مرحلے پر ہی چپ کروا دیا جاتا ہے۔ اسے ہر غلطی پہ ڈانٹ پڑتی ہے۔ والدین چاہتے ہیں کہ وہ تین برس کی عمر میں ہی تیس برس کا ہو جائے جبکہ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ خود انہیں تیس برس کا ہونے میں تیس برس لگے ہیں۔ بچے کی کوئی نہیں سنتا، سب اسے سنانے میں لگے رہتے ہیں۔ کسی کو نہ تو سمجھ ہے نہ اس بات کی فکر کہ بچے کے رجحانات کیا ہیں۔ ٹیلی ویژن پہ گانا سن کر اس کے پاؤں کیوں تھرکنے لگتے ہیں۔ وہ بڑے بہن بھائیوں کی پینسل یا بال پوائنٹ سے ان کی کاپیوں اور کتابوں پر الٹی سیدھی لکیریں لگا کر انہیں 'خراب' کیوں کرتا ہے۔ وہ گھر سے باہر جانے والے ہر فرد کے ساتھ جانے کی ضد کیوں کرتا ہے۔ وہ بات بات پر فرش پہ لوٹ کر اپنے کپڑے کیوں خراب کرتا ہے۔ نیا لباس پہن کر اس کی چال میں تمکنت کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔

کسی کو خیال نہیں آتا کہ بچے کے ساتھ باتیں کرنا، اسے باقاعدہ وقت اور توجہ دینا کتنا ضروری ہے۔ والدین کے نزدیک وہ صرف بچہ ہے، ایک نا سمجھ بچہ۔ وہ نہیں جانتے کہ اسکی زندگی کے یہی پہلے پانچ سال ہیں جو اس کی آئندہ زندگی کا رخ متعین کریں گے۔ اس عمر میں بچہ اور وہ بھی پہلوٹھی کا، والدین کے لئے بس ایک کھلونا ہے جس کا کام اپنی اوٹ پٹانگ حرکتوں اور جوش بھری کلکاریوں سے انھیں خوش کرنا ہے۔

ہم نے بچے کو بڑی سادہ سی شے مان رکھا ہے جس کو بہلانے کے لئے کھلونے کافی ہیں۔ ہم اس کے اندر ہونے والی شکست و ریخت کو نہ تو جانتے ہیں اور نہ ہی جاننے کے روادار ہیں۔ ہماری تو خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہم سے کوئی سوال نہ پوچھے، بس اپنے کام سے لگا رہے اور کام بھی وہ جس کی ہم اجازت دیں۔ ہم شائد زندگی سے بیزار لوگ ہیں جو بیٹوں کے جلد بڑا ہو جانے کے انتظار میں ہیں تا کہ وہ ہمارے بیکار بڑھاپے کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اور اگر وہ پڑھ لکھ کر کوئی عہدہ حاصل کر لیں یا کسی جائز یا ناجائز طریقے سے دولت حاصل کر لیں تو کیا ہی بات ہے۔ اخلاقیات اب ایک متروک شے ہے جو صرف

تذکرے کے لئے روشنی ہے۔ یہ نہیں کہ ہم اپنے بچے کو اچھا انسان نہیں بنانا چاہتے۔ بنانا تو چاہتے ہیں مگر اس کا مفہوم ہمارے سطحی اور محدود مفادات سے جڑا ہے۔ اچھا بننے کا واحد مطلب یہ ہے کہ وہ اولاد ہونے کے ناطے کسی رعایا کی طرح بے چون وچرا ہماری ہر صحیح اور غلط بات کو حرف آخر جان کر تسلیم کرے اور ہم سے کوئی دلیل طلب نہ کرے۔ وہ یہ بات مان لے کہ والدین کبھی غلطی نہیں کرتے۔

صرف نطفے کا رشتہ

اولاد کے ساتھ دوستی کرنا ہمارے لئے موت کے برابر ہے۔ ہم تو بس نطفے کے ناطے باپ کے منصب پر فائز رہنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے شادی شدہ ہونے کا ثبوت کافی ہے جو ہمیں اولاد اور ان کی والدہ پر حکمرانی کا غیر مشروط حق عطا کرتا ہے۔ ہمیں اور نہ ہی سماج کو اس بات سے کوئی غرض ہے کہ باپ ہونے کا مطلب کیا ہے؟ یہ منصب یا رشتہ کن نازک اور تہہ در تہہ ذمہ داریوں کا متقاضی ہے۔ ہم نے بس اس تعلق کو جانوروں کی سطح سے کچھ اوپر لا کر منجمد کر دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم بچے کو سمجھنے سے صاف انکاری ہیں مگر گمان بلکہ غرور یہ ہے کہ ہم سے زیادہ ہماری اولاد کو کوئی نہیں سمجھتا۔

ہم کسی حد تک بچے کے جسمانی تقاضوں سے ضرور آگاہ ہوتے ہیں، جیسے خوراک اور لباس، مگر اس کی ذہنی کائنات ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔ بچے کی زندگی میں بلوغت کا دور انتہائی نازک ہوتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جب وہ زیادہ شدت کے ساتھ خود کو ایک لڑکے یا لڑکی کے طور پر شناخت کرتا ہے۔ اسے متقابل جنس میں کشش محسوس ہوتی ہے۔ وہ اچانک اپنے بناؤ سنگھار پر پہلے سے زیادہ توجہ دینے لگتا ہے۔ دل میں والدین کے علاوہ کسی اور کی توجہ کا مرکز بننے کی خواہش مچلنے لگتی ہے۔ مگر اکثر والدین کو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ڈانٹ ڈپٹ، ٹوکا ٹاکی اور بڑھ جاتی ہے۔ بچہ جو پہلے ہی والدین کے رویے سے تنگ ہوتا ہے، ان سے مزید دور جانے لگتا ہے۔ ایسے میں اس کا واحد سہارا وہ چند قریبی دوست ہوتے ہیں جن پر اسے اندھا اعتماد ہوتا ہے۔ وہ اپنے دماغ میں پنپنے والے رنگین خیالات صرف انہی سے شیئر کرتا ہے۔ اگرچہ ان کے پاس کوئی معقول مشورہ تو نہیں ہوتا مگر یہ کیتھارسز بچے کو بہت لطف اور اطمینان بخشتا ہے۔ والدین کی اکثریت کو بالکل خبر نہیں ہوتی کہ ان کا بچہ دوستوں

کے ساتھ کن موضوعات پہ گھنٹوں مصروف گفتگو رہتا ہے۔ ان کو تو بس اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ وہ گھر سے باہر آوارہ گردی نہ کرے۔ باقی پڑھنے کے بہانے بھلے سارا دن کسی دوست کے ہاں گزار دے۔

ابتدائی تربیت کے محکم اثرات

بچوں میں ابتدائی تربیت کے اثرات اس قدر محکم ہوتے ہیں کہ وہ تمام عمر ان کی شخصیت پر پہرے دار کی حیثیت سے مسلط رہتے ہیں۔ یہ اثرات جہاں ایک طرف بچے کے 'اچھے' کردار کے ضامن ہوتے ہیں وہیں بلوغت کی عمر میں اس کے اندر ایک مسلسل جنگ چھیڑے رکھتے ہیں۔ یہ جنگ ہوتی ہے اس کے جبلی جنسی تقاضوں اور ضمیر کے بیچ۔ جبلی تقاضے اسے سراسر گناہ لگتے ہیں اور ضمیر ایک ایسا پہریدار جو ان تقاضوں کی جانب دھیان کرنے پر کوڑا لہرانے لگتا ہے۔

یہ ضمیر کیا ہے؟

ضمیر قطعاً کوئی بنی بنائی شے یا طے شدہ صفت نہیں ہے جسے کوئی مافوق الفطرت ہستی ہماری روح میں گوندھ دیتی ہے۔ بلکہ یہ تو سراسر نتیجہ ہے بچے کی ابتدائی تربیت کا جو ماں کی گود سے شروع ہو کر سکول جانے کی عمر تک بچے کی شخصیت میں اپنے پنجے گاڑ چکی ہوتی ہے۔ بچہ اپنے قریب ترین ماحول میں جو باتیں تسلسل سے پریکٹس ہوتے دیکھتا ہے وہی اس کا ضمیر بن جاتی ہیں۔ ضمیر کا والدین اور سماج کی طرف سے رٹائے جانے والے زبانی اخلاقی اسباق سے کوئی زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔ جن گھروں میں جنسی معاملات بے شرمی کے انداز میں روزمرہ گفتگو کا حصہ ہوتے ہیں اور گالم گلوچ کا چلن عام ہوتا ہے، ان گھروں کے لڑکے لڑکیوں کے لئے جنسی معاملات کسی خاص تقدس کے حامل نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ نچلے طبقات کی لڑکیاں اور عورتیں جنسی تعلق میں زیادہ بے ساختگی اور بے باکی کی حامل ہوتی ہیں۔ اسی لیے وہ کھل کر لطف اندوز ہوتی ہیں۔ وہ خود کو بڑی آسانی سے اپنے چاہنے والے کے حوالے کر دیتی ہیں اور ان کا ضمیر انہیں بالکل سرزنش نہیں کرتا۔

ایک بنی بنائی سوچ یہ ہے کہ نیکی اور بدی کی صورتیں ازل سے طے کر دی گئی ہیں اور یہ بنا کسی تبدیلی

کے ابد تک ایسے ہی برقرار رہیں گی اور ہر فرد کے اندر ضمیر نام کا ایک آلہ لگا ہوا ہے جو ان صورتوں کو با آسانی پہچان لیتا ہے۔ جہاں تک نیکی بدی کو پہچاننے کا تعلق ہے تو یقیناً ضمیر کا یہی کام ہے مگر یہ بات درست نہیں کہ نیکی اور بدی کے معیار دنیا بھر میں ایک جیسے ہیں۔ مثلاً مختلف اقوام میں حرام اور حلال اور فحاشی کی حدود کے تصورات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سؤر اور شراب اُن کے اکل و شرب کا باقاعدہ حصہ ہیں۔ کئی اقوام میں تو کتے، بندر اور حشرات الارض تک بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ مغربی ممالک میں مختلف مذاہب کے افراد کے درمیان شادی بیاہ کا تصور بالکل قانونی حیثیت رکھتا ہے بلکہ شادی سے پہلے جسمانی تعلق بنانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ وہاں ہم جنس پسندوں کی شادی کو قانونی جواز دیا جا چکا ہے۔ جہاں تک معیشت کا معاملہ ہے تو مسلمانوں کے علاوہ یہ ہر قوم کے نزدیک معیشت کے جائز حصے کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ سب وہ معاملات ہیں جو ہمارے ہاں شدید گناہ کے کام سمجھے جاتے ہیں۔ مغرب کے باشندوں کے ضمیر کو ان سے کوئی الجھن نہیں ہوتی۔ مگر ستم ظریفی یہ کہ ان شدید گناہوں میں چند ایک ہی ہیں جنہیں ہمارا ضمیر کسی صورت گوارہ نہیں کرتا، جیسے کہ کھانے پینے کی چند مخصوص اشیاء اور پردے کا معاملہ۔ جبکہ بہت سے لوگوں کو نہ تو شراب سے کوئی مسئلہ ہوتا ہے نہ زنا سے۔ ہاں اگر یہی کام ہمارے بچے کریں تو ہمارا ضمیر بلبلا اٹھتا ہے۔ رشوت اور سود کھانے سے بھی ہمارے ضمیر کو کوئی کچوکہ نہیں لگتا اور نہ ہی ملاوٹ، ناپ تول میں بے ایمانی اور جھوٹ بولنے کے عمل سے ہمارے ضمیر کو کوئی پشیمانی ہوتی ہے۔

سو ان باتوں سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ نہ تو نیکی بدی کے معیار طے شدہ ہیں اور نہ ضمیر کوئی ایسی کسوٹی ہے جو ہر فرد میں ایک جیسی صورت رکھتی ہو۔ ایسے گھر جہاں اخلاقی اور مذہبی اقدار فوجی انداز میں لاگو کیے جاتے ہیں، وہاں بچوں کے اندر پروان چڑھنے والا ضمیر ایک سخت اور چڑچڑے مزاج نگران کی طرح ہوتا ہے۔ یہ بچے بظاہر بڑے شریف، سادہ اور باکردار ہوتے ہیں مگر سخت اخلاقی تربیت ان کے آزاد تخلیقی وجود کو کھا جاتی ہے۔ لطف اور خوشی کے کئی ذائقے ان پر منکشف ہی نہیں ہو پاتے۔ یہ جوانی میں ہی بوڑھوں سے دکھنے لگتے ہیں۔ انہیں ہر وقت مہذب دکھنے کی فکر کھائے جاتی ہے۔ ادب، موسیقی، فلم کی حیثیت ان

کے نزدیک خرافات جیسی ہوتی ہے جن کا مقصد اخلاق کی خرابی اور وقت کے ضیاع کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے تمام لطف جذبوں کی بجائے اشیاء سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ جبلت پر ضمیر کی سخت پابندیاں نہ صرف انہیں خود خوش نہیں رہنے دیتیں بلکہ انہیں دوسروں کی خوشی بھی ڈسٹرب کرتی ہے۔ بے ساختہ ہنستا اور قہقہے لگاتا شخص ان کے تئیں غیر مہذب ہوتا ہے۔

مڈل کلاس کے ان مہذب اور بااخلاق بچوں کا المیہ یہ ہے کہ ان کے اندر ہمہ وقت خیر اور شر کے درمیان ایک جنگ بپا رہتی ہے جس میں ظاہری طور پر تو یہ فتح یاب دکھائی دیتے ہیں مگر اندر سے انتہائی شکست خوردہ۔ ان کے اندر جبلت نئے نئے روپ دھار کر انہیں عذاب میں مبتلا کیے رکھتی ہے۔ ان کے ذہنوں میں بچپن سے ایک شیطان کا تصور راسخ کیا جاتا ہے سو جبلت کی ہر انگیخت انہیں شیطان کا کام لگتی ہے۔

فیوڈل رویے

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اس مشینی دور میں بھی فیوڈل رویوں کے اسیر ہیں اور اس مسئلے کو سمجھنے کی بجائے اسے خوف کے ہتھیار سے دبانے کی کوشش میں مبتلا ہیں۔ فیوڈل رویے ہیں کیا، پہلے اسکو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ فیوڈل رویہ یہ ہے کہ کسی فرد کی غلط سے غلط بات پر بھی محض اس بنا پر سر تسلیم خم کر دیا جائے کہ وہ آپ سے عمر، عہدے یا رشتے میں بڑا ہے۔ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است کا نامعقول مقولا اسی فیوڈل سوچ کا غماز ہے۔ یعنی بزرگوں کی غلطی کی نشاندہی کرنا بھی غلط بلکہ بے ادبی ہے۔ ہمارے ہاں غلط اور ٹھیک کا معیار عمل کی نوعیت سے نہیں بلکہ کرنے والے کی حیثیت سے طے ہوتا ہے۔

خاندان میں باپ کا درجہ سب سے بلند ہے اور اس کے کردار کی بڑی سے بڑی برائی بھی اسے بزرگی کے مرتبے سے معزول نہیں کر سکتی۔ سوسائٹی کی طرف سے اچھی سے اچھی اولاد کو بھی برے سے برے باپ کے آگے جھکنے کا ہی مشورہ دیا جاتا ہے۔

گھر کی حیثیت مطلق العنان ریاست کے ایک یونٹ جیسی ہے جہاں باپ بادشاہ ہے اور اولاد رعایا۔ شوہر کی حیثیت سے اسے مجازی خدا کا مقام حاصل ہے۔ دین کے علاوہ کسی معاملے میں اس کے کسی حکم

سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ دین بھی مرد کی فہم سے ہی طے ہوگا جس کا ماخذ عمومی طور پر سنی سنائی باتوں سے ہوتا ہے جو اکثر مرد کی پردھانگی کو سپورٹ کرنے والی ہوتی ہیں۔ خاندان پر ناجائز حکم چلانے کے اختیار کا صدور اس کی اپنی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ اسے یہ طاقت سماج کی اجتماعی سوچ سے حاصل ہوتی ہے۔

دو طرح کی طاقتیں

کوئی بھی فرد ایک وقت میں دو طرح کی طاقتوں کا مالک ہو سکتا ہے۔ ایک وہ طاقت جو اصلاً اس کی ذات کا حصہ نہیں ہوتی اور فرد کسی وقت بھی اس سے محروم ہو سکتا ہے، جیسے دولت، جائداد، عہدہ یا سماجی رشتہ (شوہر، بیوی یا دوست کا)۔ اور دوسری طاقت وہ جسے اس کی ذات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور مرنے کے بعد بھی اس فرد کی ذات کا حوالہ بنی رہتی ہے، جیسے علم، دانش، رویہ اور تخلیقی ہنر۔ اگر محض باپ ہونا واقعی کوئی عزت کے قابل رشتہ ہے تو اس عزت کے حصول میں فرد کی اپنی کوئی محنت شامل نہیں بلکہ یہ مرتبہ اسے ایک بیرونی عنصر یعنی سماج نے دیا ہے۔ ہاں البتہ ذمہ داری کے ساتھ محبت کا تعلق بنانے والا باپ بننے کے لیے اس اپنی ذات میں شعوری تبدیلیاں لانی پڑتی ہیں۔ اسے حاکم کی بجائے بچوں کے سینئر مددگار کا کردار اپنانا پڑتا ہے۔ جو ان کی جسمانی اور ذہنی ضرورتوں کو محبت اور احساس ذمہ داری سے ادا کرتا ہے۔

والدینی ذمہ داری کا فقدان

بنیادی طور پر باپ اور اولاد کا بایولاجیکل اور دستاویزی رشتہ تو نطفے سے طے ہوتا ہے لیکن سماجی حوالے سے یہ تعلق بہت سی نازک اور سنجیدہ ذمہ داریوں کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس رشتے کی نزاکت اور گہرائی کو سمجھنے کے لئے جس تعلیم کی ضرورت ہے وہ ہمارے ہاں بالکل ناپید ہے۔ ہمارے سکولی نصاب میں عمومی طور پر سٹیریو ٹائپ اخلاقی اقدار کا رٹا لگوایا جاتا ہے جبکہ ہر کوئی اپنے تجربے سے یہ جانتا ہے کہ یہ اقدار ہماری عملی زندگی میں شاذ و نادر ہی پریکٹس ہوتی ہیں۔ اگرچہ ہر کوئی ان اقدار کے کھوکھلے پن سے واقف ہوتا

ہے مگر پھر بھی ان کی زبانی تبلیغ سے باز نہیں آتا بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ ان اقدار پر کاربند بھی ہیں۔ دراصل یہ اپنی جھوٹی عزت کا بھرم رکھنے کا ایک حربہ ہے جسے ہم کسی بھی سماجی محفل میں استعمال کرنے سے باز نہیں آتے۔ حاضرینِ محفل یہی ثابت کرنے میں لگے ہوتے ہیں کہ صرف وہی ہیں جو اخلاقیات پر عمل پیرا ہیں جبکہ باقی تمام سوسائٹی اخلاق سے یکسر خالی ہے۔

انسانی بنیادوں پر دیکھیں تو والدین کی ذمہ داری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ محض اتنا نہیں کہ اولاد کو روٹی کپڑا اور روٹین کی تعلیم فراہم کردی جائے۔ بلکہ یہ ہمارے حصے میں آئے ہوئے ایک وجود کے امکانات کو سمجھنے، ان کو بڑھانے اور پھر عملی صورت دینے کا معاملہ ہے جو محبت بھرے احساس اور علم سے ہی ممکن ہے۔ اس معاملے میں صرف احساس اور محبت کافی نہیں بلکہ علم کا ہونا بھی ناگزیر ہے۔ علم جو ہمیں ہماری محبت اور حساسیت کو آنکھیں عطا کرتا ہے۔ جس سے ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ قدرت نے بچے کی صورت میں ہمیں جو بےانت امکانات کی کائنات عطا کی ہے اسے عملی صورت میں ڈھال کر ایک قیمتی وجود میں بدلنے کے کیا طریقے ہیں۔ ایک ایسا وجود جو محتاج ہونے کی بجائے دوسروں کی محتاجی ختم کرے اور دنیا کو خود اپنے اور دوسروں کے لیے پہلے سے زیادہ بامعنی، آرام دہ اور خوبصورت بنائے۔ ایک ایسا وجود جو علم اور احساس کا مرقع ہو۔ جو دوسروں میں علم، محبت اور آسانیاں تقسیم کرے۔ ایک ایسا انسان جس کے ہونے پر ہم فخر محسوس کریں۔

فیوڈل اخلاقیات کی جکڑ

جب تک انسان کا رزق صرف زرعی پیداوار اور سادہ ترین پیشوں سے جڑا تھا، تب تک اولاد کی ذمہ داریوں کی تفہیم بہت سادہ اور سطحی تھی۔ باپ کی ذمہ داری صرف اتنی تھی کہ وہ سب سے پہلے بچوں کی زندگی کے تحفظ کے لئے روٹی کپڑے اور چھت کا بندوبست کرے اور جب وہ بڑے ہوں تو انہیں اپنا آبائی ہنر سکھا کر کھانے کمانے کے قابل بنادے اور پھر ان کی شادی کرکے انہیں اپنے جیسی ہی روٹین کی زندگی کے ہموار راستے پر چڑھا کر خود موت کے انتظار میں بیٹھ جائے۔ خودکار مشین کے نہ ہونے

سے زمانوں تک نہ تو اشیاء بدلتی تھیں اور نہ ہی سماجی اقدار میں کوئی خاص تبدیلی واقع ہوتی تھی۔ سمجھو کہ زندگی جوں کی چال سے آگے بڑھتی تھی۔ ایسے میں علم اور تعلیم کا احساس نہ ہونے کے برابر تھا۔ پورے گاؤں کے کل سماجی اور مذہبی مسائل کے حل کے لئے ایک سیانا بزرگ اور مسجد کا مولوی کافی تھے۔

ذہن پر جسم فوقیت رکھتا تھا۔ بھائی اور بیٹوں کو مضبوط بانہوں سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ قریبی دوستوں کے لئے بانہہ بیلی کی اصطلاح مروج تھی۔ 'دیکھو شیر کی آنکھ سے اور کھلاؤ سونے کا نوالہ' جیسے محاورے اسی دور کی ذہنیت اور سوچ کے نمائندہ ہیں۔ شادی کا مقصد زیادہ سے زیادہ بیٹے پیدا کرنا تھا تاکہ زمین کی پیداوار بڑھانے میں مددگار ثابت ہوں۔ بیٹیوں کی پیدائش ایک ناروا بوجھ کی طرح ناپسندیدہ تھی جنہیں جوان ہونے کے بعد شادی کے نام پر ٹھکانے لگانا مجبوری تھا۔

اس مقصد کے لیے برادری سے جڑا رہنا ضروری تھا۔ برادری سسٹم میں انمل بے جوڑ رشتے باآسانی طے پا جاتے تھے۔ مشترکہ رہن سہن کی وجہ سے بیاہ کر جانے والی لڑکی شوہر کے علاوہ پورے گھر کی ذمہ داری ہوتی تھی، سو نان نفقہ کی فراہمی کوئی مسئلہ نہیں بنتی تھی۔ نئے پیدا ہونے والے بچے کی حیثیت ایک کھلونے کی سی ہوتی تھی جو مختلف ہاتھوں میں کھیل کھال کر بڑا ہو جاتا تھا اور اس کے بعد وہ کھیت کھلیان میں بڑوں کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہو جاتا تھا۔ یہی تھی وہ زندگی جو ملک کی عظیم اکثریت کا چلن تھی۔

سائنس نے مشاہداتی اور نظریاتی حصار کو توڑ کر تجربے کے میدان میں قدم رکھا تو کمیونیکیشن کے نئے اور تیز رفتار آلات جیسے ریڈیو، ٹیلی پرنٹر، ٹیلی ویژن اور ٹیلیفون نے علم اور اطلاعات کے ابلاغ کو پَر لگا دیئے۔ پرنٹنگ پریس کی ایجاد نے کتاب کو عالموں اور امراء کی پہنچ سے نکال کر عام آدمی کے گھر تک پہنچا دیا۔ یورپ نے اس سے فوراً استفادہ کیا مگر ایشیاء خاص طور پر مسلم دنیا اپنی بدقسمتی پر مصر رہی۔ گٹن برگ کی اس انقلابی ایجاد کو عیاش اور ناکارہ مغل بادشاہت اور ترکوں کی بوسیدہ خلافت نے اپنی روائتی جہالت کے باوصف ہندوستان اور ترکی میں داخلے کی اجازت نہیں دی۔

زندگی کو سہل بنانے اور روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے والے ہنروں سے وابستہ لوگ جیسے لوہار، ترکھان، موچی، نائی، نان بائی، جولاہے، درزی، کمہار، ٹھٹھیرے (منقش دھاتی برتن ساز) اور کسان

اپنی تمام تر پیداواری صلاحیت اور سکت کے باوجود ناکارہ اور نکمے مگر نام نہاد عزت دار چوہدری کے سامنے کمی یعنی کام کرنے والے غلام کا درجہ رکھتے تھے۔ عام آدمی بس مرنے کے لئے پیدا ہوتا تھا۔ مسلمانوں میں مذہبی موشگافیاں علم کا درجہ رکھتی تھیں۔ عمومی طور پر بے معنی حیرت اور علم کو لازم وملزوم سمجھا جاتا تھا۔ ہنر سے جڑے علوم قدر اور اہمیت سے چنداں محروم تھے۔ صرف دربار سے وابستہ ہنرمند عزت پاتے تھے۔ عزت اور دولت ہنر سے نہیں دھونس اور عیاری سے ملتی تھی۔ بادشاہ کا کام صرف حکم چلانا اور عیاشی کرنا تھا اور عوام کا کام حکم ماننا اور بھوک سہنا۔ زندگی رہٹ کی رفتار سے محدود سے گھیرے میں گھوم رہی تھی۔ ابھی عریاں تصویروں، اور فحش فلموں کا زمانہ نہیں آیا تھا۔ بادشاہ اپنی طاقت اور زر کے زور پر کسی بھی عورت کو اپنے دربار میں ننگا نچوا اور اپنے حرم میں سلا سکتے تھے۔ ان کے لئے اخلاقیات کچی مٹی کی دیوار تھے جسے وہ جب چاہے گرا سکتے تھے، جب چاہے اٹھا سکتے تھے اور جب چاہے دوبارہ گرا سکتے تھے۔ مگر وہ عوام الناس کے لیے یہ دیواریں ممکنہ حدوں تک بلند رکھنا چاہتے تھے۔ ظل الٰہی ہونے کے ناطے قانون اور اخلاقیات ان کی ہوس کے مطابق شکلیں بدل لیتے تھے۔ اخلاقیات کا مطلب صرف غریب رعایا کی ہر طرح کے لطف سے محرومی تھا۔ وہ جنہیں ظلِ الٰہی یعنی عوام الناس کے سروں پر خدا کا سایہ ہونے کا الہام نما دعوٰی تھا، ہر طرح کی عیاشی اور سہولت کے حقدار تھے کیونکہ تقدیر کا فلسفہ یہی تھا جس پر انگلی اٹھانا کفر کے برابر تھا۔

خودکار مشین کا چیلنج اور تبدیلی کا عمل

یہ فیوڈل ازم بنی بادشاہت کا دور تھا جسے خودکار مشین کی ایجاد اور اس سے نمو پانے والے علم نے چیلنج کرنا شروع کیا۔ عام آدمی کی ایک خصلت یہ ہے کہ وہ اپنے لاشعور کے دور میں بنی ہوئی نفسیات، عادتوں اور ذائقوں کا مرتے دم تک اسیر رہتا ہے۔ فیوڈل دور میں تو فرد کی عادات اس لئے بھی زیادہ پختہ ہوتی تھیں کہ ارد گرد تبدیلی کا عمل نہ ہونے کے برابر تھا لیکن خودکار مشین کی ایجاد نے سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرح کی انفرمیشن کا سیلاب امڈ آیا۔ والدین کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ وہ اس صورتحال کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ پہلے تو صرف ایک نوٹنکی، سرکس یا سنما ہوتا

تھا جسے فحاشی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔تب والدین کے لئے بچوں پر پابندی لگانا قدرے آسان تھا۔ویسے
بھی علاقے کا ہر بزرگ سبھی نوجوانوں پہ نظر رکھتا تھا۔سوائے میں سنما یا نوٹنکی تک رسائی جان جوکھوں
کا کام تھی۔مگر ٹیلی ویژن، موبائل اور انٹرنیٹ نے تو فحاشی کے اتنے رخنے کھول دیئے ہیں کہ والدین
ہولا۔کے رہ گئے ہیں۔انہیں بالکل سمجھ نہیں آرہی کہ کس کس رخنے کو بند کریں اور سیلاب ہے کہ امڈا چلا
آرہا ہے۔

والدین کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ وہ شرم وحیا اور تہذیب کے سنے سنائے تصورات میں پھنسے ہوئے
ہیں۔اولاد سے ابلاغ کا رشتہ نہ ہونے کے برابر ہے۔انھیں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ ان کے بچوں کے
ذہن میں کیسے کیسے خیالات پنپ رہے ہیں۔وہ جن اقدار کو بچوں پر لاگو کرنے پہ بضد ہیں۔ ان کا جواز
سمجھانے میں بالکل ناکام ہیں۔اسی لئے وہ بچوں کو صرف اپنی بات ماننے کا حکم دیتے ہیں۔وہ بچوں کو
ان اقدار پہ سوال اٹھانے کی اجازت نہیں دیتے مبادا کہ ان کی بزرگانہ دانش کا بھرم کھل جائے۔

ہم اپنے سماج میں شرم وحیا کی اقدار کو مغربی سماج کے مقابلے میں ایک اخلاقی برتری کے طور پر فخریہ
انداز میں بیان کرتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ اقدار اب ایک منافقانہ بیان سے
زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔انٹرنیٹ پہ جنسی مناظر والی فلمیں دیکھنے میں ہم پاکستانی دنیا میں سب سے
آگے ہیں۔اسی بنا پر پاکستان کو طنزیہ طور پہ 'پورنستان' کا تضحیک آمیز نام بھی دیا گیا۔ہمارا مسئلہ یہ ہے
کہ ہم نے اخلاقی اقدار کو وقت کے اثرات سے مبرا سمجھ رکھا ہے جبکہ لاشعوری طور پہ ہم مسلسل نئی
تبدیلیوں کو اپنی زندگی میں شامل بھی کیے جا رہے ہیں۔یعنی ہم جن اقدار کی تعریف میں رطب اللسان
ہیں وہ عملی سطح پر اپنا وجود کھو چکی ہیں۔

ہماری ایک تنگ نظری یہ بھی ہے کہ ہم نے اخلاقی اقدار کا دائرہ عمومی طور پر فرد کے صرف جنسی معاملات اور
رویوں تک محدود کر دیا ہے۔جب کہ حقیقتاً ہر وہ عمل بداخلاقی ہے جو سماج کو تنزلی اور بربادی کی جانب
لے جاتا ہے۔اگر ہم جنسی بداخلاقی کی بات بھی کریں تو بدقسمتی سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اخلاق
اور شرم وحیا سکھانے کے دعویدار مذہبی مدرسوں کے اتالیق ہی اس حوالے سے سب سے اونچے

در بدر پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ آپ کسی مدرسے کے بچوں کا انٹرویو کر کے دیکھ لیجئے، ہر دوسرے بچے کی کہانی اس بات کی تصدیق کرتی دکھائی دے گی۔

ہم صدیوں سے شرم وحیا کے ایک سٹیریو ٹائپ تصور کو مانتے چلے آ رہے ہیں اور اب یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم تیزی کے ساتھ اس قدر سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بات غلط بھی نہیں ہے مگر اس سے کہیں زیادہ یہ بات درست ہے کہ ذرائع ابلاغ نے ہماری جھوٹی شرم وحیا کا پردہ فاش کرنا شروع کر دیا ہے۔ آج سے پون صدی پہلے یہ کام منٹو نے شروع کیا تھا تو سارے نام نہاد شرفا اس اکیلے کے درپے ہو گئے تھے مگر اب تو صورت یہ ہے کہ روزانہ اخبار ہماری 'شرافت' کی کہانیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ آخر شرم وحیا کی دلدادہ اور پر چارک سوسائٹی اپنی اصل میں اس قدر گندی اور متعفن کیوں ہے؟ اور کیا سب اچانک ہونے لگا ہے؟ کیا ہمیں منٹو کا افسانہ 'کھول دو' یاد نہیں جس میں رضا کار نوجوان جو بظاہر مسلمان مہاجروں کی خدمت کا نیک فریضہ سرانجام دے رہے تھے، اپنی ہی قوم کی معصوم لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ تقسیم کے وقت اگر ہندوؤں اور سکھوں نے ہماری ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی عزتیں لوٹی تھیں تو کیا ہم نے ایسا نہیں کیا تھا؟ تب تو صرف اخبار ہوتے تھے یا افسانہ نگار۔ اور وہ بھی چیدہ چیدہ واقعات ہی سامنے لاتے تھے۔ مگر آج بھی صورت حال یہ ہے کہ بے شمار واقعات پولیس کے پاس رپورٹ ہی نہیں ہوتے۔ پھر بھی جو رپورٹ ہوتے ہیں وہ ہمارے اجتماعی چہرے کو بہت بگڑا ہوا دکھاتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے شرم وحیا کے حقیقی تصور کو سمجھا ہی نہیں اور اس بے سوچے سمجھے تصور پر سوسائٹی کو زبردستی گامزن رکھنے کی خواہش کے نتیجے میں ہمیں ایسے بدنما ردعمل کا سامنا ہے کہ اس سے نمٹنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی۔

درست رشتوں کی تلاش میں والدین کی ناکامی

ہمارے ہاں شادی ایک الجھا ہوا مسئلہ ہے جس میں فیصلے کے وقت اصل اور مرکزی کرداروں یعنی لڑکے اور لڑکی کو حتی الامکان الگ تھلگ رکھا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں عمومی طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دونوں (خاص طور پر لڑکی) اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے

جبکہ خاندان کے بزرگ اس معاملے کے ہر پہلو کو بہترین انداز میں جانچ سکتے ہیں۔ پاکستان میں ناخوش اور زبردستی کی شادیوں کی کثیر تعداد اس تاثر کو سراسر لغو ثابت کرتی ہے۔ کئی بار تو یوں بھی ہوتا ہے کہ اولاد کے پیدا ہوتے ہی ان کے رشتے طے کر دیئے جاتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ ہمارے ہاں والدین اپنے ذاتی تجربات سے گزرنے کے باوجود اس دانش سے تقریباً تہی ہوتے ہیں جو اولاد کے لئے مناسب رشتوں کی تلاش کے لئے درکار ہوتی ہے۔ وہ صرف چند گنی چنی مگر گھسی پٹی باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ جیسے کہ لڑکے اور اسکے گھر والوں کی سماجی اور معاشی حیثیت اور لڑکے کا ظاہری کردار۔ جو لوگ برادری ازم اور فرقہ بندی کی جکڑ میں ہوتے ہیں وہ ان دونوں معاملات کی بھی شرط کی حد تک پابندی کرتے ہیں۔ اکثر والدین ان معاملات کی چھان پھٹک خود کرنے کی بجائے اپنے اعتبار کے لوگوں پر انحصار کرتے ہیں۔ شادی ناکام ہو جانے کی صورت میں یہ بااعتبار وچولا ہی سب سے زیادہ دشنام اور بددعاؤں کا مستحق ٹھہرتا ہے کہ اس نے رشتہ کرواتے وقت فلاں فلاں بات کیوں چھپائی تھی۔

بہو کی تلاش میں اسکی خوبصورتی اور خاندانی حیثیت سامنے رکھے جاتے ہیں۔ ساس اور نندیں جس لڑکی کو بیاہ کر گھر لانے سے پہلے اس پر واری صدقے جا رہی ہوتی ہیں، شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی ان کے نزدیک وہ ایک چڑیل ثابت ہوتی ہے اور پھر ہر ملنے جلنے والے کے ساتھ اس کا رونا رویا جاتا ہے۔ دوسری طرف وہی چڑیل دیوروں اور سسر کے نزدیک قدرے ایک نارمل انسان ہوتی ہے۔ بلکہ کئی بار تو بیوی کے ہاتھوں ستائے ہوئے سسر کو اپنی زندگی پہلے سے زیادہ دلکش محسوس ہوتی ہے۔

ازدواجی خوشی سے محروم بری ساس

عام طور پر ایسی عورتیں بری ساس ثابت ہوتی ہیں جن کی اپنی ازدواجی زندگی خوشی اور اطمینان سے محروم ہوتی ہے۔ ان کے لئے بیٹے کا ایک اجنبی لڑکی سے التفات جلاپے کا کام کرتا ہے۔ انہیں رہ رہ کر جنسی لطف سے اپنی محرومی کا احساس تنگ کرتا ہے۔

ہمارے محلے میں ایک ادھیڑ بیوہ رہا کرتی تھی جس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کی پڑوسن نے ایک روز

فطرت اور شرم وحیا

کیا شرم وحیا کا تصور فطری ہے؟

سیکس کی خواہش عین فطری ہے جبکہ عریانی کا تصور، فحاشی اور شرم وحیا سماج کی پیداوار ہیں۔ یہ ہم اس لئے نہیں کہہ رہے کہ جانور بے لباس گھومتے ہیں بلکہ دنیا میں کئی قبائل آج بھی ایسے ہیں جو کپڑے پہننے کا تصور نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کے ہاں عریانی کا فحاشی کے احساس یا شرم وحیا کے جذبے سے کوئی تعلق ہے۔ تہذیب یافتہ معاشروں میں ایک بات مشترک ہے کہ انہوں نے ہزار ہا برس سے چند انسانی اعضاء کے ساتھ شرم وحیا کے ساتھ ساتھ فحاشی کا تصور بھی وابستہ کر رکھا ہے مگر فرق یہ ہے کہ مغربی معاشروں میں ان اعضاء کا تذکرہ نارمل انداز میں کرنا ممکن ہے جبکہ مشرقی معاشرے ان اعضاء سے متعلق معاملات پر بات کرتے ہوئے بری طرح جھینپ جاتے ہیں۔ ایک بات ذہن میں رہے کہ ہم جن اعضاء کی بات کر رہے ہیں ان سے صرف جنسی لطف وابستہ نہیں بلکہ وہ بول و براز کے اخراج کا ضروری فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم نے عورت کے پستانوں کو بھی ان اعضاء کی فہرست میں شامل کر رکھا

ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اکثر شادی شدہ عورتیں یا انکے شوہر حضرات بریزئیر خریدتے ہوئے بھی شرمندگی محسوس کرتے ہیں کہ مبادہ دوکاندار کے دھیان میں کوئی اور ہی منظر لہرا جائے۔

سینے کو ملفوف رکھنے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ ان سے مرد جنسی حظ اٹھاتا ہے۔ اگر عورت کے سینے کو چھپانے کے لئے اس دلیل کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر ہمیں عورت کے لبوں کو بھی ملفوف رکھنا ہوگا کیونکہ مرد ان سے بھی بے اندازہ جنسی حظ اٹھاتا ہے۔ عورت کے سینے کی جنسی لطف کے حوالے سے حیثیت اپنی جگہ مگر اس کی اصل اہمیت تو نومولود بچے کی خوراک کے حوالے سے ہے۔ انڈیا میں بھیل نام کا ایک قبیلہ ہے جہاں ماضی قریب میں کنواری لڑکی کی نشانی ہی یہ تھی کہ وہ بدن کے اوپر والا حصہ بالکل عریاں رکھتی تھی جبکہ شادی شدہ عورت کے لئے اسے ڈھانپنا ضروری تھا۔ (ممکن ہے شادی شدہ عورت کے پستان بچوں کے دودھ کے برتن سمجھے جاتے ہوں جنہیں گرد و غبار سے بچانے کے لئے ڈھانپنا ضروری سمجھا جاتا ہو۔)

یہاں بحث قطعاً یہ نہیں ہے کہ شرم و حیا کا جذبہ اچھا ہے یا برا، بلکہ صرف یہ باور کروانا مقصود ہے کہ عریانی اور فحاشی فطری نہیں بلکہ سماجی اور اضافی تصورات ہیں جن کی حدود ہر سوسائٹی میں مختلف ہیں۔ جیسے کہ مغرب میں شریفانہ لباس کا رائج تصور ہمارے ہاں عریانی اور فحاشی سمجھا جاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اس سے ملتا جلتا فرق ہمارے ہاں مذہبی سوچ کی حامل مڈل کلاس اور ایلیٹ کلاس کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مڈل کلاس میں بھی لباس اور پردے کی قدامت اور جدت کے کئی شیڈز پائے جاتے ہیں۔ شرم و حیا کے بارے میں جامد تصورات کو توڑنے کے لیے لازم ہے کہ دنیا میں موجود دوسرے خطوں کے معاشروں کے رہن سہن پہ بھی ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ ہم جان سکیں کہ شرم و حیا کے جس تصور کو ہم ازلی اور ابدی سمجھے بیٹھے ہیں وہ حقیقت سے لگا نہیں کھاتا۔

سترہویں صدی کا پرشین تاریخ دان بلوچ مین آسام اور کوچ بہار کے بارے میں لکھتا ہے کہ

> ''آسام کے جنوبی پہاڑوں میں رہنے والے ناگا قبائل کے افراد مویشیوں کی طرح ننگ دھڑنگ پھرتے ہیں۔ مرد گلیوں اور بازاروں میں عورتوں سے کھلے عام جنسی فعل

کر ڈالتے ہیں اور کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ قبیلہ کے سردار بھی گاہے گاہے یہ منظر دیکھتے ہیں، تاہم عورتیں اپنے پستان ڈھانپے رکھتی ہیں۔"

چارلیواکس، ہسٹری آف پراگوئے میں لکھتا ہے کہ یہاں کے لوگ وہ کام بھی سرعام کرتے ہیں جو مکمل تنہائی میں کرنے والے ہوتے ہیں۔ کیپٹن کک نیوزی لینڈ کے قبیلہ ماوری کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کے غیر شادی شدہ افراد اپنے گانوں، رقص اور گفتگو میں انتہائی فحش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن زندگی کے عام معمولات جیسے مجالس اور گاڑیوں میں سفر کے دوران اتنے ہی مہذب ہوتے ہیں جتنا کہ یورپ کے کسی ترقی یافتہ ملک کے لوگ ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیگمین برٹش نیوگنی کے جنوب مشرقی حصے کے مشاہدات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ غیر شادی شدہ لڑکیوں اور لڑکوں کو اگرچہ میل ملاپ کی خاصی آزادی ہے مگر ان کے رویئے میں کوئی آوارگی نہیں پائی جاتی۔ بلکہ یہ یورپین نوجوانوں سے زیادہ شائستہ مزاج ہیں۔

جوکیلسن اپنی کتاب 'یوکاغز' میں بیان کرتا ہے کہ سائبیریا کے قبیلے یوکاغر میں باوجود اس کے کہ فحش کاری عام ہے لیکن لوگوں کی گفتگو ننگے الفاظ اور جملوں سے بالکل پاک ہوتی ہے۔

ایک اور مورخ نسمین کے مطابق اگر مغربی افریقہ کے کسی پنگوے نیگرو سے جنسی موضوع پر گفتگو کریں تو وہ بار بار Oson, Osen کہے گا، جس کا مطلب ہے "شرم کرو شرم کرو"۔ گھانا کے دارالحکومت کے حبشیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے فحش اور بے ہودہ ڈانسز میں بدنامی کی حد تک شہرت رکھنے کے باوجود خواتین کے ساتھ انتہائی ادب اور احترام سے پیش آتے ہیں۔

سماجی روایات کے تجزیئے کا معاملہ بہت دلچسپ اور حیران کن بھی ہے اور مشکل بھی۔ عموماً ان کو سمجھتے ہوئے ہماری عقل گمراہ ہو جاتی ہے۔ روایات راسخ ہوتے ہوتے کئی نسلیں گزر جاتی ہیں اور تب وہ اجتماعی نفسیات وجود میں آتی ہے جو انہیں سب سے اعلیٰ، درست اور روائی مان کر ان پر ایمان جیسا یقین کر لیتی ہے۔ اس نفسیات کے لیے اس بات کو تسلیم کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتا ہے کہ کسی دوسرے خطے کی روایتیں ان کی سوسائٹی سے برعکس بھی ہو سکتی ہیں۔ اور اگر وہ اس تضاد کو تسلیم کر بھی

... ہے کہ یہ روایات کسی صورت نیک اور اچھی سوسائٹی کو جنم دے سکتی ہیں۔ خاص طور پر ایک مذہبی سوسائٹی تو ایسے معاشروں پر فوراً جہالت، فحاشی اور جنسی کا ٹیگ لگا دیتی ہے۔ ہاں البتہ ایک سوال جس پر غور کیا جانا بہت ضروری ہوتا ہے، اسے بالکل نہیں چھیڑا جاتا۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ اپنی جن روایات کو ہم نے اعلیٰ اور بہترین ہونے کا سرٹیفکیٹ دے رکھا ہے کیا وہ ہمارے معاشرے کو ذہنی اور اخلاقی ترقی دینے کا باعث بن رہی ہیں؟ کیا وہ ہماری زندگی کو سہل اور آسان بنا رہی ہیں؟؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو کیا کہنے، لیکن اگر جواب اس کے برعکس ہے تو پھر سوچنا پڑے گا کہ کہیں ہماری نیکی اور بدی کے معیاروں میں گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔

دیکھنا یہ ہے کہ اگر ہم سے مختلف معاشروں میں سکون اور خوشی کی کیفیت ہے تو سمجھ لیجئے کہ ان کی اخلاقیات اور سماجی رسم رواج ان کی اجتماعی نفسیات کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہیں۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جسے سمجھنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ہمارے تئیں فحاشی کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ یہ کسی بھی سماج کو بے راہروی کا شکار کر کے تباہ کر دیتی ہے۔ خود ہمارا اپنے بارے میں یہ خیال ہے کہ ہم مغرب کے تتبع میں تیزی کے ساتھ اخلاقی تباہی کی جانب گامزن ہیں۔ مغرب کیا ہمارا تو پڑوسی ملک بھارت کے متعلق بھی یہی خیال ہے۔ چین کے بارے میں ہم بوجوہ خاموش ہیں جبکہ وہاں شادی کا ادارہ تقریباً خاتمے کے قریب ہے اور مزید یہ کہ وہ تو کسی الہامی مذہب کے پیروکار بھی نہیں۔

ایک طرف صورتحال یہ ہے کہ ہمیں اپنی اخلاقی روایات پر تعلّی کی حد تک مان ہے اور ہم دنیا کی کسی قوم کو خاطر میں نہیں لاتے مگر دوسری طرف حالت یہ ہے کہ ان اعلیٰ ترین روایتوں کے باوجود ہم ہر میدان میں راندۂ درگاہ ہیں۔ جبکہ جن مغربی اقوام پر ہم شرم و حیا سے عاری اور بدترین فحاشی کے مرتکب ہونے کا الزام عائد کرتے ہیں، باوجود نفرت کے نہ صرف ان کی ترقی کو آئیڈیلائز بھی کرتے ہیں بلکہ ان ممالک میں کسی بھی قیمت پر مہاجرت کے لیے مرے جاتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اپنے بے سوچے سمجھے اور ناقابلِ عمل اخلاقی معیاروں کے نتیجے میں منافقت اور بے اطمینانی کے سوا کچھ نہیں کمایا۔ اور یوں نہ صرف خود اپنی بلکہ اپنی اولادوں کی زندگیوں کو بھی اجیرن

بنا رہے ہیں۔ ہمیں ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں ہمارے بچے 'خراب' نہ ہو جائیں، کہیں وہ ہمارے ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بچے واقعی بڑی تیزی کے ساتھ 'خراب' ہو رہے ہیں، ہمارے ہاتھوں سے نکل رہے ہیں۔ انٹرنیٹ کی بدولت آج ان کی دسترس میں وہ کچھ ہے جس کا پرانی نسل گمان بھی نہیں کر سکتی تھی۔ موبائل میں ایسی ایپلیکیشن موجود ہیں جن کی مدد سے اپنی پسند کے سیکس پارٹنر تک با آسانی رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

ہمیں سوچنا ہوگا کہ کیا اولاد کو اپنے فیصلوں کی آزادی دینا اور خاص طور پر جیون ساتھی کے انتخاب کی آزادی فحاشی بڑھانے کا باعث ہوگی یا کم کرنے کی۔ اور ہم شرم و حیا کے جس تصور کو گلے لگائے بیٹھے ہیں اور اسے خاص طور پر اپنی بیٹیوں پر بزور مسلط کر رکھا ہے، کیا وہ ان کی شخصیت کو برباد نہیں کر رہا؟ کیا اس طرح وہ شکاری مردوں کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہو رہیں؟؟

منافقت اور تجسس

جنسی خواہش اور ہماری منافقت

سیکس کے تصور کے بارے میں ہمارے رویئے انتہا کی حد تک منافقانہ ہیں جن کا تجزیہ کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سیکس کے بارے میں ہمارے الجھے اور بگڑے تصورات نے زندگی کے جملہ مسائل کے متعلق ہماری انفرادی اور اجتماعی تفہیم کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ منافقت کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی سیکس کو سوچنے اور اس سے لطف اٹھانے کا شوق رکھتا ہے مگر اس حقیقت کے اعتراف سے ذھنائی کی حد تک انکاری ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مرد ہونے کے ناطے ہم عورت کی کشش سے نہیں بچ سکتے۔ ہم خود پر تہذیب اور اخلاقیات کے کتنے ہی غلاف چڑھائے پھریں مگر پرکشش عورتوں کی طرف متوجہ ہوئے بغیر رہ نہیں سکتے۔ اور یہی بات عورتوں پر بھی صادق آتی ہے۔ یہ سب عین فطری ہے۔ لیکن ہم نے اپنی فطرت کو احساسِ جرم سے لتھیڑ لیا ہے۔ سماج نے مذہب اور سماجی روایات کے نام پر عورت اور مرد پر ایک دوسرے کا بدن دیکھنے پر کڑی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں مگر دل چوری کی خواہش سے لبریز ہیں۔ ہاں یہ الگ بات کہ اس چوری کا اعتراف کرنے کی کسی کو بھی ہمت نہیں ہوتی۔ پاکستان کا شائد ہی کوئی ایسا شہر یا قصبہ ہوگا جہاں مرد عورتوں کو رسی ہوئی غلیظ نظروں سے نہ گھورتے ہوں۔ ایک مسلسل کشمکش ہے جو ہمارے اعصاب کھائے جاتی

ہے۔کیا یہ ایک قابلِ رحم صورتحال نہیں ہے؟

سیکس کے بارے میں بے جا تجسس

سیکس کے بارے میں انسان کی دلچسپی اور تجسس ایک فطری بات ہے مگر بدقسمتی سے ہماری سوسائٹی میں سوائے چھوٹے بچوں اور عقل وخرد سے بیگانہ افراد کے ہر کوئی سیکس کے بارے میں ضرورت سے زیادہ متجسس اور حساس ہے۔ پوری سوسائٹی کے اعصاب پر بیماری کی حد تک سوار اس موضوع کو سنجیدگی کے ساتھ نا صرف زیرِ بحث لانے کی اعلانیہ اور غیر اعلانیہ ممانعت ہے بلکہ اسے گندگی سے بھرا گٹر سمجھ کر اس پر ہمہ وقت ڈھکن رکھنے اور جھوٹی شرافت اور مصنوعی اخلاقیات کا پاؤڈر چھڑکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔کسی اجنبی ماحول یا محفل میں سیکس کا تذکرہ چھڑ جائے تو ہمارے کان کھنچ کر تذکرہ کرتی زبان کی نوک پر جا بیٹھتے ہیں مگر ہماری اپنی زبان پر لاحول کا ورد جاری ہو جاتا ہے۔ لاحول کا یہ ورد جھوٹی شرافت کے ناٹک کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارا اس محفل سے اٹھنے کو بالکل جی نہیں چاہتا مگر جھوٹے بھرم کے لئے ہمیں وہ محفل چھوڑنی پڑتی ہے۔شرافت کا یہ ناٹک ہمارا سارا مزہ کرکرا کر دیتا ہے۔ایسی محفلوں میں ہمارا وجود دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ایک وجود ہمارے قدم جکڑتا ہے اور دوسرا وجود ہمیں محفل سے باہر کھینچتا ہے۔

ہاں بے تکلف دوستوں کی سنگت میں یہ دوئی ازخود ہو جاتی ہے۔وہاں ہمارا سارا وجود ایک ہو جاتا ہے اور ہمیں شرافت کا ناٹک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی۔ہم اپنی نام نہاد شرم وحیا کے کم وبیش سبھی لبادے کھونٹی پر ٹانگ دیتے ہیں۔گندے سے گندا لطیفہ پورے ذوق وشوق سے سنا اور جوش سے سنایا جاتا ہے۔تب ہمیں یاد بھی نہیں رہتا کہ ہم فحاشی کی دلدل میں کتنا گہرا اتر چکے ہیں۔

یہ ہیں ہم جو دو دو زندگیاں جیتے ہیں۔ایک جھوٹ کی جو بڑی پاکیزہ اور صاف ستھری ہے اور دوسری سچ کی جو سرتاپا فحاشی کی خواہش سے لت پت ہوتی ہے،مگر المیہ یہ کہ ایک زندگی سراسر بدمزہ اور جھوٹ کے بوجھ تلے سسکتی ہوئی اور دوسری مزے اور لطف سے بھرپور مگر گناہ اور گندگی کے احساس سے لتھڑی ہوئی۔ہم خدا کی خوشنودی کے حصول اور وصالِ صنم کی خواہش کے درمیان جھولتے رہتے ہیں،مگر نہ

خدا ملتا ہے اور نہ ہی صنم کا وصال نصیب ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جو عمل نسلِ انسانی کو آگے بڑھانے کا اہم ترین وظیفہ ہے اس سے ہم نے فحاشی جیسا گھٹیا نایئا اور اخلاق سے گرا ہوا تصور کیوں وابستہ کرلیا ہے؟ کیا سیکس پیٹ کی بھوک، نیند اور رفع حاجت کی طرح ہی ایک ناگزیر مگر اس سے کہیں ارفع ضرورت نہیں ہے؟ اور سوال تو یہ بھی ہے کہ کیا اس ناگزیر ضرورت کو ایک جائز حد سے زیادہ دبانا یا روکنا ممکن ہے؟ مسئلہ یہ نہیں کہ سماج کے بالغ افراد ان سوالات سے واقفیت نہیں رکھتے یا انہیں یہ سوال پریشان نہیں کرتے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ بے سوچی سمجھی بنیاد پر ہونے والی تربیت کی وجہ سے ان سوالات کو اٹھانے سے گریزاں ہیں۔ کیونکہ انہیں یہی بتایا اور پڑھایا گیا ہے کہ اس موضوع پر گفتگو کرنا بدمعاشی کے مترادف ہے۔ اگرچہ ہر فرد جانتا ہے کہ وہ اپنی جنسی خواہش کو کن کن ذرائع سے با آسانی یا انتہائی مشکل میں پڑ کر کیسے پورا کرتا ہے اور پھر اسے ایک گندا راز سمجھ کر کس کس سے کس طرح چھپاتا ہے۔

سیکس کی خواہش سے مملو مگر خوفزدہ سوسائٹی

ہم بیک وقت جنسی جذبے کی منہ زوری کے ہاتھوں مجبور بھی ہیں اور اس سے خوف زدہ بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس جذبے کی منہ زوری نے ہماری عقل کو اس حد تک معطل کر دیا ہے کہ ہم اس اہم ترین انسانی طاقت یا صلاحیت کو سمجھنے میں مکمل طور پر ناکام ہیں اور اسے ایک سیلاب بلاخیز جان کر اس پر الٹے سیدھے طریقوں سے بند باندھنے میں لگے ہیں۔ مگر سیلاب ہے کہ کسی طور تھمتا ہی نہیں بلکہ ہمارے گھروں کے اندر تک مار کر رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سیکس کی ناقد تفہیم نے والدین اور سوسائٹی کے نوجوانوں کی نیندیں اڑا رکھی ہیں۔ اس مسئلے سے نمٹنے کے لئے جو اخلاقیات ہمیں پڑھائی اور سمجھائی جاتی ہیں وہ اکثر کارگر نہیں ہوتیں۔

سماجی اخلاقیات ہمیشہ دو بنیادوں پر استوار ہوتی ہیں۔ ایک مذہبی تعلیمات اور دوسرا سماجی روایات۔ یہ ایک ستم ظریفانہ حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں جو ادارے مدرسوں کی شکل میں خالص مذہبی تعلیم فراہم کرتے ہیں وہاں جنسی اخلاقیات کی دھجیاں اڑانے کا چلن عام ہے۔ اس کام میں ملوث مُلا حضرات

کے ضمیر کا یہ عالم ہے کہ وہ اس فعل میں ملوث ہونے پر کسی بھی طرح کی ندامت محسوس نہیں کرتے۔

ہماری سوسائٹی میں بہت سے ایسے متشرع اور باریش افراد پائے جاتے ہیں جو ملت الشائخ کی عادت میں نہ صرف مبتلا ہوتے ہیں بلکہ اس کا شرعی جواز گھڑنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔

یہ تو خیر ایسے افراد کا تذکرہ تھا جن کا ضمیر وقت کے ساتھ ساتھ کسی بھی طرح کی خلش سے مبرا ہو جاتا ہے مگر اصل المیہ تو ان افراد کا ہے جو اس جذبے کے ہاتھوں بے بس ہو کر اس کی تسکین کا جو بھی رستہ اختیار کرتے ہیں وہ انہیں احساسِ گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ المیہ یہ کہ انہیں اپنے اردگرد ایک بھی ایسا فرد دستیاب نہیں ہوتا جسے وہ اپنی روداد سنا کر گناہ کے احساس کو کم کر سکیں۔ ایسے میں وہ اکثر عبادات میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ خشوع وخضوع کی یہ عبادات وقتی طور پر انہیں عجیب قسم کی تسکین فراہم کرتی ہے مگر جب گناہ کا احساس مدھم پڑنے لگتا ہے تو عبادات اپنا لطف کھونے لگتی ہے۔ جنسی جذبہ جو کہ وقتی طور پر احساسِ جرم کے بھاری پتھر تلے دب گیا ہوتا ہے، گناہ کی شدت کا احساس کم ہوتے ہی پھر سے عود کر آتا ہے۔ انسان کا بار بار کا تجربہ اسے ایک ہی بات بتاتا ہے کہ اس جذبے کا علاج عبادات سے بھی ممکن نہیں۔

مذہبی معاشرے میں فرد کا ضمیر براہِ راست مذہبی احکامات اور خدا کی ہمہ وقت نگرانی کے تصور اور اس سے جنم لینے والے خوف سے منسلک ہوتا ہے۔ جہاں تک سماجی روایات کا تعلق ہے ان کا پالن صرف سماج کے سامنے کیا جاتا ہے جبکہ تنہائی میں ان کی خلاف ورزی ضمیر پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالتی۔ مطلب یہ ہوا کہ کسی مذہب کو ماننے والے سماج میں صرف مذہبی اقدار میں ہی اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ تنہائی میں ضمیر کا کردار ادا کریں اور فرد جن باتوں کو گناہ سمجھتا ہو ان سے ہر حال میں باز رہے۔ مگر عام مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ مذہبی اقدار کا بظاہر بہت ہی مضبوط بندھن بھی اکثر افراد کی تنہائی میں کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتا ہے۔

جب ہم جنسی جبلت کی منہ زوری کو سمجھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو ہم اسے 'شیطان' کا نام دے دیتے ہیں۔ یعنی ایک ایسی قوت جو خدا جیسی عظیم الشان قوت کے مقابل برسرِ پیکار ہے اور جس کا کام ہمیں

خیر کے راستے سے بھٹکانا اور گمراہ کرنا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایسے لمحوں میں خدا شیطان کے مقابلے میں بے انت قوت کے ساتھ حاضر ناظر ہونے کے باوجود 'گناہ' کی جانب بڑھتے ہوئے انسان کے قدموں کو شر سے خیر کی جانب نہیں موڑتا۔ سچ تو یہ ہے کہ شیطان کی یہ کہانی اس مسئلے کی منہ زور طاقت کو سمجھنے اور اس سے نمٹنے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرتی۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ یہ نسخہ کارگر ہو یا ناکام ہم اپنے بچوں کو یہی سبق پڑھاتے رہیں گے اور سارا الزام کسی ان دیکھے شیطان پر دھرتے رہیں گے۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلے کو ایک ان دیکھی طاقت یعنی 'شیطان' کے کھاتے میں ڈال کر آنکھیں موند لی جائیں اور اس قیامت کے دن کا انتظار کیا جائے جب ہماری نیکی اور بدی کے کھاتے کھولے جائیں گے۔ اس انتظار میں کوئی مضائقہ نہیں ہاں اگر ایسا کرنے سے ہماری موجودہ زندگی جہنم میں تبدیل ہونے سے بچ سکے تو۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس معاملے میں اذیت اور خوف کا جہنم مسلسل ہماری زندگی کو لپیٹ میں لئے جا رہا ہے۔ ہم اکثر سب کچھ کرتے ہیں، احساسِ گناہ کے ساتھ یا بنا اس احساس کے۔ اور سب کچھ کرنے کے باوجود ہم اپنی ذات کے بارے میں کسی بڑے خوف کا شکار نہیں ہوتے۔ ہاں کبھی کبھی عاقبت کا خوف ضرور تنگ کرتا ہے مگر یہ احساس بھی بہت جلد اپنی گرفت ڈھیلی کر دیتا ہے۔ لیکن جب ہم اپنی اولاد یا چھوٹے بہن بھائیوں کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمارے ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے ہیں۔ ہم ایک سخت گیر ناصح کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اگر کوئی واقعہ ہو جائے تو ان پر تشدد سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایسا کرتے وقت ہم یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس رویئے سے مسائل حل ہونے کی بجائے مزید مریضانہ صورت اختیار کر لیں گے۔

ہمارے ہاں غیرت کے نام پر قتل عام ہوتے جا رہے ہیں جن میں صرف مرد ہی ملوث ہوتے ہیں۔ ان قاتلوں سے کوئی نہیں پوچھتا کہ بھائی تمہارا نامۂ اعمال کیا ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی کی بہن یا بیٹی کو بری نگاہ سے نہیں دیکھا؟ کیا تم نے موقع پا کر کسی کی عزت پامال نہیں کی یا تم نے کبھی اس بازار کا رخ نہیں کیا جہاں تمہاری بہنوں اور بیٹیوں جیسی عورتیں اور لڑکیاں ہی تمہاری تسکین کے لئے بے لباس ہوتی

ہیں۔ کیا تمہاری جنسی تسکین کا غلط یا جائز طریقے سے مداوہ اس بنیاد پر روا سمجھا جائے کہ تم مرد ہو؟ سچ تو یہ ہے کہ اگر ان 'غیر تمند' قاتلوں کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو یہ سب کے سب عادی مجرم نکلیں گے جن کے نامۂ سیاہ میں ہر طرح کے اخلاقی عیب لکھے ہوں گے۔

سیکس کا جذبہ جرم نہیں اور نہ ہی اس کی تسکین کوئی جرم ہے مگر سوسائٹی نے اس معاملے کو غلط اور جاہلانہ تفہیم کی وجہ سے جرم اور گناہ کے ہم معنی بنا دیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم نے اس سیلاب پر بند باندھنے کے جتنے بھی جتن کئے ہیں ایک ایک کر کے سب ناکام ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ شائد ہم سرجری کے کسی ایسے طریقے کی تلاش میں ہیں جس کے ذریعے ہم اپنے سوا ہر دوسرے شخص کے بدن سے جنسی جبلت کے غدود نکلوا دیں۔ یا پھر ہم اخلاقی ضابطوں کو تالہ بند لوہے کے لباس میں ڈھال لیں جو اپنی خاندان کی بی بیوں اور بیٹیوں کو اوڑھائے جا سکیں۔ جن کی چابیاں اس وقت تک ہمارے قبضے میں رہیں اور جب تک ان کا ہاتھ شادی کے نام پر ہم اپنی مرضی سے ڈھونڈے ہوئے مرد کے ہاتھ میں نہ تھما دیں۔

سچ پوچھیں تو یہ صورتحال کسی بھی لڑکی کے جملہ افرادِ خانہ کے لیے کسی مسلسل عذاب جیسی ہے۔ مڈل کلاس گھرانے کی بچی جیسے ہی بلوغت کی عمر کو پہنچتی ہے، گھر کا ہر بڑا خود کو اس کے نگران کے منصب پر فائز کر لیتا ہے۔ وہ بھائی جو خود لڑکیوں کو اپنا موبائل نمبر دینے کی خاطر گرلز کالج کے سٹاپ پر کھڑی لڑکیوں کے گرد منڈلاتا ہے، یا کسی مس کال کے ذریعے سلسلۂ جنبانی کا منتظر ہوتا ہے یا اوس پڑوس میں تانک جھانک کرتا ہے، یا کسی 'آنٹی' کی نظرِ کرم کا متلاشی ہوتا ہے، اپنی جوان ہوتی بہن، بھانجی یا بھتیجی کو اپنے جیسے کسی دوسرے 'بدکردار' سے بچانے کے لیے ہمہ وقت الرٹ رہتا ہے۔ صرف بھائیوں پر ہی کیا موقوف، اماں، ابا، دادا، دادی، چاچے، تائے، سبھی کا سکون سولی پہ ٹنگا رہتا ہے تاوقتیکہ کہ لڑکی کو اس کے سسرال کی سپرداری میں نہ دے دیا جائے۔ مگر اس سپرداری کی بھی ایک بڑی قیمت ہے جسے جہیز کہتے ہیں۔

ماسٹربیشن

ایک پوشیدہ مگر کامن پریکٹس

بہت کم لوگ یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوں گے کہ وہ ماسٹربیشن کرتے ہیں مگر ان کے انکار سے یہ حقیقت بدل نہیں جائے گی کہ ننانوے فیصد افراد اس عمل سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ایک فیصد وہ ہیں جو ایسا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ انسانی خوشی کی دشمن اخلاقیات میں جکڑی سوسائٹی کے افراد کے لئے ماسٹربیشن جنسی جذبات کے نکاس کے لئے ایک انتہائی محفوظ راستہ فراہم کرتی ہے۔ ایک ایسی سوسائٹی جہاں عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی، مگر دونوں ایک دوسرے کی پہنچ سے دور ہیں۔ ہاں البتہ اپنی محفوظ تنہائی کے غار کو کسی بھی عورت کے تصور سے جب چاہے بآسانی آباد کیا جا سکتا ہے۔

کون ایسے والدین ہوں گے جو اپنے لڑکپن میں اس تجربے سے نہیں گزرے ہوں گے بلکہ شائد آج اپنی ادھیڑ عمری میں بھی کبھی کبھار اس عمل کی طرف مائل ہو جاتے ہوں گے۔ اس کی وجوہات کیا ہیں یہ وہ خود بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ اصل مسئلہ اب ان سے کہیں زیادہ ان کی جوان ہوتی ہوئی اولاد کا ہے جو یقیناً اپنے بدن میں پیدا ہونے والے جنسی ہیجان کے ہاتھوں مجبور ہو کر ماسٹربیشن کے احساس

جرم سے لتھڑے تجربے سے گزر رہی ہے۔ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے اکثر والدین اس گمان میں رہتے ہیں کہ نہیں ان کے بچے ان سے مختلف ہوں گے۔ اور یوں وہ اولاد سے متعلق اپنی ذمہ داری سے نظریں چرا لیتے ہیں۔

ماسٹربیشن سے جنم لینے والے عمومی نفسیاتی مسائل

ماسٹربیشن جسمانی حوالے سے کوئی نقصان دہ عمل ہرگز نہیں بشرطیکہ اعتدال میں رہے۔ ہاں مگر اس عمل کے بعد پیدا ہونے والے احساسات جیسے کہ احساسِ گناہ اور صحت کی فکر، اپنے برے اثرات ضرور مرتب کر سکتے ہیں۔ مذہبی علماء اس پر یکسو نہیں ہیں کہ یہ فعل جائز ہے یا ناجائز۔ اس معاملے میں قرآن سے کوئی براہِ راست حوالہ دستیاب نہیں ہے۔ اس بارے میں جن احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے وہ بھی مشکوک اور موضوع مانی جاتی ہیں۔ ویسے بھی علماء کی سوچ کے ساتھ ایک ستم ظریفی یہ ہے کہ انھیں کسی بھی مسئلے پر عقل اور تجربے کی روشنی میں سوچنے کی بجائے اس بات سے زیادہ غرض ہوتی ہے کہ قرآن وحدیث کی نظر میں یہ ثواب ہے کہ گناہ۔ اگر عقلی پرکھ کے ساتھ جائزہ لیں تو کہا جا سکتا ہے کہ ماسٹربیشن اگرچہ جسمانی صحت کے لئے کوئی نقصان دہ عمل نہیں مگر علم اور تجربے سے خالی سوچ اور سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر اسکے اثرات میں کئی طرح کی نفسیاتی کجیاں ضرور شامل ہو سکتی ہیں جن کا اثر ازدواجی زندگی پر ضرور پڑ سکتا ہے۔

میں ایسے بہت سے نوجوانوں سے مل چکا ہوں جن کا خیال تھا کہ وہ نہ صرف گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں بلکہ تیزی کے ساتھ جنسی صحت بھی کھو رہے ہیں۔ کئی ایک نے بڑی بے چارگی سے کہا کہ وہ اس 'قبیح عادت' سے چھٹکارہ چاہتے ہیں اور کئی بار تھوڑے عرصے کے لیے ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں مگر نہ چاہتے ہوئے بھی دوبارہ اس عمل کی جانب لوٹ آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اسے شیطان کے بہکاوے سے منسوب کرتے ہیں جبکہ وہ نہیں جانتے کہ یہ انسانی فطرت کا عین تقاضہ ہے جسے پورا کرنے کے لیے متضاد صنف دستیاب نہ ہو تو پھر یہی ایک راستہ بچتا ہے۔ جو لوگ عبادت گزاری میں دھیان لگا کر اس فعل سے بچ بھی جاتے ہیں تو پھر شیطان ان کے خواب میں کوئی نہ کوئی مہ لقاء بھیج دیتا

ہے اور یوں ان کی تشنہ کام خواہش کو نکاس کا راستہ میسر ہو جاتا ہے۔

عورت سے متعلق حساسیت میں بے جا اضافہ

ماسٹربیشن کرنے والا فرد دراصل عورت کی بجائے عورت کے تصور کے ساتھ سیکس کرتا ہے۔ تصور میں بلائی گئی یہ عورت ایک تابع مہمل کی طرح اس کی ہر خواہش کو پلک جھپکتے میں پورا کرنے پر تیار ملتی ہے۔ وہ اس قدر زود حس ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر جنسی ہیجان پیدا کرنے کے لئے صرف تصور کے سگنل ہی کافی ہوتے ہیں۔ وہ انتہائی سرعت کے ساتھ عورت کے بغیر بھی عورت کے بدن کی لذت کے احساس سے بھر جاتا ہے۔ اس کے بدن کے تار عورت کے خیال سے ہی جھنجھنا اٹھنے کے [illegible] ہو جاتے ہیں۔ گویا جنسی اعضاء کی حساسیت عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ شادی کے مرحلے پر ایسے افراد دوگونہ عذاب کے شکار ہوتے ہیں۔ ایک تو جیتی جاگتی عورت کو چھونے کی شدید خواہش اور دوسرا عورت کے قابل نہ ہونے کا خوف۔ کبھی کبھی تو ایسے لوگوں کے لئے شادی کا فیصلہ ڈراؤنے خواب میں بدل جاتا ہے۔ ایسے کئی افراد عین شادی والے دن گھر سے غائب ہو جاتے ہیں مگر گھر والوں کو اصل وجہ کا علم نہیں ہوتا۔ یہ افراد کبھی کسی مستند ڈاکٹر سے رجوع نہیں کرتے بلکہ ان کیلئے سب سے تسلی بخش پناہ گاہ جھوٹی شہرت کے حامل حکیم یا سنیاسی بابوں کے کلینک ہوتے ہیں، جو اپنے دام میں پھنسے شکار کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ انھیں مکمل امید ہوتی ہے کہ حکیم صاحب یا سنیاسی بابا کی جڑی بوٹیاں اور کشتے ان کی اپنے ہاتھوں لٹائی ہوئی جوانی واپس لوٹا دیں گے مگر مہینوں کے علاج کے بعد بھی صورتحال کی گھمبیرتا میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

آج سے کم و بیش تیس برس پہلے میرے ایک دوست جن کا سارا گھرانہ حافظِ قرآن ہے، حکیموں کے ناکام علاج کے بعد اس وہم میں مبتلا ہو گئے کہ اب وہ شادی کے قابل نہیں رہے۔ خاندانی تربیت کی وجہ سے موصوف کو کبھی کسی لڑکی کی جانب عملی پیش قدمی کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک محبوبہ تھی جسے وہ میرے ہاتھوں سے لکھے ہوئے رومانی خط ضرور پوسٹ کیا کرتے تھے۔ انہی دنوں ان کی کپڑے کی دوکان پر ایک خاتون کا یک آنے جانے لگی جس کا شوہر کمائی کے سلسلے میں دور دیس گیا ہوا تھا۔ خاتون

نے بڑی چالاکی سے اشارے دیئے کہ وہ ان کی دوکان پر صرف خریداری کے لیے نہیں آتی بلکہ اس کا مسئلہ کچھ اور بھی ہے۔

اگرچہ عورت کے معاملے میں میرے دوست کو اپنی کوتاہ ہمتی کا مکمل یقین تھا مگر وہ عورت ذرا غریب گھرانے کی تھی ،سو انہوں نے سوچا کہ رسک لینے میں کیا ہرج ہے۔ اس واقعے کے اگلے روز جب ملاقات ہوئی تو دوست کی خوشی دیدنی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے خوشی کی وجہ دریافت کرتا ،انہوں نے سارا واقعہ فرفر سنانا شروع کر دیا۔ کہنے لگے کہ یار میں تو یونہی خوف زدہ تھا جبکہ رات اس عورت نے میرے مکمل مرد ہونے کی تصدیق کر دی۔ عجیب بات تھی کہ ایک عورت نے جو بظاہر بدکردار تھی ،میرے زندگی سے مایوس دوست کا اعتماد بحال کر کے اسے دوبارہ زندہ کر دیا۔ اس واقعے کے بعد ہمارے دوست نے پورے اعتماد کے ساتھ لو میرج کی اور اب وہ چار جوان بچوں کے باپ ہیں۔

ضروری نہیں کہ ماسٹربیشن کے عادی ہر نوجوان کو ایسا تجربہ دستیاب ہو کہ اس کا اعتماد بحال ہو جائے۔ بہت سے ایسے ہیں جنہیں شادی کی پہلی رات جیتی جاگتی عورت کو چھونے کا موقع نصیب ہوتا ہے اور یقین کیجئے یہ وقت ان پہ بڑا بھاری ہوتا ہے۔

عورت کے بدن کو فتح کرنے کا مشکل مرحلہ

ایسا کوئی نوجوان اگر وہ حجلۂ عروسی میں جاتا بھی ہے تو الٹی پلٹی دوائیں کھا کر کیونکہ اس بے چارے کو اپنی فطری قوت پر بالکل اعتبار نہیں ہوتا۔ اسے بہرحال آج ایک مشکل قلعہ فتح کرنا ہے اور بیوی کو پہلی رات ہی یہ جتانا ہے کہ اس کا واسطہ کسی عام انسان سے نہیں بلکہ رستم زمان سے پڑا ہے۔ اس کے گھر والوں اور شادی میں شریک رشتہ داروں کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ شب زفاف کس پل صراط پر سے گزرے گا۔ ایک ایسا پل جس کے نیچے ناکامی کے خوف کی کھائیاں منہ کھولے پڑی ہیں۔ وہ تو بس بے صبری کے ساتھ کل صبح دلہن کے بستر کی نئی سفید چادر پر خون کے دھبے دیکھنے کے منتظر ہیں۔ جو اس بات کی گواہی ہوں گے کہ لڑکا واقعی مکمل مرد ہے اور لڑکی باعصمت اور کنواری۔

لڑکے کے لئے یہ ایک اذیت ناک مرحلہ ہے۔ اُلٹے سیدھے طریقوں سے سوائے دوستوں کے اسے

گائیڈ کرنے والا کوئی نہیں۔ بلیو فلموں کے وہ تمام مناظر اگرچہ مفصل ازبر ہیں جنکی حیثیت طریقہ
استعمال کی سی ہے مگر وہ اس کی قوتِ مردمی کی گارنٹی تو نہیں بن سکتے۔ گھر میں شادی شدہ افراد کی
صورت میں کئی قریبی عزیز جیسے والد، چچا اور بڑا بھائی وغیرہ موجود ہیں مگر کسی کو اسکی پریشانی کا ادراک
نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کی رات دو انسانوں بلکہ دو خاندانوں کی خوشی داؤ پہ لگی ہے۔ نتیجہ کچھ بھی نکل
سکتا ہے، آبادی یا پھر بربادی۔

یہ ایک ایسی شادی کا منظر ہے جس کے فیصلے میں خاندان کے بڑوں کی مرضی کا عمل دخل بنیادی ہے اور
لڑکے لڑکی کی پسند ناپسند ہونے کے برابر۔ ہمارے ہاں یہی طریق شادی مروج اور قابل احترام
ہے۔ یہ بظاہر ایک کامیاب طریقہ ہے جس کے ذریعے شادی عمومی طور پر تاعمر قائم رہتی ہے مگر کوئی
نہیں جانتا کہ یہ کامیاب شادی اپنے دامن میں کیسی کیسی اذیتیں سمیٹے ہوتی ہے۔

مرد کتنا مرد ہے یہ صرف عورت جانتی ہے

سوسائٹی میں اپنی مردانگی کے قصے سنانے والا اور اس کے غرور سے لبریز مرد کتنا مرد ہے، یہ صرف اس
کی بیوی جانتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی مرد محض باپ بننے کے نتیجے میں مرد ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔
ہماری سوسائٹی ایسے مردوں سے بھری پڑی ہے جو باپ بننے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں مگر
بیوی کو مطمئن کرنے کے ہنر سے بالکل نابلد۔ پچاس پچاس برس کی ازدواجی زندگی میں وہ ایک بار بھی
عورت کو لطف کی بلندیوں سے روشناس کرانے میں ناکام رہتے ہیں۔ اکثر مرد مردانگی کی صلاحیت
رکھنے کے باوجود اپنی بیویوں کے لیے نامرد ہی ہوتے ہیں کیونکہ وہ بیوی کو مطمئن کرنا نہیں جانتے۔
ایک بیوی کے نزدیک وہی شوہر مرد کہلانے کا مستحق ہوتا ہے جو باہر اور بستر کی کارگاہ میں ایک جیسا
کامیاب ہو۔ مگر شومئی قسمت کہ اس حوالے سے ہمارے ہاں 90 فیصد سے زیادہ مرد مردِ میدان ثابت
نہیں ہوتے۔ سو ہمارے ہاں رشتے محبت سے نہیں مجبوریوں کی وجہ سے قائم رہتے ہیں۔ ایسے حالات
میں عورت جلد ہی شوہر سے ذہنی طور پر خود کو الگ کر لیتی ہے اور اکثر اولاد کو اپنی محبت اور توجہ کا مرکز و محور
بنا لیتی ہے۔

عورت سے ڈرا ہوا مرد

عورت کے ساتھ مرد کے حاکمانہ مزاج اور برتاؤ کے پیچھے اس کا خوف چھپا ہے۔ وہ عورت کی کئی طرح کی جانی انجانی طاقتوں سے خوف زدہ ہے۔ اس کے نزدیک عورت ایک جادو ہے جو اس پر کسی بھی وقت چل سکتا ہے اور اس کے حواس معطل اور مختل کر سکتا ہے۔ شائد اسی لیے غالب نے عشق کو دماغ کا خلل کہا تھا۔ مرد کے اعصاب پر عورت کے تصور کی سواری اسے پریشان کرتی ہے۔ سوسائٹی سے اس نے بچپن سے لے کر جوانی تک ایک ہی سبق پڑھا ہوتا ہے کہ عورت کمتر ہے، بے وقوف ہے، پاؤں کی جوتی ہے مگر چھل اور فریب بھی ہے، جادوگرنی ہے، چھل پیری ہے جو کئی طرح کے روپ بدل سکتی ہے، بہکا سکتی ہے، ایمان خراب کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس اسے اپنے بارے میں اس گمان میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ وہ شہ زور ہے، بہادر ہے، نہ تھکنے والا گھوڑا ہے، دانا ہے بینا ہے۔

مگر وہ کبھی کبھی ضرور یہ سوچنے لگتا ہے کہ اس قدر کمتر اور بری مخلوق کیونکر مجھ جیسے اچھے بھلے آدمی کے اعصاب پہ سوار ہو رہی ہے۔ یہ سوچ اس کے تحت الشعور میں پیوست ہوتی ہے جو شعور کی سطح تک کم ہی راہ پاتی ہے۔ وہ عورت کے پیچھے پاگل بھی ہوتا ہے اور اس سے نفرت بھی کرتا ہے۔ وہ محبت بھی کرتا ہے تو اس لاشعوری سوچ کے ساتھ کہ کسی طرح محبوبہ اس کے قبضے میں آجائے تاکہ وہ اسے بتا سکے کہ جس کے حصول کی خواہش نے اسے پاگل بنا رکھا تھا، اس کی اوقات کیا ہے۔

عورت (بظاہر) کمتر ہونے کے باوجود مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ مرد کے نزدیک عورت کا یہ جرم ناقابل معافی ہے۔ اور اگر عورت اپنے عاشق کی محبت کو رد کرنے کے بعد کسی طریقے سے اس کے ہاتھ آجائے تو پھر اس کی سزا زندگی کے آخری سانس تک ختم نہیں ہوتی۔ وہی عورت جس کے پیچھے وہ مرا جا رہا ہوتا ہے، وہ اسے ہر لمحہ مارنے، زچ کرنے اور کچلنے پر تلا رہتا ہے۔

ہمارے ہاں مردانگی جنسی طاقت کا استعارہ ہے۔ مرد اس لیے مرد ہے کہ وہ فائل ہے، عورت کو زیر کرتا ہے۔ اور عورت اس لیے عورت ہے کہ اس کا کردار مفعولی ہے، وہ مرد کے آگے زیر اور ڈھیر ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مرد کی یہی مردانگی جس کا وہ سر عام فخریہ اعلان کرتا پھرتا ہے، مفعولی کردار رکھنے

والی اور زیر ہونے والی عورت کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ عورت اس کی مردانگی کا بھید جانتی ہے۔ بے شمار مرد ہیں جو عورت کے ساتھ شب زفاف پہلی ہی ملاقات میں مردانگی کے فخر سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

عورت کو کمتر اور جھوٹی کہنے والے مرد نے خود اپنی کمتری کو چھپانے کے لیے جھوٹی مردانگی کا غلاف اوڑھ رکھا ہے۔ مرد کی جنسی خواہش ابال جیسی ہوتی ہے جبکہ عورت کی جنسی خواہش میں ایک ٹھہراؤ اور گہرائی، جو مرد کو پاتال کی طرح خوفزدہ رکھتی ہے۔ یہ مرد کی مردانگی کا بھید کھلنے کا خوف ہے جسے چھپانے کے لیے عورت کی پیدائش سے ہی اس کی شخصیت میں خوف کا بیج ڈال دیا جاتا ہے۔ اسے ہر حال میں خاموش رہنے اور سب کچھ سہنے کا درس دیا جاتا ہے۔

عورت بوڑھی نہیں ہوتی

مردوں نے اپنے جھوٹے تفاخر کی لاج رکھنے کے لیے ایک محاورہ راسخ کر رکھا ہے کہ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ مرد کو اپنے فاعل ہونے کا بھی بڑا گھمنڈ ہوتا ہے جبکہ وہ عورت کو مفعول کہہ کر اس کی تضحیک کرتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مرد یہ دعویٰ اپنے عضوِ تناسل کی بنیاد پر کرتا ہے مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ اکثر مردوں کو بھرپور جوانی میں بھی یہی خوف لاحق ہوتا ہے کہ جس عضو کے برتے پر وہ مردانگی کی بڑھکیں لگاتے ہیں کیا وہ وقت آنے پر 'میدانِ کارزار' میں معرکے کے آخر تک ثابت قدم رہ بھی پائے گا کہ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں ۹۰ فیصد سے زیادہ مرد اپنی بھرپور فعالیت کے دور میں ہی اپنی مردانگی کے بارے میں شکوک کا شکار ہوتے ہیں۔ جبکہ عورت کو ایسا کوئی خدشہ لاحق نہیں ہوتا بلکہ اس کی 'مفعولیت' ہی امرد کو ڈرا کر نامرد بنا دیتی ہے۔

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ مرد اور عورت دونوں کے عضلات اگرچہ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں مگر جنسی خواہش ختم نہیں ہوتی۔ بقول غالب

گو ہاتھ میں جنبش نہیں ہاتھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ایسی صورت میں مرد ہی ہے جسے یہ ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ واقعی مرد ہے، جبکہ عورت کو ایسا کوئی چیلنج درپیش نہیں ہوتا۔ ہاں بس اس کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی جنسی خواہش کے باوجود اپنے ڈھلکے ہوئے بدصورت بدن کی جانب کسی فاعل مرد کو متوجہ نہیں کر سکتی۔ مگر امیر کبیر خواتین کو تو یہ مسئلہ بھی درپیش نہیں ہوتا کہ وہ اپنے پیسے کے بل بوتے پر کسی بھی خوبصورت اور توانا نوجوان کی خدمات خرید سکتی ہیں۔ ہماری بہت سی بوڑھی فلمی اداکارائیں ہیں جن کے بارے میں عوام میں ایسے قصے گردش میں ہیں۔

یہ ہمارا سماج ہے جو سیکس کے بارے میں اپنی غلط تفہیم کی وجہ سے افراد کی جائز جنسی خواہشات کو ناجائز روایات کے بھاری پتھر تلے دبائے بیٹھا ہے اور اوپر سے مطالبہ یہ کہ احتجاج کی چیخ بھی نہ نکلے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مرد نہیں بلکہ عورت ہے جو کبھی بوڑھی نہیں ہوتی مگر ہم اسے اس کے جذبات کی اظہار کی اجازت نہیں دیتے۔ جبکہ یہ مرد ہے جو ایک خاص عمر کے بعد اپنی فعالیت کھو بیٹھتا ہے مگر ڈھنڈورا یہی پیٹتا رہتا ہے کہ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا جبکہ اس کی مردانگی کی ناکامی کے اشتہاروں سے شہر بھر کی دیواریں بھری ہوتی ہیں۔

عورت بدلہ ضرور لیتی ہے

جس دن عورت والدین کے گھر سے رخصت ہو کر سسرال کی اجنبی دہلیز پر قدم رکھتی ہے، وہ لاشعوری طور پر یہ ٹھان لیتی ہے کہ جس شخص نے اسے اس کے گھر والوں سے الگ کیا ہے وہ اسے بھی زیادہ دیر تک اپنے گھر والوں کے ساتھ نہیں رہنے دے گی۔ وہ اس مقصد کے لیے ممکنہ حد تک حربے اختیار کرتی ہے۔ اکثر ساس بہو کی لڑائی علیحدگی پر منتج ہوتی ہے۔ شروع میں یہ علیحدگی چولہا چوکا الگ کرنے تک ہوتی ہے اور پھر جلد یا بدیر شوہر کو نیا گھر لینا پڑ جاتا ہے۔ مرد اپنی مردانگی کے زعم میں عورت کو دبانے کے لیے سیدھی اور کھلی طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے جبکہ عورت اپنی کمزوری کو سمجھتے ہوئے سازشی حربوں کو استعمال میں لاتی ہے۔ بظاہر تو مرد فتح مند دکھائی دے رہا ہوتا ہے مگر اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ بیوی نے کس کمال چالاکی کے ساتھ اس کے پاؤں تلے سے قالین کھسکانا شروع کر دیا ہے۔ خود عورت کی مظلومیت ہی اس کا سب سے بڑا ہتھیار بن جاتی ہے۔ باپ کو علم بھی نہیں ہوتا کہ بچے کب

اس کا ساتھ چھوڑ کر ماں کے کیمپ میں شامل ہو چکے۔ اس کا احساس اسے بڑھاپے کے نزدیک جا کر ہوتا ہے جب اسے جوان اولاد کی مدد کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو صرف تنہائی اس کی رفیق ہوتی ہے۔ عورت بے چارگی میں ملفوف چالاکی کے ساتھ اس سے کئی اہم فیصلوں پر مہر ثبت کروا چکی ہوتی ہے، جس میں جائیداد پر قبضے سے لے کر بچوں کی شادیوں تک کے فیصلے شامل ہوتے ہیں۔

اب عورت مظلوم بیوی سے ساس بننے کے مرحلے میں داخل ہونے کو ہے۔ شوہر کی شکست اور بہو کے روپ میں ایک نئے فرد کو غلام بنانے کا زعم اسے سرشار رکھے ہوئے ہے۔ مگر وہ نہیں جانتی کہ بالآخر غلام بہو نے بھی کل کلاں کو اسی طرح اس کے بیٹے کو اس سے چھین لے جانا ہے جیسے کہ اس نے اپنی ساس سے اس کے بیٹے کو چھینا تھا۔

محبت ایک حقیقت یا افسانہ

پاک محبت، ناپاک محبت

ہماری سوسائٹی خاص طور پر مڈل کلاس میں جنسی تعلق اور ناپاکی کو لازم وملزوم سمجھا جاتا ہے جبکہ عشق اور محبت انتہائی پاک، منزہ اور الوہی مانے جاتے ہیں۔ یعنی ہم محبت اور بدن کے تعلق کو تسلیم کرنے سے صاف انکاری ہیں۔ اس مقصد کے لئے صوفیانہ تصورات کے زیرِ اثر ہم نے "پاک محبت" کی گمراہ کن اصطلاح گھڑ رکھی ہے۔ گمراہ کن اس لئے کہ یہ فرد کو دو حصوں میں کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ ایک حصہ وہ جو تمام عورتوں کو گندے اور نجس وجود کے طور پر دیکھتا ہے اور دوسرا حصہ اپنے محبوب کے وجود سے بدن کو منہا کرنے کی ناکام کوشش میں مبتلا رہتا ہے۔ یعنی محبوب کے معاملے میں وہ اپنے وجود میں موجود جنسی جبلت کا انکار کرنے میں لگا رہتا ہے۔ وہ مسلسل اس خوف کا شکار رہتا ہے کہ کہیں اس کا دھیان اپنے محبوب کے بدن کی جانب نہ چلا جائے۔ لیکن اس کے باوجود ایسا فرد کئی دوسری عورتوں کے تصور سے اپنی تنہائی کو رنگین بناتا ہے مگر غلاظت کے احساس کے ساتھ۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میرے پاس اسی طرح کے خیالات کا حامل ایک نوجوان آیا جو اپنی محبوبہ سے

شادی کی خواہش میں مرا جا رہا تھا۔ اتفاق سے وہ لڑکی میرے حلقۂ احباب میں شامل تھی۔ وہ لڑکی ان دنوں اس نوجوان سے ناراض تھی اور اس لڑکے کو یہ امید تھی کہ میں اس لڑکی کی ناراضگی ختم کروا کے اس کے ساتھ شادی کے لئے رضامند کر سکتا ہوں۔ مجھے اصولی طور پر اس کی خواہش پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر میں اس کے تعلق کی کیفیت کو ضرور جاننا چاہتا تھا۔ میں نے نوجوان سے پوچھا کہ کیا کبھی کسی ملاقات میں اس لڑکی کو چھوا بھی ہے۔ میرا سوال سن کر اس نوجوان کو یوں لگا کہ جیسے اچانک اسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ فوراً بولا۔ ''جناب آپ نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا۔ میں تو کسی ایسی حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' میں نے کہا کہ ہاں میں یہ بات مان لیتا ہوں کہ تم نے کبھی ایسی کسی ''گندی'' اور ''غیر اخلاقی'' بات کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا، مگر میرے عزیز یہ تو بتاؤ کہ کیا شادی کے بعد اُسے بہن بنا کے رکھو گے؟ نوجوان یہ غیر متوقع سوال سن کر مجھے ہونقوں کی طرح تکنے لگا کیونکہ اس کے پاس میرے اس سوال کا کوئی حقیقی یا غیر حقیقی جواب نہیں تھا۔

عشقِ حقیقی کا افسانہ

پاک محبت کی طرح ہمارے ہاں عشق حقیقی کی اصطلاح بھی بڑی مقبول ہے۔ اردو نصاب میں اس اصطلاح کا تذکرہ ثانوی درجے سے شروع ہوتا ہے اور پھر ایم اے کی کلاسوں تک طالبعلموں کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ پاک محبت کے معاملے میں تو خیر محبوب ایک حقیقی انسانی ہستی کے طور پر موجود ہوتا ہے، مگر عشق حقیقی میں سارا معاملہ یکطرفہ طور پر کسی خیالی بلکہ معروف لفظوں میں کسی مافوق الفطرت ہستی کے ساتھ چل رہا ہوتا ہے۔ یعنی اس عشق کی حیثیت کسی نفسیاتی عارضے یا واہمے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

غور کریں تو یہ سارا معاملہ یعنی پاک محبت اور عشق حقیقی، اپنی بنیاد میں نتیجہ ہے صنفِ مخالف سے جبری دوری کا۔ یہ ردعمل ہے فرد کے اندر موجود شدید جنسی ملاپ کی خواہش کا، جس کی تسکین کے زیادہ تر راستے سماج کی طرف سے بزور بند کر دیئے جاتے ہیں۔ فرد جب اپنے محبوب یا پسندیدہ ساتھی تک رسائی نہیں پا سکتا تو وہ خود کو پاک محبت یا عشق حقیقی جیسے ''عظیم اور دلچسپ'' دھوکے میں مبتلا کر لیتا ہے۔ اور یوں اس کی تخلیقی صلاحیتیں یا تو بانجھ ہو جاتی ہیں یا پھر اوہی قسم کی مجہول کہانیاں گھڑنے میں

ضائع ہونے لگتی ہیں۔ ایسے افراد کے تئیں محبت میں ناکامی یعنی محبوب سے دوری ہی زندگی کا اعلیٰ وارفع مقصد بن جاتی ہے۔ ان لوگوں کی فکر میں زندگی کو آگے بڑھانے والا کوئی مثبت، متحرک اور عقلی نظام فکر نہیں پایا جاتا۔ مادہ جو کہ کائنات اور اس وابستہ تمام تصورات کی اساس ہے، اس کی تضحیک کو برباد کرنے میں سب سے زیادہ اسی گروہ کا حصہ ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے جیسے بند معاشروں میں یہ گروہ خاصی بڑی تعداد میں پایا جاتا ہے۔

عشق حقیقی کے گمان پر مبنی یقین میں الجھے یہ لوگ بالکل مجہول، مفعول اور نان پروڈکٹو قسم کی زندگی گزارتے ہیں بلکہ الٹا کئی لوگ انہیں اولیا ہی واسطہ سمجھ کر ان سے دعاؤں کی قبولیت کی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔

مڈل کلاس اور محبت

مڈل کلاس میں محبت ایک الجھا ہوا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ یہ کلاس خود کو اپنے تئیں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی امین سمجھتی ہے۔ یہ ہمہ وقت تہذیب کا بھاری لبادہ اوڑھے رہتی ہے۔ سچ پوچھیں تو یہ تہذیبی اقدار اس کی جبلی ضرورتوں کی تسکین کو مناسب راستہ فراہم کرنے کی بجائے اسے ایک سجے بنے جیل میں بند کر دیتی ہیں۔ مڈل کلاس کا فرد بظاہر بڑا مطمئن دکھائی دیتا ہے مگر اس کی تشنہ جبلتیں اس کے اندر ایک طوفان بپا کیے رکھتی ہیں۔ اگرچہ عبادات اس کی روزمرہ کا معمول نہیں ہوتیں مگر ان تشنہ جبلتوں کی بے چینی اسے کئی بار عبادت کے خشوع وخضوع میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔

یہ مڈل کلاس کے مرد اور عورتیں ہی ہیں جہاں زندگی واضح طور پر مردانہ اور زنانہ کمپارٹمنٹس میں بٹی ہوتی ہے۔ یہ تقسیم متقابل اصناف کے درمیان پیدا ہونے والے نارسائی کے خلاء کو پُر اسراریت سے بھر دیتی ہے۔ خاص طور پہ مرد کے لیے عورت اس کے خود تراشیدہ مگر غیر حقیقی امیجز (Images) دکھانے والے شیش محل کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس کی محبوبہ اسے ویسا ہی دکھنے یا محسوس ہونے لگتی ہے جیسا کہ وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی محبوبہ اصل سے کہیں زیادہ اس کی خوہشات کا عکس ہوتی ہے۔ یوں کہیے کہ وہ ایک حقیقی عورت کی بجائے اپنے ہی بنائے ہوئے تصوراتی ہیولے سے محبت کر رہا ہوتا ہے۔

وہ محبوبہ کی حقیقی شخصیت سے محض چند اشارے کشید کرتا ہے اور پھر انہی کی بنیاد پر اپنی خواہشات اور تخیل کی مدد سے اس کا ایک ایسا ملکوتی خاکہ تشکیل دیتا ہے جیسا کہ وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ محبت میں مبتلا فرد کے لیے اپنی محبوبہ میں ذرا سی بھی خامی نہیں ہوتی۔ وہ اس کے لئے ایک ایسی مکمل اور آئیڈیل شخصیت ہوتی ہے جس کا دنیا جہان میں کوئی جواب نہیں پایا جاتا۔

یہ محبوب اپنی ماہیئت میں حقیقی نہیں بلکہ افسانوی ہوتا ہے جسے ناول، افسانے، شاعری اور سینما سکرین پر نظر آنے والی فلمی ہیروئن کی شبیہہ کی مدد سے زیادہ سے زیادہ گلیمرائز کیا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے خود کو اپنی ہی نظروں میں اہمیت بخشنے کی خواہش کا شاخسانہ سمجھا جاسکتا ہے۔ یعنی فرد یہ سوچ کر خوش ہوتا ہے کہ وہ کتنا اہم اور خوش نصیب ہے کہ کوئی عام معمولی سی لڑکی نہیں بلکہ ایک اپسرا اس سے محبت کرتی ہے۔

محبوب کو جاننے یا سمجھنے کا دعویٰ یا خام خیالی

ہر فرد کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ نہ صرف اسے محبوب کی قربت بلکہ اسے جاننے اور سمجھنے کے مواقع حاصل ہوں۔ مگر مڈل کلاس کی اخلاقیات میں نوجوان لڑکے اور لڑکی کی ملاقات کو انتہائی معیوب تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اسے دوسروں کے لیے معیوب اور برا سمجھنے والا فرد اپنی جبلی خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے لیے کسی نہ کسی طرح یہ موقع حاصل کر لیتا ہے۔ یہ مواقع چونکہ چوری کیے جاتے ہیں اس لیے دونوں اپنے اپنے خوف کی وجہ سے نارمل رویئے سے عاری ہوتے ہیں۔ یہ خوف صرف سماج کا ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ذات سے بھی ہوتا ہے کہ ابھی دونوں کے درمیان اجنبیت کی کئی ان دیکھی دیواریں حائل ہوتی ہیں۔ لڑکا جلد از جلد ان دیواروں کو گرا کر لڑکی کے بدن تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے مگر لڑکی کی نفسیاتی ساخت اسے ایسا کرنے سے روکتی ہے۔ اسے اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکا اسے چھو کر اس کی جنسی جبلت کو انگیخت کر دے۔ وہ صرف اس مرد کو اپنا بدن سونپنا چاہتی ہے جسے اس پر حد درجہ اعتماد ہو۔ وہ لڑکے کو یہ دھوکہ دینے پر مجبور ہوتی ہے کہ اسے چھوئے جانے کا عمل بالکل پسند نہیں ہے۔ لڑکا مختلف بہانوں سے بدن تک رسائی کے

راستے تلاش کرتا ہے اور وہ نہایت چالاکی سے ان بہانوں کو ناکام بناتی چلی جاتی ہے۔ وہ زبان اور بے زبانی سے مسلسل یہی جتانے کی کوشش کرتی ہے کہ اسے یہ حرکات بالکل اچھی نہیں لگتیں، سولڑکا بھی طوعاً کرہاً خود کو مہذب ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر لڑکا اسے کسی طرح سے چھونے یا بغل گیر ہونے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو وہ بظاہر شدید ناراضگی کا اظہار کرتی ہے مگر اندر ہی اندر حظ بھی اٹھاتی ہے اور گھر واپس آنے کے بعد ان لمحات کو انتہائی لطف سے یاد کرتی ہے۔

اس ملاقات یا جدید لغت کے مطابق ڈیٹ کے وقت دونوں ایک دوسرے پر اپنی مکمل اور حقیقی شخصیت آشکار کرنے سے گریزاں ہوتے ہیں مبادہ کہ دوسرا انہیں ان کی کسی کمی یا کمزوری کی وجہ سے رد کر دے۔ لہٰذہ وہ تکلف سے لبریز چوری چھپے کی ان مختصر ملاقاتوں میں زیادہ سے زیادہ اپنے بہترین اور کئی بار محض گھڑے گئے پہلو سامنے لاتے ہیں۔ یہ ملاقات کم و بیش آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کا ملغوبہ ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس ملاقات کے پس منظر میں فلرٹ کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی دونوں ہی اس شبہے کا شکار ہوتے ہیں کہ کیا وہ دونوں واقعی ایک دوسرے کے آئیڈیل ہیں بھی کہ نہیں۔ کیا انہیں واقعی ایک دوسرے سے اتنی محبت ہے کہ وہ اک دوجے کے بنا جی نہیں پائیں گے۔ مگر وہ ان خدشات کو اپنی ذات میں کہیں گہرا چھپا کے رکھتے ہیں۔

ایک دوسرے کو سمجھنے پرکھنے اور اندر تک جاننے کے لیے یہ حالات ان کی کوئی خاص مدد نہیں کرتے۔ انسان کو بہتر طریقے سے جاننے کے لیے ایسا ماحول ناگزیر ہے جہاں وہ اپنی ذات کا بے ساختہ اور بلا تکلف اظہار کر سکے۔ بدقسمتی سے ہمیں بچپن سے ہی اپنی ذات کو چھپانے کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایسا کرنا ہمارے مفاد کے خلاف ہوگا، سو ہم کم ہی کسی کو اپنے بارے میں پورا سچ بتاتے ہیں۔ محبوب کے معاملے میں تو معاملہ اور بھی زیادہ گھمبیر ہو جاتا ہے۔ ڈرتے ہیں کہ کہیں سچ بولنے سے متوقع محبوب ہمیں رد نہ کر دے یا ہمارے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ کھونے کا خوف ہمیں کھلنے نہیں دیتا۔ اور جب ہم اگلے پر نہیں کھلتے تو دوسرا خاک ہم پہ کھلے گا۔ ہمارے ہاں محبت کا جذبہ، خدشات اور ایک دوسرے کو جان لینے کا مغالطہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

آئیڈیل کی تلاش

ہر فرد ایک آئیڈیل کی تلاش میں ہے اگرچہ اکثر کو اس بات کا ادراک نہیں ہوتا کہ ان کا آئیڈیل ہے کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے آئیڈیل کے نام پر ایک ایسی شخصیت کا تصور تراش رکھا ہوتا ہے جس کا ملنا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ جس پہلے محبوب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کے بارے میں اسے گمان ہوتا ہے کہ شائد یہی اس کا آئیڈیل ہے۔ مگر ساتھ ساتھ یہ شک بھی گزرتا ہے کہ نہیں یہ اس کا آئیڈیل نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اس کا گمان یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اظہار محبت کر گزرو جبکہ شک کہتا ہے کہ نہیں ابھی صبر کرو۔ ممکن ہے کوئی اس سے بہتر مل جائے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں اکثر لڑکوں کا مسئلہ ہی یہ ہوتا ہے کہ کوئی ان کی طرف ملتفت کیوں نہیں ہوتا۔ یہی فرسٹریشن ہے جس کی بنا پر جو لڑکی بھی انہیں ذرا سا اشارہ دے دو اسے فوراً ہی محبوب کا درجہ دے ڈالتے ہیں۔

ہمارا آئیڈیل شعوری سے کہیں زیادہ نفسیاتی اور لاشعوری پسند کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس لئے ہم اکثر اس سوال کا جواب دے نہیں پاتے کہ اپنے محبوب میں ہم کیا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اکثر محبوب کے ظاہری خدوخال پہ ہی مر مٹتے ہیں۔ ہم اس کی آنکھوں، رنگت، قامت، چال، انداز تکلم اور پہناوے سے آگے نہیں سوچ پاتے۔ یہی چند باتیں ہمارے "بہترین انتخاب" کا معیار ٹھہرتی ہیں۔ جبکہ محبت کے مستقل تعلق میں یہ سب خصوصیات تو محض اضافی نوعیت کی ہیں۔ محبت کا پائیدار تعلق تو ظاہری خصوصیات کے بجائے ایک مکمل شخصیت کا متقاضی ہوتا ہے جس میں رویہ سب سے اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مکمل شخصیت کی گہری جانکاری کے لئے ملاقات کا بے تکلف ماحول ناگزیر ہے جسے ہمارے سماج نے کتابی اخلاقیات کی بنیاد پر ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ سو ہم محبت کے نام پر خود کو دھوکہ دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ہم محبوب کو سمجھ کیوں نہیں پاتے

ظاہری خوبصورتی جہاں بے پناہ کشش رکھتی ہے وہیں اکثر سب سے بڑا دھوکہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہماری گھریلو تربیت اور حقائق سے کٹی ہوئی مصنوعی اور بیزار کرنے والی تعلیم ہمارے اندر

کنفیوژن کا غبار بھر دیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہوئے بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہتے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم محض سطحی سوچ رکھنے والے ظاہر بیں بن کر رہ جاتے ہیں۔ ہماری عقل ترقی کر کے دانش میں تبدیل نہیں ہو پاتی۔ ہمیں نہ تو ایسے والدین نصیب ہوتے ہیں اور نہ ہی اساتذہ جو ہمیں سوال اٹھانا سکھائیں اور تجسس ابھار کر ہمارے اندر تجزیے کی صلاحیت پیدا کریں۔ والدین کی خواہش اور کوشش یہی ہوتی ہے کہ بچے کو 'خراب' ہونے سے بچایا جائے، جس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے لئے تجربے اور انکشاف کے سبھی دروازے بند کر دیئے جائیں۔ اسے ڈرا دھمکا کر سلیبس کی بیزار کن کتابوں تک محدود رکھا جائے۔ حتیٰ المقدور کوشش کی جائے کہ ٹی وی، غیر نصابی کتابوں اور گھر سے باہر کی سرگرمیوں سے حتیٰ الامکان گریز کرے اور کم سے کم دوست بنائے۔ یہی وہ تعلیم اور طریقہ تربیت ہے جو بچے میں خود کو سمجھنے اور جاننے کی صلاحیت پیدا نہیں ہونے دیتے۔ ایسے بچوں میں اعتماد کا شدید فقدان ہوتا ہے اور وہ محض ایک مجہول قسم کے مفعولی وجود میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس کے برعکس کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ ضد اور بغاوت پر اتر آتا ہے اور یوں اس کی شخصیت میں خاندان کو مستقل پریشانی سے دوچار کر دینے والا بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔

بچے کی شخصیت اپنی نارمل اور درست نمو کے لئے دوستانہ ماحول چاہتی ہے جہاں اس کے سامنے اپنی شخصیت کو نکھارنے کے لئے انتخاب کے کئی راستے کھلے ہوں۔ ایک ایسا ماحول جہاں رنگ، تصویریں، موسیقی، ڈرامہ، شاعری، کہانیاں، اور سائنسی معلومات سبھی کچھ ہو۔ اور پھر اس کا ذہن جس علم یا ہنر کی جانب زیادہ مائل ہو، اس کے ذہن کو اسی سمت میں ترقی کے لئے مدد فراہم کی جائے۔ اپنی ذات پر اعتماد کے حصول کا راستہ صرف اور صرف علم اور ہنر پر گرفت سے مشروط ہے۔ جہاں تک اخلاقیات کا تعلق ہے یہ نصیحتوں کی بجائے بچہ والدین کے کردار اور سوسائٹی سے غیر محسوس طریقے سے سیکھتا ہے۔ افسوس کہ ہماری سوسائٹی کے بزرگ اس طریقے سے بدکتے ہیں۔ اپنی اولاد کے ساتھ ملکیت کا جذبہ انہیں بچوں کو ایسی آزادی دینے سے روکتا ہے جو انہیں ویسا بنا سکتی ہے جیسا وہ بننا چاہتے ہیں، نہ کہ ویسا جیسا کہ والدین انہیں بنانا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچے اپنی صلاحیتوں کے بے انت

خزانے کو استعمال ہی نہیں کر پاتے اور یوں ادھوری شخصیت کے ساتھ بڑے ہوتے ہوئے عملی میدان میں قدم رکھتے ہیں۔

کمزور اور ادھوری شخصیت کا مالک محبت کا اہل نہیں ہوتا۔ اول تو اس میں اعتماد کی خاصی کمی ہوتی ہے اور اگر اعتماد دکھائی بھی دے تو سمجھ لیجئے کہ وہ اعتماد جھوٹ، چالاکی یا جہالت کا نتیجہ ہے۔ محبوب کو جاننے کے لیے پہلے خود کو مکمل ایمانداری کے ساتھ جاننا ضروری ہے۔

محبت کی شادیاں ناکام کیوں

یہ درست ہے کہ ہمارے ہاں محبت کے نام پر بننے والے اکثر رشتے بہت جلد ناکام ہو جاتے ہیں۔ اور بوسیدہ اخلاقیات کے حامل محبت دشمن لوگ یہ طعنہ دیتے ہیں کہ "دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ ایسے رشتے کا انجام یہی ہونا تھا۔" مگر سماجی دانشور کبھی اس بات کا تجزیہ کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے کہ اس ناکامی کی اصل وجوہ کیا ہیں۔

اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ انسانوں کی عظیم اکثریت (اپنی ناقص تربیت اور فہم کی وجہ سے) محبت کی اہل نہیں ہوتی۔ محبت کے تعلق کی کامیابی ایک ایسی شخصیت کا تقاضہ کرتی ہے جو آزادی کا درست مفہوم سمجھتی ہو۔ محض اپنی من مانی کرنے کا نام آزادی ہرگز نہیں ہے بلکہ آزادی کے ساتھ ذمہ داری کا احساس لازمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ دوسرے کی آزادی کو دل و جان سے تسلیم کرنے کا حوصلہ۔ آزادی کے حصول کی خواہش دلیل مانگتی ہے کہ بتاؤ تم اس آزادی کے بدلے میں کیسا انسان ہو گے اور وہ انسان دوسرے انسانوں کے لئے کتنا کارآمد ہوگا۔

کارآمد ہونے کا مطلب

انسان امکانات کی بے انت کائنات کا نام ہے اور جسے صرف علم کی مدد سے ہی ایکسپلور (Explore) کیا جا سکتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ فرد کو کسی خدا نے پیدا کیا یا وہ ارتقا کے نتیجے میں وجود میں آیا، ایک بات تو ثابت ہے کہ وہ بہر حال ایک جیتے جاگتے انسان کے طور پر زندگی کا تجربہ

کر رہا ہے۔ وہ اپنی بے شمار ضرورتوں کے لئے دوسروں کا محتاج ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جب وہ کوئی نیا ہنر سیکھتا ہے تو اس ہنر سے جڑی ضرورت کے معاملے میں نا صرف اس کی اپنی محتاجی ختم ہو جاتی ہے بلکہ وہ اپنے جیسے کئی دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ کم علم اور بے ہنر انسان کی محتاجی کا دائرہ عالم اور ہنرمند کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہوتا ہے۔

انسانی سماج کی ترقی اور تیز رفتار ارتقا کے لئے فلسفی، موجد، فنکار، ہنرمند اور دانشور سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ باقی انسان تو محض کنزیومر کا درجہ رکھتے ہیں۔ کارآمد ہونے کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو تلاش کر کے انہیں علم اور تربیت کی مدد سے نکھارے، بڑھائے اور پہلی قسم کے گروہ میں اپنی جگہ بنائے۔

محبت کا رشتہ کیسے کامیاب ہوسکتا ہے!

یقیناً ہر فرد اپنی ذات میں ایک انتہائی پیچیدہ وجود ہوتا ہے۔ اس پیچیدگی کو سمجھنے کے لئے سوائے علم اور توجہ کے اور کوئی شے مددگار نہیں ہوسکتی۔ محبت کی ضرورتوں میں یہ خواہش ایک لازمے کی حیثیت رکھتی ہے کہ کوئی تو ایسا ہو جو ہماری ذات کو ہم سے بھی بہتر انداز میں سمجھے۔ اس کے لئے ایسا بے تکلف ماحول ناگزیر ہے جہاں لڑکا اور لڑکی مکمل بے ساختگی کے ساتھ ایک دوسرے کو مل سکیں، جان سکیں اور سمجھ سکیں کہ کیا وہ تمام زندگی ایک دوجے کے ساتھ چل سکتے ہیں یا نہیں۔ مگر المیہ یہ ہے کہ اپنے من پسند فرد کی تلاش کے لئے درکار آزاد ماحول کا ہمارے ہاں شدید فقدان ہے۔ انتہا یہ کہ مخلوط تعلیم کے اداروں میں بھی لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان کئی ان دیکھی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ اکثر اداروں میں انہیں ایک ہی کلاس روم میں الگ الگ بنچوں پر بیٹھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ کینٹین میں اکٹھے کھانے پینے اور چائے پینے کی مختلف طریقوں سے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر محبتیں قریبی رشتہ داروں کی شادی کی تقریبات میں شروع ہوتی ہیں۔ یہاں ایک تو لڑکیوں کو قدرے قریب سے دیکھنے اور کسی حد تک ان کے ساتھ بے تکلف ہونے کی آزادی ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ عام سی شکل و صورت کی لڑکی بھی میک اپ اور چمک دمک لباس کی وجہ سے فلمی ہیروئن جیسی دکھائی دیتی ہے۔ اور پھر

یہ کہ اس قربت سے بھڑک اٹھنے والی جنسی جبلت دونوں کی عقل پر کئی طرح کے پردے ڈال دیتی ہے، جو بعد میں اٹھتے ہیں تو پھر عقل پر ماتم کے سوا کوئی راستہ نہیں بچتا۔ اور ہیرو اور ہیروئن شادی کے بعد بہت جلد ایک دوسرے کے لیے ویمپ اور ولن میں بدل جاتے ہیں۔

پہلی نظر کی محبت

پہلی نظر کی محبت فیوڈل سماج کی دین ہے جس کی حیثیت ایک نفسیاتی مغالطے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ ہمارا نصف صدی قبل کا ادب ایسی ہی محبت کی کہانیوں اور شاعری سے بھرا پڑا ہے۔ یہ محبت محض ظاہری خوبصورتی کی ایک مختصری جھلک جیسی ناپائیدار بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ اس طرح بننے والے تعلق کی حیثیت ایک جوئے کے داؤ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ایسی محبت فرد کے شعور کو مکمل طور پر معطل کر دیتی ہے۔ یہ وہ عاشق نامراد ہوتے ہیں جنہیں محبت کی الف ب کا بھی ادراک نہیں ہوتا مگر خود کو سچا اور پکا عاشق سمجھے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ایسے مریضان محبت بالکل بھول جاتے ہیں کہ وہ دنیا میں کیا کرنے آئے ہیں۔ وہ تو بس ہمہ وقت اپنے ''محبوب'' کی ایک جھلک دیکھنے کے مواقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں میں عمومی طور پر محبوب تک رسائی کی ہمت نہیں ہوتی سو یہ تمام عمر اسے 'آئی لو یو' کہنے کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ ان کا محبوب ایک جیتی جاگتی لڑکی ہونے کے باوجود محض خیال جیسا ہی ہوتا ہے۔ اس کی اصل شخصیت کے بارے میں ان کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں لیکن ان کا ذہن محبوب کے بارے میں بنائے ہوئے ملکوتی مگر غیر حقیقی تصور سے بھرا رہتا ہے۔

موبائل اور انٹرنیٹ کے آنے سے سے پہلے ہمارے ہاں ایسے عاشقان نامراد کثرت سے پائے جاتے تھے۔ پہلی نظر کی نارسا اور ناکام محبت کا یہ سارا کھیل عورت اور مرد کے درمیان سماجی اقدار کے نام پر حائل بے جا دوری کا شاخسانہ تھا۔ ایک دوجے سے تعلق پیدا کرنے کے دو تین طریقے ہی دستیاب تھے۔ ایک خط و کتابت اور دوسرا ٹیلی فون جو کہ شاذ شاذ گھروں میں ہی پایا جاتا تھا۔ ابھی مس کال کا بہانہ وجود میں نہیں آیا تھا۔ ایک راستہ اور بھی تھا اور وہ یہ کہ محبوبہ کی کسی جاننے والی چالاک عورت کے ذریعے پیغام رسانی۔ مگر یہ سب طریقے اپنی نوعیت میں یوں خطرناک تھے کہ بات کھلنے کی صورت میں

بندے کو ساری عزت ملیا میٹ ہونے کا شدید خدشہ لاحق رہتا تھا۔

محبت کے یہ مراحل جانگسل ہونے کے باوجود ایک عجیب طرح کے لطف سے لبریز ہوتے ہیں۔ایسی یک طرفہ محبتوں میں کامیابی کے امکانات اگر چہ نہ ہونے کے برابر ہوتے تھے مگر اس مہم بازی کا اپنا ہی مزا تھا۔ عاشقانِ نامراد محبوبہ کی صرف ایک جھلک کے لیے گھنٹوں کیا مہینوں منتظر رہتے تھے مگر ان کے پائے استقلال میں لرزش تک نہیں ہوتی تھی۔اکثر معاملات میں لڑکی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ کوئی ان کی چاہت کے چاہ میں کس قدر گہرا ڈوب چکا ہے۔ایسی محبت میں عاشق زار کی حِس تصور اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ وہ محبوب کی بے معنی جھلکیوں سے اشارے کشید کر کے پوری فلم تیار کر لیتا ہے جس میں محبوب کی مبہم سے مبہم حرکت کا اشارہ عاشق زار کے حق میں جاتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ کیفیت کسی خود ساختہ مگر جان لیوا بیماری سے کم نہیں ہوتی تھی جس سے موجودہ نسل کے کم و بیش سبھی بزرگ گزر چکے ہوں گے۔

آج کے نوجوان کو 'آئی لو یو' کہنے کے مواقع زیادہ آسانی سے دستیاب ہیں۔موبائل اور انٹرنیٹ نے اس کا کام بہت آسان کر دیا ہے۔لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے دستیابی کے مواقع بہت بڑھ گئے ہیں۔ایک دوسرے تک رسائی اور پیغام رسانی بہت آسان ہو گئی ہے۔اس صورتحال سے جہاں نوجوان نسل بہت خوش ہے وہیں مشرقی تہذیب کے محافظ بزرگ نسل کی جان عذاب میں آئی ہوئی ہے۔تمام تر پابندیوں اور نظروں کے کڑے پہرے کے باوجود اکثر لڑکیاں موبائل چھپا کر رکھنے میں کامیاب رہتی ہیں جس کا استعمال عام طور پر تنہائی کے سب سے محفوظ مقام یعنی باتھ روم میں کیا جاتا ہے۔

فلرٹ کرنے والے

پرانے وقتوں کے یک طرفہ رومانس بے پناہ اذیت کے ساتھ ساتھ بے پناہ لطف بھی لئے ہوتے تھے۔ ایسے معاملات میں محبوب کا درجہ کسی دیوی دیوتا سے کم نہیں ہوتا تھا۔محبوب کا حصول ہی زندگی کا اول و آخر مقصد مانا جاتا تھا۔ ذرائع ابلاغ نے جہاں ایک طرف رسائی کے راستے کھولے وہیں محبت سے رومانس اور محبوب کی ناگزیریت اس حد تک گھٹا دی کہ اسے کم و بیش ڈسپوزایبل بنا دیا۔ دوسرے لفظوں میں 'محبت' فلرٹ میں بدل گئی۔ تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔

سچے عاشق کے لئے آئی لو یو کہنا آسان نہیں ہوتا کہ اس میں انکار کا لفظ سننے اور سہنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ جبکہ فلرٹ کرنے والے کے لئے انکار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس نے تو بیک وقت کئی کئی جگہ کنڈیاں پھینک رکھی ہوتی ہیں۔ اس کے لئے محبوب کا حصول آپشنل ہوتا ہے، ناگزیر نہیں۔ فلرٹ کرنے والا سچے عاشق کے برعکس آہیں بھرنے سے ناآشنا ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ عاشق نہیں ہوتا مگر عاشق کی اداکاری کرنے میں اسے کمال حاصل ہوتا ہے۔ ایک ایسا شاطر کردار جو کسی محبوبہ پر اپنا پول کھل جانے پر بھی اسے دوبارہ اپنی 'محبت' کا یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

فلرٹ کا رشتہ زیادہ تر لین دین پر استوار ہوتا ہے۔ فیشن کے جدید اسلوب نے مڈل کلاس کی لڑکیوں کے اخراجات ان کی پاکٹ منی سے کہیں زیادہ بڑھا دیئے ہیں۔ اب انہیں برانڈڈ آئٹمز چاہئیں جن کے حصول کے لئے اکثر ایک 'عاشق' کافی نہیں ہوتا، سو موبائل کی مدد سے حسب ضرورت 'عاشقوں' کی تعداد میں وقتاً فوقتاً اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کام میں کالج کی لڑکیاں زیادہ ایکسپرٹ ہوتی ہیں اور وہ حسب توفیق اپنی اداؤں کی قیمت وصول کرتی ہیں۔

فلرٹ کے لئے ایک خاص طرح کی جرأت و حنائی درکار ہوتی ہے جو آج کے نودولتیوں کے بچوں کے ہاں کافی پائی جاتی ہے۔ آپ کو ایسے کئی نوجوان گرلز سکولوں اور کالجوں کے قریب ترین بس سٹاپوں پر منڈلاتے ملیں گے۔ ان کا محبوب مشغلہ آتی جاتی اور سواری کے انتظار میں کھڑی لڑکیوں کی طرف تبصرہ نما فقرے اچھالنا اور موقع دیکھ کر موبائل نمبر کی چٹ پھینکنا ہوتا ہے۔

مڈل کلاس کی لڑکی اور محبت کی قربانی

مڈل کلاس کی لڑکیاں محبت ضرور کرتی ہیں لیکن شادی والدین کی مرضی سے ہی کرتی ہیں کیونکہ وہ اپنی ازدواجی زندگی کو عدمِ تحفظ سے بچانا چاہتی ہیں۔ شادی کے رشتے کے معاملے میں لڑکی اور والدین کا عدمِ تحفظ کا احساس بہت شدید ہوتا ہے۔ والدین کے لئے لڑکی ایک ایسا فرد ہے جس کی ذمہ داری انہیں اپنے کاندھے سے اتار کر کسی اور خاندان کے کاندھوں پر ڈالنی ہے۔ وہ اپنی بچی سے محبت کا لاکھ دعویٰ کریں مگر حقیقت میں اس کی حیثیت ایک پرائی شے جیسی ہے جسے انہوں نے پیدائش سے اب تک امانتاً اپنے

پاس رکھا ہوا تھا۔ اب وقت گیا ہے کہ اس 'پرائی شے' کو اس کے اصل 'مالکان' کے حوالے کیا جائے۔

دھیاں وادھن پرایا وے بابلا   توں پیار کیوں اپنا پایا وے بابلا (ایک پنجابی گیت)

بیٹیاں بیگانہ دھن ہیں، یعنی ایسی دولت یا شے جنہیں بنا کسی نقص اور نقصان کے ای خاص وقت پر بیگانوں کے حوالے کرنا ہے۔ یعنی ان کے کنوار پن کی گارنٹی کے ساتھ۔۔۔ کہ دیکھو ہم جو 'مال' 'مالک (شوہر) کے حوالے کر رہے ہیں، اس کی ہم نے جی جان سے اس طرح حفاظت کی ہے کہ اسے آج تک کسی غیر نے نہیں چھوا۔

لڑکی اور والدین کے لئے شادی ایک گارنٹی شدہ پیکیج ہے جو لڑکی کے سسرال میں اس کے نان نفقہ کی قانونی اور سماجی ضمانت ہے اور جہیز ایک زرِ ضمانت ہے جو اس گارنٹی کو پختہ بنانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ والدین کے لئے بیٹیاں ایک بوجھ ہیں کیونکہ وہ نان پروڈکٹو ہیں، بیٹوں کی طرح کماؤ نہیں۔ وہ بوجھ تو ہیں مگر ایک ایسا بوجھ جن سے ایک جذباتی تعلق بھی جڑا ہے۔ یہی جذباتی تعلق والدین کو ایک محفوظ رشتہ یعنی مضبوط گارنٹی والے بہتر پیکیج کی تلاش پر مجبور کرتا ہے۔

لڑکی بھی والدین کے تلاش کردہ رشتے کو ترجیح دیتی ہے بصورت دیگر وہ اپنی مرضی کے نتیجے میں والدین اور سماج کی حمائت سے محروم ہو سکتی ہے۔ ایسے میں اگر اسے شوہر دھوکہ دے جائے تو لڑکی جانتی ہے کہ اس کی حیثیت کٹی پتنگ سے زیادہ نہیں ہوگی جسے ہر مرد لوٹنے کے لئے تیار ہوگا۔ یہی مجبوری اسے اپنی محبت کی قربانی دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ بہرحال ایک المناک صورتحال ہے جس سے کم و بیش مڈل کلاس کی ہر لڑکی کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اپنی محبت کی قربانی دے کر کسی اور کو اپنا آپ سونپنے والی لڑکی کتنی خوش رہ سکتی ہے، یہ آپ بھی سمجھتے ہیں اور وہ بھی جانتی ہے۔

ہمارے ہاں اولاد کی حیثیت والدین کی ذاتی ملکیت جیسی ہے جنہیں اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا، خاص طور پر رفیق حیات کے انتخاب کا۔ اس معاملے میں لڑکوں کو پھر بھی کسی حد تک چھوٹ مل جاتی ہے کہ وہ اپنی کمائی کے زور پر والدین سے اپنی بات منوانے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ مگر بیٹیوں کے لیے ایسی کسی اجازت کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ خاندان کی جانب سے مسلسل یہ کوشش

کی جاتی ہے کہ لڑکی اپنی آزاد حیثیت حاصل نہ کر پائے۔

اولاد پر اپنی مرضی کے فیصلے کیوں لاگو کیے جاتے ہیں!

سوال یہ ہے کہ والدین کے پاس نوجوان اولاد پر ایسے فیصلے مسلط کرنے کا کیا جواز ہے جو براہ راست ان کی زندگی کو متاثر کرنے والے ہیں۔ بظاہر تو ایسا احساسِ محبت کے نام پر کیا جاتا ہے اور پھر مذہبی احکامات کو بھی جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مگر تنقیدی ذہن کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نتائج کی بنیاد پر دلیل مانگتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مذہبی احکامات سر آنکھوں پر مگر ان کا درست ہونا اسی صورت میں مسلّم تسلیم کیا جائے گا جبکہ ان کے نتائج انسان کے حق میں مثبت ہوں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ والدین مذہبی احکامات کو ان کے سیاق و سباق سے کاٹ کر اس طرح برتتے ہوں کہ ان کے بے جواز فیصلوں کو مقدس جواز مل جائے جسے اولاد خدا کا صریح حکم سمجھتے ہوئے حکم عدولی نہ کرے۔ اور یوں مذہب کے نام پر مذہب کی طرف سے ہی دیئے گئے اپنے حق سے دستبردار ہو جائے۔ مذہب اس معاملے میں بہت واضح انداز میں شادی کے لئے لڑکے اور لڑکی کے حق انتخاب کو تسلیم کرتا ہے۔

اکثر والدین بچوں کی شادیاں اپنی مرضی سے کرنے کے حق میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ اولاد کو اتنی سمجھ نہیں ہوتی کہ وہ اپنے جیون ساتھی کا درست انتخاب کر سکیں۔ یہ ایک ناقص دلیل ہے جو خود والدین کے خلاف جاتی ہے۔ والدین کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اولاد کی ایسی تعلیم و تربیت کا اہتمام کریں جو اسے ذہنی بلوغت بخشے اور وہ اس قابل ہو کہ اپنی زندگی کے سبھی فیصلے ذمہ داری کے ساتھ کر سکے۔ اگر والدین کے خیال میں اولاد جسمانی بلوغت کے باوجود ذہنی بلوغت سے محروم ہے تو اس کی ذمہ داری خود والدین کے سر جاتی ہے۔ سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ایسے والدین کو دانشمند تسلیم کر سکتے ہیں اور کیا ہم ان کے فیصلوں پر اعتبار کر سکتے ہیں۔

سوال تو ایک اور بھی اٹھتا ہے کہ آخر والدین اپنی اولاد کے فیصلے خود کیوں کرنا چاہتے ہیں اور ان فیصلوں پر اپنے حق کو اپنی انا کا مسئلہ کیوں بنا لیتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ معاملہ مذہبی کی بجائے اپنی اصل میں ملکیتی اور مفاداتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنے دھن دولت، کاروبار اور جائیداد کی

طرح اولاد کو بھی اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہیں۔

اولاد کے ساتھ ماں کا رشتہ عموماً صرف محبت کا ہوتا ہے۔ وہ کسی کاروبار کی مالک نہیں ہوتی اور ویسے بھی عورت ہونے کے ناطے وہ خاندان کے مرد سربراہ کی محتاج ہوتی ہے۔ جبکہ والد کا رشتہ محبت سے کہیں زیادہ میکانکی اور مفاداتی ہوتا ہے آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ کسی ماں نے اپنی اولاد کو عاق کرنے کا اشتہار دیا ہو۔ بھلا کوئی اپنی محبت سے کیسے کسی کو عاق کر سکتا ہے۔ یہ کام صرف والد کرتا ہے جس کے لئے اولاد کی محبت سے کہیں زیادہ اپنی جائیداد اور کاروبار اہم ہوتا ہے۔ اس کی اولاد انسان سے کہیں زیادہ اس کا کاروباری اور مفاداتی مستقبل ہے، جس کا اس کے سوچے ہوئے مفاداتی نقشے سے باہر نکل جانا اس کے محفوظ اور من مرضی کے مستقبل کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ سو وہ اولاد کو اپنی مرضی کے فیصلے کرنے کی کیونکر اجازت دے سکتا ہے۔

بیٹا ایک بلینک چیک ہے جس پر اس کے جوان ہونے تک کافی انویسٹمنٹ ہو چکی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس چیک کو کسی ایسے خاندان سے کیش کروایا جائے جو نہ صرف فوری طور پر اچھا معاوضہ دینے کی پوزیشن میں ہو بلکہ مستقبل میں بھی وقتاً فوقتاً منافع دینے کی گارنٹی مہیا کرتا ہو۔ اب آپ خود ہی سوچیں کہ اگر عین وقت پہ یہ چیک اپنی مرضی استعمال کرتے ہوئے کیش ہونے سے انکار کر دے تو انویسٹر کی حالت کیا ہوگی؟؟؟؟

ویسے تو شادی کا مطلب (زندگی کی سب سے بڑی) خوشی ہے۔ ایک ایسی خوشی جو پوری زندگی پہ محیط ہوتی ہے۔ ایک ایسی خوشی جس کے ساتھ ہماری آنے والی نسل کی زندگیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ شادی کو ہم فرد کے ارمانوں کی تکمیل کا نقطۂ عروج بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ واحد خوشی ہوتی ہے جس میں غریب سے غریب انسان بھی زیادہ سے زیادہ عزیزوں اور رشتہ داروں کو شامل کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ اکثر لوگ تو اس خوشی کے موقع کو یادگار بنانے کے لئے قرض اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اس تقریب کے مرکزی کردار یعنی دولہا اور دلہن محض مفعولی کردار نبھا رہے ہوتے ہیں۔

اجنبی لوگوں پر عدمِ اعتماد کی وجہ سے عمومی طور پر کزن میرج کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسے

کزنز کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا جاتا ہے جو ایک دوسرے کے لئے بہن بھائی کا احساس لئے جوان ہوتے ہیں اور انہوں نے کبھی بھولے سے بھی یہ نہیں سوچا ہوتا کہ ایک دن آئے گا جب انہیں نکاح کے مقدس نام پر ایک دوسرے سے جسمانی رشتہ بنانا ہوگا۔ غور کریں تو ایسے رشتے کسی خوفناک مذاق سے کم نہیں ہوتے۔ کئی بار ایسے بھی ہوتا ہے جو کزنز روٹین میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہتے ہیں جیسے ہی ان کی منگنی ہوتی ہے ان کی آپسی ملاقات کے تمام رستے سختی سے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اس دوران کوشش کی جاتی ہے کہ وہ بات چیت تو دور کی بات، ایک دوسرے کی شکل بھی نہ دیکھ سکیں۔ حالانکہ دانش اور عقلِ عام کا تقاضہ تو یہ ہے کہ شادی سے پہلے کا یہ وقت ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے استعمال ہونا چاہئے۔

محبت تخلیق کا سب سے طاقتور محرک

محبت ایک جادو اثر مظہر

عورت اور مرد کے درمیان بے جادوری کسی بھی سماج کو ذہنی طور پر بیمار، گمراہ اور تخلیقی طور پر بانجھ کرنے کے لئے کافی ہے۔ محبوب سے قربت اعلیٰ ترین خوشی کا دوسرا نام ہے اور یہی خوشی ہمیں تخلیق کے لمحوں میں بھی حاصل ہوتی ہے۔ محبت ایک جادو اثر مظہر ہے جو انسان کے اندر کئی طرح کے لطیف اور نازک منطقوں کو بیدار کرتا ہے۔ اسے ایک دم سے شاعری اور موسیقی بے پناہ کشش کرنے لگتے ہیں۔ اسے لگتا ہے جیسے ہر شعر اور گیت اسی کے محبوب کے لیے لکھا گیا ہے۔ وہ ہر فلم اور ہر ڈرامے میں اپنی ہی محبت کی کہانی ڈھونڈتا ہے۔ اگر اس کے محبوب کی صورت کسی ایکٹر یا ایکٹریس سے ملتی ہو تو اس کی ایک بھی فلم دیکھے بنا نہیں رہتا۔ اس کے پورے وجود پہ ہر لمحہ ایک ہی شخص کا خیال چھایا رہتا ہے۔ اس کی عام سی چال میں رقص کی آمیزش ہونے لگتی ہے۔ زندگی سے بے شمار شکائتیں ایک دم اڑن چھو ہو جاتی ہیں۔ لوگوں سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں ملائمت آجاتی ہے۔ خود اسے اپنا آپ بہت اہم، اور اچھا لگنے لگتا ہے مگر یہ احساس اسے کسی بھی طرح کے غرور میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ عاجزی کا رنگ غالب

آجاتا ہے۔

تخلیق اور رومانس لازم وملزوم ہیں۔ رومانٹک ہونے کا ایک عام مفہوم تو خیر محبت کے جذبے میں سرشار ہونا ہی ہے مگر فلسفیانہ سطح پر اس سے مراد ہے کسی بڑی تبدیلی کا خواب، ایسی تبدیلی جو سماجی سطح پر وسیع اور دیرپا اثرات کی حامل ہو۔ ان معنوں میں ہر موجد اور تخلیق کار لامحالہ رومانٹک ہوتا ہے۔ محبت کا جذبہ فرد میں نئی طاقت پیدا کرتا ہے، اسے محبت دشمن روایتوں اور سماجی رکاوٹوں کو توڑنے اور نیا انسان دوست سماج تخلیق کرنے کی جانب مائل کرتا ہے۔

محبت ہمارے اندر ہمیں ایک نئے وجود سے متعارف کرواتی ہے۔ ہمیں ایک دم اپنے ہونے بلکہ نئے ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کسی کا آئی لو یو کہنا ہمارے وجود پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ ایک دم سے ہمارا اپنا آپ ایک بے غرض انداز سے ہمارے لیے اہم بن جاتا ہے اور ہم خود کو کسی دوسرے کے لیے بدلنے لگتے ہیں، سنبھالنے لگتے ہیں۔ محبت حیران کن جذبہ ہے کہ جو نہ صرف ہمارے وجود کو اہم بناتا ہے بلکہ یہ اہمیت کسی غرور کا باعث بننے کی بجائے الٹا عاجزی کا باعث بن جاتی ہے، یعنی ہم اپنے اس نئے دریافت شدہ اہم وجود کو 'کسی اور' کے قدموں میں نچھاور کرنے کو بخوشی تیار رہتے ہیں۔ مگر المیہ یہ ہے کہ سماج اس مظہر کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ وہ عموی طور پر عورت اور مرد کی محبت کو بدکرداری سے تعبیر کرتا ہے۔ کیا یہ واقعی بدکرداری ہے یا سماج کی غلط تفہیم کا مسئلہ، اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

باکردار، بدکردار

ہمارا مسئلہ بھی عجیب ہے کہ ہم اعلیٰ ترین مذہبی اقدار کے دعویدار ہونے کے باوجود آج تک باکردار اور بدکردار کی تعریف متعین نہیں کر پائے۔ ہم نے کردار کو عموی طور پر سماجی اعمال کی بجائے مذہبی شعائر کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ یہ سامنے کی حقیقت ہے کہ مذہبی شعائر جیسے کہ روزہ، نماز، حج اور عقیدے کا تعلق سراسر فرد کی اپنی ذات سے ہے جس سے کسی دوسرے کو نہ تو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ کوئی نقصان (بشرطیکہ وہ شخص اپنا عقیدہ دوسروں پر نافذ کرنے کی کوشش نہ کرے)۔ جبکہ دوسری طرف فرد کا ایک سماجی کردار ہے جس میں ایمانداری، صاف گوئی، رحم دلی اور انصاف پسندی جیسے عناصر اور لین دین

جیسے عوامل فیصلہ کن اہمیت رکھتے ہیں۔یہی وہ اوصاف ہیں جن کی بنیاد پر کسی فرد کا کردار طے ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے کتنا اچھا یا برا ہے۔

ضروری نہیں کہ مذہبی شعائر پر سختی سے کار بند رہنے والے فرد کا سماجی کردار بھی بہت اچھا ہو۔ممکن ہے وہ سمگلنگ کرتا ہو، سود پر رقم دیتا ہو، لین دین کے معاملات میں ناقابلِ اعتبار ہو، جھوٹ بولنے کا عادی ہو، ملازمین کا استحصال کرتا ہو، ملاوٹ کے کاروبار میں ملوث ہو، بیوی بچوں کے ساتھ بے جا سختی کرتا ہو، پڑوسیوں کے لیے جان کا عذاب ہو،علیٰ ھذا القیاس اس سلسلے میں ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔اسی طرح ممکن ہے کہ ایک شخص کا مذہبی شعائر سے کوئی لینا دینا نہ ہو مگر وہ مذکورہ فرد سے برعکس خصوصیات کا حامل ہو۔

یہ سامنے کی بات ہے کہ مغربی اقوام نے مذہب کو اجتماعی معاملات سے بے دخل کر کے اسے فرد تک محدود کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہاں کسی کو کسی دوسرے کے مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔اور ویسے بھی وہاں کی اکثریت کم وبیش عبادات سے لاتعلق ہو چکی ہے۔لیکن اگر ان کے سماجی معاملات کا جائزہ لیں تو وہ ہمیں بہترین عملی اقدار اور اخلاقیات کا نمونہ دکھائی دیتے ہیں۔جبکہ اس کے برعکس جن سوسائٹیوں میں مذہبی اقدار سے چمٹے رہنے کا درس زور شور سے دیا جاتا ہے انکی سماجی صورت حال بہت شرمناک ہے۔اس حوالے سے ہم پاکستان اور افغانستان جیسے ممالک کو بطور مثال کے پیش کر سکتے ہیں۔

اس معاملے کو ہمارے روزمرہ تجربے کی روشنی میں مزید واضح کیا جا سکتا ہے۔ہم میں سے ہر کسی کو روزانہ کسی نہ کسی شے کی خریداری کے لئے بازار تو جانا پڑتا ہے۔جب ہم کسی اجنبی دوکاندار کے پاس جاتے ہیں تو ہم نہ تو اسکے عقائد کی پوچھ تاچھ کرتے ہیں اور نہ ہی یہ جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ عبادات میں اسکے خشوع وخضوع کا کیا عالم ہے۔ہمیں اگر دلچسپی ہوتی ہے تو صرف اس بات سے کہ کیا وہ ہمارے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے۔کیا اسکی دوکان پر قیمتیں مناسب ہیں۔کیا اس کے مال کی کوالٹی اچھی ہے۔ اور اگر وہ دو پیسوں کی رعائت بھی کر دے تو سونے پہ سہاگہ۔ہم نہ صرف خود بار بار اسی سے سامان

خریدتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی وہیں سے خریداری کا مشورہ دیتے ہیں۔یہی صورتحال ڈاکٹروں کی ہے کہ ہم ان کے پاس جاتے وقت صرف انکی قابلیت اور روپیے کی شہرت کو معیار بناتے ہیں نہ کہ ان کی مذہبی پریکٹس کو۔اس کسوٹی کو آپ زندگی کے ہر شعبے پر لاگو کر کے دیکھ سکتے ہیں۔

ان مثالوں سے یہ تو بہت حد تک طے ہو چکا کہ انسان کے عقائد اور عبادت گزاری سے اس کا کردار طے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لئے اصل پیمانہ اس کا سماجی کردار ہے۔جیسے عبادت اور عقیدہ انسان کا ذاتی معاملہ ہے اسی طرح بہت سے معاملات ہیں جن کا تعلق فرد کی اپنی ذات سے ہے جن کی پرائیویسی کا احترام دوسروں کا فرض ہے۔جیسے کہ لباس کا معاملہ یا دو افراد کا جسمانی تعلق بشرطیکہ اس میں دونوں کی آزاد مرضی شامل ہو۔بدقسمتی سے ان دونوں معاملات میں ہماری سوسائٹی کا کردار خدائی فوج دار کا سا ہے۔ہمیں خوامخواہ دوسروں کے معاملات میں ماے بننے کا شوق ہے۔ہم دوسروں پر تنقید کرنے اور ان پر ٹیگ لگانے کے بہت شوقین ہیں۔جبکہ ہم کبھی یہ نہیں چاہتے کہ دوسرے یہی سلوک ہمارے ساتھ کریں۔اکثر پردے کی پابند "شریف زادیاں" دوپٹہ اوڑھ کر گھر سے نکلنے والی خواتین کو آزاد خیال ہونے کا طعنہ دیتی ہیں لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود ان کے دل میں ویسا ہی لباس پہننے کی شدید خواہش چھپی ہوتی ہے مگر وہ معاشرے کے خوف سے شریف ہونے کا سوانگ رچاتی ہیں۔یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ عبایا پوش لڑکیاں ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ میک اپ زدہ ہوتی ہیں جنہیں وہ بے حیائی کا الزام دے رہی ہوتی ہیں۔

یہ ہے سوسائٹی کی عام مگر کنفیوزڈ سوچ جس کی وجہ سے فرد کے کردار کی تعریف کا تعین مشکل ہو گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم نیکی اور بدی کو بھی ڈیفائن نہیں کر پا رہے۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اکثر اچھائی کو برائی سمجھ کر رد کر دیتے ہیں اور برائی کو اچھائی سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں اور نتائج اکثر ہماری توقع کے خلاف نکلتے ہیں۔مگر ہم پھر بھی اپنے بنائے ہوئے معیاروں کو پرکھنے کی جانب توجہ نہیں کرتے۔

جہیز کا مسئلہ

جہیز اپنی اصل میں عورت کے کمتر بلکہ ناکارہ اور ناقص ہونے کا اعلان ہے جو سیدھا سیدھا مرد کی برتر معاشی حیثیت کا غماز ہے۔ ایک ایسا سماج جہاں بار بار استعمال ہونے والی عورت یعنی طوائف تو ہر بار مرد سے اپنے بدن کو استعمال کرنے کی قیمت وصول کرتی ہے مگر شریف عورت اپنی تمام تر پاکیزگی کے ثبوت کے باوجود مرد کے ساتھ مستقل رشتہ جوڑنے کے لیے قیمت ادا کرتی ہے۔ اگرچہ لڑکے کے گھر والے بھی بری کی صورت میں معقول رقم خرچ کرتے ہیں لیکن وہ نکاح والے دن برادری کو دکھانے کے بعد انہی کے گھر چلی جاتی ہے۔ مرد کی معاشی خودمختاری کا تقاضہ تو یہی بنتا ہے کہ نیا گھر بسانے کے لیے ضروری ساز وسامان کی ذمہ داری اسی پر عائد ہونی چاہیے مگر یہ سارا بوجھ جہیز کی شکل میں لڑکی کے گھر والوں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ جہیز کی ادائیگی کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ لڑکی کی حیثیت ایک ناپسندیدہ بوجھ کی سی ہے۔ ایک ایسا وجود جو سراسر غیر پیداواری ہے۔ جسے ایک خاص وقت کے بعد گھر بٹھا کر کھلانا اور اس کے دیگر اخراجات برداشت کرنا قابلِ قبول بات نہیں، سو بہتر ہے کہ ایک ہی بار لمبا چوڑا خرچہ برداشت کر کے اسے شادی کے نام پر کسی ایسے مرد کے سپرد کر دیا جائے جو باقی زندگی کے لیے اس کے اخراجات اٹھا سکے۔ رخصتی کے وقت والدین کی جانب سے دی جانے والی یہ بددعا نما دعا کہ

''اس گھر سے تمہاری ڈولی اٹھی ہے تو جنازہ اگلے گھر سے ہی اٹھنا چاہئے'' اس خواہش کی غماز ہے کہ تمہاری زندگی بھلے کتنی بھی اذیت ناک کیوں نہ ہو، سسرال کو چھوڑ کر کبھی واپسی کا ارادہ مت کرنا۔ ہمارے ہاں طلاق کا عمل اسی لیے شدید ناپسندیدہ ہے کہ یہ پھر سے والدین پر لڑکی کا بوجھ ڈال سکتا ہے، وہ بھی ایک دو بچوں کے اضافے کے ساتھ۔ اور اسے پھر سے رخصت کرنے کے لیے نئے سرے سے لمبا چوڑا خرچہ برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ والدین کے لیے یقیناً ایک تکلیف دہ صورتحال ہے جسے سماج کے اکثر حساس افراد ایک المیے کی صورت میں محسوس کرتے ہیں اور کئی تو اس کے خاتمے کے لیے باقاعدہ ادارے تشکیل دیتے ہیں مگر وہ اس سماجی بیماری کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرتے کرتے تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

جہیز ایک لعنت ہے مگر صرف دینے والوں کے لیے جبکہ لینے والوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترکبہ۔ سوسائٹی لاکھ چیخ چیخ کر اسے لعنت کہے مگر اس کے خاتمے کا ابھی دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہاں ابھی وہ سماج وجود میں نہیں آیا جہاں جہیز کا لین دین اپنی ناگزیریت کھو بیٹھے۔

جہیز کے خاتمے کی یوٹوپیائی خواہش

عرصہ ہوا مجھ سے دو پر خلوص نوجوان ملنے آئے۔ انہوں نے بڑے پرجوش انداز میں بتایا کہ وہ سماج سے جہیز کی لعنت کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا گمان تھا کہ میں ان کے اس جذبے کی تعریف کروں گا اور کام میں بہتری کے لئے کچھ بچاؤ بھی دوں گا۔ ان کی توقع کے برخلاف میرا جواب ان کے لئے قطعاً خوش کن نہیں تھا۔ میں نے صاف بول دیا کہ وہ ایک ناممکن العمل کام سرانجام دینے کی خواہش رکھتے ہیں جسے وہ بہت جلد بھاری پتھر جان کر چھوڑ دیں گے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود سوسائٹی کے تانے بانے سے تقریباً ناواقف تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جہیز کی رسم کا ہماری سوسائٹی میں موجود صنفی تفاوت سے کیا تعلق ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے دیوانے ہیں جو ایسے خوابوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں مگر اپنی تمام تر پرخلوص کوششوں کے باوجود ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں۔ کچھ افراد یا تنظیموں نے اس مسئلے کا حل اجتماعی شادیوں کی صورت میں ڈھونڈا ہے مگر جہیز کی لعنت کو وہ

ایک فیصد بھی ختم نہیں کر پائے۔

جہیز دراصل قبائلی اور فیوڈل سماج کا لازمہ ہے جسے نظام کی تبدیلی کے بغیر ختم کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس کا تعلق براہ راست معاشی نظام سے ہے۔ قبائلی اور فیوڈل سماج میں اگرچہ عورت مرد سے زیادہ کام کرتی ہے مگر وہ معاوضہ پانے کی اہل نہیں ہوتی۔ اسے مرد کی طرح ایک آزاد فرد کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے کام کے شعبے بھی مرد کی مرضی سے طے ہوتے ہیں۔ اس کا گھر سے اکیلے نکلنا روایات کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ روایات کا مطلب یہ ہے کہ اس کے انداز زیست پر پوری سوسائٹی نگران ہوتی ہے جو روایات سے ہٹ کر چلنے پر اس کا جینا دوبھر کرنے کا غیر مشروط حق رکھتی ہے۔ ایسی عورت کو کوئی برے سے برا مرد بھی 'گندی عورت' یا فاحشہ کا خطاب دے سکتا ہے۔

جہیز ایک طرح سے عورت کی جسمانی اور سماجی کمتری کے ساتھ ساتھ اس کے معاشی طور پر ناکارہ ہونے کا اعلان ہے۔ ایک ایسا ناکارہ پن جسے خود ہماری عورت نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اس نے مان لیا ہے کہ وہ ایک سیکس اوبجیکٹ سے زیادہ کچھ نہیں جس کا مصرف صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ بن سنور کر مرد کو لبھائے، اس کے بچے پیدا کرے اور اس کی خدمت گزاری کو اپنا دین دھرم جانے۔ جہیز عورت کی حیثیت کی اسی ''کمتری'' کو کسی حد تک دور کرنے کا ڈول ہے۔

ہم بھی عجیب لوگ ہیں کہ پہلے مذہب اور خاندانی روایات کے نام پر عورت کی صلاحیتوں کے پنپنے کے تمام رستے بند کر کے اسے ایک ناکارہ وجود میں بدلتے ہیں اور پھر اس گھڑی اور سدھائی گئی عورت کو مثال بنا کر یہ دعوے کرنے لگتے ہیں کہ جناب عورت تو ہے ہی کمتر اور ناقص۔ یہ اپنے فیصلے خود نہیں کر سکتی۔ جس مذہب کی رو سے ہم عورت کو ناقص العقل ثابت کرتے ہیں، اُسی کی مدد سے یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ اور پھر عورت کو گھر میں بند رکھنے کے لئے یہ دلیل لے آتے ہیں کہ اس کا کام اولاد کی تربیت کرنا ہے۔ ان متضاد قسم کے دعوے کرنے والوں سے کوئی نہیں پوچھتا کہ جناب ایک ناقص العقل عورت اولاد کی بہتر تربیت کیسے کر سکتی ہے؟ جسے دنیا کا کچھ علم ہی نہیں، وہ اپنی اولاد کو دنیا میں رہنے کا ہنر خاک سکھائے گی۔

ہمارے ہاں تو مرد کے مقابلے میں عورت کی حیثیت ایک معاشی بوجھ کی سی ہے جس کے نان نفقے کی ذمہ داری مرد پر ڈالی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں عورت کے لئے اپنی ہم جنس کو پیدا کرنا کسی خطرے سے کم نہیں ہے۔ اسے ابھی اپنی رخصتی یاد ہے جو اس کے گھر والوں کے لئے کسی پہاڑ کو سر کرنے سے کم نہیں تھی۔ اسے جہیز جمع کرنے کی مصیبت بھی نہیں بھولی۔ اسے خود پر لگائی جانے والی وہ پابندیاں بھی یاد ہیں جو اس پر عصمت کی حفاظت کے نام پر لگائی جاتی تھیں۔ ایسے میں بیٹی کا پیدا ہو جانا اس کی خانگی زندگی کے لئے مصیبت اور نحوست بن سکتا ہے۔ لڑکی کی پیدائش کا مطلب ہے ایک ان چاہے بوجھ کا اضافہ۔ جس کی تعلیم، تربیت اور پرورش پر خرچ کیا گیا پیسہ ضائع ہونے کے مترادف ہے۔ اور اس پر مزید یہ کہ ہر وقت اس کی عفت و عصمت کی نگرانی کا عذاب الگ۔

ہمارا سماج مردانگی کے فخر سے لبریز ہے۔ یہاں عورت ہر حیثیت اور رشتے میں ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ عورت فرد کے طور پر نہیں بلکہ رشتوں سے پہچانی جاتی ہے۔ رشتے سے بننے والی پہچان اس کی انفرادی پہچان کو کھا جاتی ہے۔ وہ کسی کی بیٹی ہے، کسی کی بہن، کسی کی بیوی اور کسی کی ماں۔ مگر وہ فرد نہیں ہے جو اپنے فیصلے آزادی کے ساتھ کرنے کا حق رکھتی ہو۔

کیا جہیز کا خاتمہ ممکن ہے؟

جی بالکل جہیز کا خاتمہ ممکن ہے۔ لیکن یہ سیدھا سیدھا عورت کی غیر مشروط آزادی سے مشروط ہے۔ بالکل ویسی ہی آزادی جیسی کہ مرد کو حاصل ہے۔ آزادی کا مطلب ہے کہ اس پر تعلیم اور کام کے ان سبھی شعبوں کے دروازے وا کیا جائیں جو ابھی تک صرف مردوں کے تصرف میں ہیں اور انہیں میرٹ پر آگے بڑھنے کے غیر مشروط مواقع فراہم کئے جائیں۔ اس کے لئے لازم ہے کہ ہم فیوڈل مردانگی کے تصور کو رد کریں۔ غیرت کے فرسودہ تصور سے نجات حاصل کریں۔ مذہب اور روایات کی اندھی تقلید کی بجائے عقل اور تجزیئے کا راستہ اختیار کریں۔ عورت کے اس حق کو تسلیم کریں کہ وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کر سکتی ہے، اپنا جیون ساتھی خود منتخب کر سکتی ہے۔ اپنی اس سوچ کو تیاگنے پر

آمادہ ہوں کہ عورت مرد سے کمتر ہے۔ حیرت ہے کہ جو باتیں ہمارا عظیم فلسفی ابنِ رشد آٹھ سو برس پہلے کہہ گیا ہماری سوچ آج کے جدید دور میں بھی ان سے کوسوں دور ہے۔ یہ نابغۂ روزگار فلسفی کہتا ہے:

''عورتیں مردوں سے صرف بلحاظ مدارج مختلف ہیں نہ بلحاظ فطرت۔ جتنے کام مرد کر سکتے ہیں وہ بھی کر سکتی ہیں۔ جنگ، تعلیم، فلسفہ وغیرہ مگر کم تر پیمانے پر۔ بعض اوقات عورتیں مردوں سے موسیقی میں بازی لے جاتی ہیں حتیٰ کہ اس فن کا کمال صرف اس وقت سمجھا جاتا ہے جب مرد راگ تصنیف کریں اور عورتیں انہیں گائیں۔ بعض افریقی ریاستوں کی مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں میں جنگ کی بھی خاصی صلاحیت ہے۔ اگر یہ بھی ایک جمہوری حکومت میں حصہ لینے آئیں تو کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی جائے گی۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ چرواہے کی کتیاں بھی بھیڑوں کی اسی طرح حفاظت کرتی ہیں جیسے کہ کتے۔

ہماری تمدنی حالت عورتوں کو اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی تمام لیاقتوں کا اظہار کر سکیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ صرف بچے پیدا کرنے اور انہیں دودھ پلانے کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ اسی غلامی کی حالت کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان میں بڑے بڑے کاموں کے انجام دینے کی جو قابلیت تھی وہ ضائع ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک بھی عورت ایسی نظر نہیں آتی جو اخلاقی خوبیوں سے آراستہ ہو۔ ان کی عمریں نباتات کی طرح بسر ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے شوہروں کی خدمت گزاری میں لگی رہتی ہیں۔ یہ بھی ایک مصیبت ہے جو ہمارے شہروں کو تباہ کر رہی ہے۔ اس لئے کہ جتنی تعداد مردوں کی ہے اس سے دوگنی عورتوں کی تعداد ہے اور یہ عورتیں خود اپنے دست و بازو سے اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے کمانے کی استعداد نہیں رکھتیں۔''

(ابنِ رشد و فلسفۂ ابنِ رشد۔ مصنف موسیو رینان۔ ترجمہ مولوی معشوق حسین خان علیگ)

یہ درست ہے کہ فیوڈل سماج دھیرے دھیرے دم توڑ رہا ہے مگر صدیوں سے بنی ہوئی نفسیات مرتے مرتے بھی کئی نسلیں برباد کر جائے گی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اشیا کی بافراط پروڈکشن اور چکاچوند نے ہمیں نرا ہونق بنا دیا ہے۔ ہم بلا سوچے سمجھے ہر شے کو اپنی دسترس میں لانا چاہتے ہیں۔ گھر میں ایک کمانے والا ہمارے سارے مطالبے پورے کرنے میں ناکام ہے۔ ایسے میں بیوی اور بیٹیوں کا معاشی میدان میں آنا ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم جاگیردارانہ نفسیات کی جکڑ کے ساتھ سرمایہ دارانہ معیشت کے تیزی سے تغیر پذیر دائرے میں قدم رکھ رہے ہیں۔ دو کشتیوں کی اس سواری نے ہمیں بوکھلا کے رکھ دیا ہے اور ہماری دانش ہمیں یہ بتانے میں مکمل ناکام ہے کہ ہم آگے کی طرف جائیں یا پیچھے کی جانب مراجعت کر جائیں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا محاورہ ہم پہ بالکل فٹ بیٹھتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام فیوڈلزم کے مقابلے میں اپنے انداز کا ایک ظالمانہ نظام ہے مگر اس کی نعمتوں سے بھی انکار ممکن نہیں۔ یہی وہ نظام ہے جس نے پرنٹنگ پریس اور الیکٹرانک ذرائع ابلاغ کی ایجادات سے علم، معلومات اور تعلیم کو تیز ترین فروغ بخشا۔ جس کا نتیجہ انسانی حقوق کے شعور اور جمہوری سیاسی نظام کی صورت میں سامنے آیا۔ نسائی حقوق کا جیسا بھی شعور اس وقت ہے، یہ اسی نظام کی دین ہے۔ ہمیں یہاں ابھی مستقبل میں صورت پذیر ہونے والے آئیڈیلزم سے بحث نہیں ہے۔ ہمیں تو ابھی یہ دیکھنا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ سرمایہ داری سے جنم لینے والا سارا استحصال تو ہمارے کاندھوں پہ لدا ہے جبکہ اس کے فوائد میں سے ہمیں کوئی حصہ نہیں مل پا رہا۔

غور سے دیکھا جائے تو اس کی جڑیں یورپ کی نشأۃ ثانیہ میں پائی جاتی ہیں۔ وسائل کی عدم دستیابی کے شدید احساس نے یورپ کو فلسفے، سائنس اور ٹیکنالوجی کی راہ پر دھکیلا جبکہ فتوحات کے نتیجے میں ملنے والی خوشحالی مسلم خلافت کے ادوار میں پیدا ہونے والے فلسفیوں اور سائنسدانوں کو کھا گئی۔ یہ یورپ ہی تھا جس نے مسلم سماج کی جانب سے رد کیے گئے حکماء کو اپنے تعلیمی اداروں میں دوبارہ زندہ کیا۔ مسلم خلافت کے سماج میں یہ علم ایک ذہنی عیاشی سے زیادہ درجہ نہیں رکھتا تھا۔ انھیں اس بات کا ادراک

ہی نہیں تھا کہ اسے اداراتی شکل دے کر سماج کے حق میں کیونکر استعمال کیا جائے۔ مسلم حکماء کی کتابوں نے یورپ کے علمی، سماجی اور مادی ترقی کے درجے کو بلند ہونے کا واضح احساس دیا جبکہ مسلمان اپنی خوشحالی اور جبروت کے گھمنڈ میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان علوم کی اہمیت سمجھنے سے قاصر رہے۔

یہ یورپ کی زمین تھی جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی حقیقی معنوں میں اُگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک تناور درخت میں بدلتے چلے گئے۔ ٹیکنالوجی نے جناتی کارخانوں کو جنم دیا جہاں کام کرنے کے لئے سادہ کھیت مزدور کی بجائے پیچیدہ خودکار مشینوں کو بنانے کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ انجینئر اور چلانے کے لئے ہنرمند اور قدرے پڑھے لکھے صنعتی مزدور درکار تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے سائنسی ماحول میں آنکھ کھولی اور اسی سے اپنے حقوق کا ادراک کشید کیا۔ جمہوریت جو کہ حقوق سے آگاہی کا ناگزیر نتیجہ تھی، ان کے سامنے پلی بڑھی اور ارتقاء پذیر ہوئی اور یوں شعور سے گزرتی ہوئی لاشعوری انداز میں ان کا اندازِ زیست بن گئی۔ ہمارے یہاں جناتی کارخانے ضرور بنے مگر ادھار کی سائنس اور ٹیکنالوجی سے۔ ان کارخانوں کے مالکان یا تو جاگیردار تھے اور یا پھر اونچے نودولتیے جو کہ سرتاپا ملکیت کے خمار میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہوں نے مزدوروں کو بھی غلام نما مزارع ہی جانا۔ چونکہ ریاستی امور بھی انہی کے بھائی بندوں کے ہاتھ میں تھے سو اپنی صنعتیں چلانے کے لئے انہیں کسی اخلاقی اور قانونی ضابطے کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ عوام الناس اور مزدوروں کو قسمت کے درس میں الجھانے اور پھنسانے کے لئے انہیں مذہبی ہتھکنڈوں سے لیس علماء اور مولویوں کی کمک دستیاب تھی۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ ہمارا سماج ایک خاص طرح کی جاگیردارانہ مذہبی سوچ کا اسیر تھا جس کی بنا پر اس کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو ایک علمی مظہر کے طور پر سمجھ پاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ آج اکیسویں صدی میں بھی ہم مذہب اور سائنس کے درمیان ایک ناقابلِ قبول تضاد کے ساتھ جی رہے ہیں۔ صورت یہ ہے کہ ہم عملی طور پہ سائنس کی ہر نعمت سے فائدہ اٹھانے کو تیار ہیں لیکن ذہنی طور پر اسے اپنے مذہبی عقائد کے لئے سب سے عظیم خطرہ بھی سمجھتے ہیں۔ ایسے میں یہ ممکن ہی نہیں کہ سائنسی علم اور اسکے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیاں مثبت انداز میں ہمارے شعور کا حصہ بن کر لاشعوری انداز میں ہماری روزمرہ زندگی میں بے

ساختگی کے ساتھ عمل پذیر ہو سکیں۔

ہم ابھی تک عورت کو ایک مکمل جیتے جاگتے اور فیصلہ کرنے والے وجود کے طور پر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہماری تربیت اور تعلیمی نصاب عورت دشمنی کے تصورات سے لبریز ہے۔ فلسفے اور سائنسی تعلیم کو نصاب کا باقاعدہ حصہ بنائے بغیر یہ تبدیلی ممکن نہیں ہوگی۔ جدید علوم کو پرائمری سطح سے نصاب کا حصہ بنانا ہوگا۔ ٹی وی چینلز پر جدید سماجی نظریات کو زیرِ بحث لانا ہوگا۔ معاملات کو محض مذہبی حوالوں کی بجائے جدید علوم کی بنیاد پر دلیل کے ساتھ سمجھنا ہوگا۔ ان موضوعات پر زیادہ سے زیادہ لکھنا ہوگا تاکہ تبدیلی کے لئے تیز رفتاری کے ساتھ ذہن سازی کی جا سکے۔ جوں جوں سوسائٹی عورت پر ہمہ جہت شعبۂ ہائے تعلیم اور کام کے راستے کھولتی جائے گی جہیز کی لعنت کم ہوتی چلی جائے گی۔

پہلی بات تو یہ کہ ہمیں تعلیمی نصاب سے بے جا قسم کے غیر عملی اخلاقی اسباق کو نکال کر زندگی کے بارے میں تفہیم کو بہتر بنانے والی معلومات شامل کرنا ہوں گی۔ ایسی مذہبی اساطیر سے درگزر کرنا ہوگا جنہیں علمی اور سائنسی دلائل کے ساتھ ثابت کرنا ممکن نہیں۔ سماجی مضامین کو فضول قسم کی رطب و یابس سے پاک کر کے سماجی سائنس کی سطح پر لانا ہوگا۔ صحتِ عامہ کے ساتھ ساتھ تولیدی صحت کے بارے میں معلومات کو درجہ بدرجہ نصاب میں شامل کرنا ہوگا۔ عورت اور مرد کے بارے میں مروجہ امتیازی تصورات کو نصاب سے خارج کرنا ہوگا۔ ابتدائی درجے سے اعلیٰ ترین درجوں تک مخلوط تعلیم کو رواج دینا ہوگا تاکہ دونوں اصناف میرٹ کی بنیاد پر اپنی اپنی اہلیت ثابت کر سکیں۔ مخلوط تعلیم کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ دونوں اصناف کی ایک دوسرے کے بارے میں مریضانہ حساسیت، جو کہ کئی طرح کے جرائم اور خرابیوں کا باعث بنتی رہتی ہے، اس کا خاتمہ ممکن ہوگا۔ مرد ذات کے بارے میں عورتوں کا تصور بہتر اور نارمل ہو جائے گا اور ان کی ذات اعتماد سے بہرہ مند ہو سکے گی۔

بند ماحول اور سیکسوئل فرسٹریشن

بھوک چاہے جنس کی ہو یا پیٹ کی، انسان کی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ بھوکے آدمی کی صورتحال یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر جگہ، ہر وقت اپنی بھوک مٹانے کی تاک میں رہتا ہے۔ بلاشبہ ہماری مڈل کلاس اجتماعی طور پر جنسی بھوک سے بدحال ہے۔ اس بھوک کو مٹانے کے لیے عورتوں کے مقابلے میں مردوں کو زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ ان کے لیے طوائفوں کا ادارہ موجود ہے۔ وہ چاہیں تو ان کے اڈے پر چلے جائیں اور چاہے انہیں اپنی جگہ پر بلا لیں۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ رات بھر کے لیے کسی لڑکی کو بلایا جاتا ہے اور اس سے کئی کئی دوست اپنی جنسی بھوک مٹاتے ہیں۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ عورت کیا کرے کہ اسے یہ مواقع دستیاب نہیں ہیں۔ وہ تو ہمہ وقت خاندان کیا پورے محلے کی نظروں کی قید میں ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ لڑکیوں اور عورتوں کو یہ مواقع بالکل ہی نصیب نہیں۔ یہ مواقع انہیں گھر میں آ کر ٹھہرنے والے کزنز کی شکل میں دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر لڑکی کی سیکسوئل فرسٹریشن ایک حد سے بڑھی ہوئی ہو تو وہ آنے والے مہمان کو بڑی آسانی سے اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ ایسی دعوت کے نتیجے میں جہاں کئیوں کی موج بن جاتی ہے وہاں کئیوں کی جان پہ بھی بن آتی ہے، مگر یہ عام طور پر اناڑی قسم کے کھلاڑی ہوتے ہیں جو بعد میں ہاتھ ملتے ہیں کہ ہائے ایسا قیمتی موقع ہاتھ سے کیوں جانے دیا۔

سیکسوئل فرسٹریشن ایک بے محابہ طاقت ہے جو ہر صورت میں فرد کی بربادی کا باعث بنتی ہے۔ ایسا فرد یا تو اسے دبانے کی کوشش میں اندرونی توڑ پھوڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یا پھر وہ کسی نہ کسی موقعے کی تلاش میں رہتا ہے جس سے نہ صرف وہ اپنا کردار تباہ کر بیٹھتا ہے بلکہ معمولاتِ زندگی سے کٹ کر مستقبل کو بھی برباد کر لیتا ہے۔ ایک تیسرا راستہ خودلذتی کا بچتا ہے جس کی معمول سے ہٹ کر زیادتی صحت اور نفسیات دونوں کو برباد کر ڈالتی ہے۔

عام مشاہدہ ہے کہ جن گھرانوں میں مذہب یا رواج کی بنیاد پر پردے کی سخت پابندیاں عائد ہوتی ہیں ان گھرانوں کی لڑکیوں کو ذرا سا موقع ملنے پر بھی با آسانی لبھایا اور بہکایا جا سکتا ہے۔ سماج سے کٹے ہونے کی وجہ سے وہ مردوں کو پرکھنے کے ہنر سے بالکل محروم ہوتی ہیں اور مزید یہ کہ پابندیاں ان کے تجسس کو دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ بڑھا دیتی ہیں۔ ان کا محبوب چونکہ تصوراتی ہوتا ہے سو وہ کسی رومانٹک ناول یا فلم کے ہیرو سے کسی صورت کم نہیں ہوتا۔ کسی بھی مرد کی جانب سے چھوئے جانے کی حرکت ممکن ہے ان پہ شدید شاق گزرے مگر ان کا رومانی گفتگو کے رنگین جال سے بچنا محال ہوتا ہے۔ یہ رومانی گفتگو ان کی حسیات کو انتہائی آسانی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور یوں وہ اپنے غلط یا صحیح محبوب کی خاطر تن من دھن سبھی کچھ وارنے پہ تیار ہو جاتی ہیں۔ ماضی قریب میں ایسا ہی ایک واقعہ ہوا تھا جس میں ایک معروف عالمِ دین کی سخت پردے میں پلی بڑھی بیٹی اپنے ٹیوٹر کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی جو اسے پردے کے دوسری جانب بیٹھ کر پڑھاتا تھا۔ وہ لڑکی جانتی تھی کہ معروف مذہبی شخصیت کی بیٹی ہونے کے ناطے وہ کس طرح کی سزا سے دوچار ہو سکتی ہے مگر مرد سے نارسائی نے اس کے جنسی اور جذباتی وجود کو اتنا بھڑکا دیا تھا کہ ہر طرح کا رسک لے کر نوجوان کے ساتھ چلی گئی۔ بعد میں یہ معاملہ ہائی کورٹ تک گیا اور پھر عاصمہ جہانگیر کے ادارے نے جوڑے کو بحفاظت بیرون ملک پناہ دلوائی کیونکہ یہاں رہنے کی صورت میں دونوں کے قتل ہو جانے کا خطرہ تھا۔ گویا ہم جس خطرے کے ڈر سے یہ بند باندھتے ہیں، یہی بند اس خطرے کا دروازہ بن جاتے ہیں اور ہمارے اربابِ اخلاق مسئلے کی نوعیت کو سمجھے بغیر انہی رخنہ زدہ بندوں کو اوپر اوپر سے مضبوط کرنے میں

لگے ہیں۔

مڈل کلاس کی شریف لڑکیاں

ہم یہاں قدرے پڑھی لکھی مڈل کلاس کی لڑکیوں کی بات کرتے ہیں جن کے ذہن میں بچپن سے اپنے کنوار پن کی حفاظت کا خیال راسخ کر دیا جاتا ہے جوان کے ضمیر کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ان کی جنسی خواہش انہیں تنگ نہیں کرتی۔ بالکل کرتی ہے مگر گناہ کا احساس انہیں مرد کے قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔ یہ بظاہر ایک بڑی خوش آئند بات دکھائی دیتی ہے کہ شادی کے لمحے تک لڑکی اپنی عصمت کی حفاظت کرنے میں کامیاب رہتی ہے۔ مگر اس کے سوا کون جانتا ہے کہ یہ ''کامیابی'' اسے کیسی کیسی فطری خوشیاں قربان بلکہ برباد کر کے نصیب ہوتی ہے۔ یہ کامیابی اس کی نارمل زندگی کو بری طرح سے ڈسٹرب کر دیتی ہے۔ اسے ایک ڈرے ہوئے وجود میں بدل دیتی ہے جس سے اس کی شخصیت کی اٹھان نارمل نہیں رہتی۔ وہ یوں زندگی گزارتی ہے جیسے کوئی کانٹوں بھری جھاڑیوں سے لباس کو بچا کر گزرتا ہو۔ بیک وقت اپنی جنسی خواہش سے لڑتی ہوئی اور اپنی عصمت کی حفاظت کے خوف میں پھنسی ہوئی لڑکی کیونکر نارمل زندگی گزار سکتی ہے۔ اس کے اندر تو ہمہ وقت ایک جنگ چھڑی رہتی ہے جو اسے اپنی ذات (جو کہ صلاحیتوں کا منبع ہے) کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتی۔ اس کا وجود ڈر، سہم اور خوف کا پنجرہ بن کے رہ جاتا ہے۔ بہت ہوا تو کبھی کبھار وہ جنسی خواہش کے منہ زور سیلاب کے ہاتھوں بے بس ہو کر اپنے ہی ذریعے اس کے نکاس کا بندوبست کر لیتی ہے جو اسے شدید احساسِ جرم میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنسی خواہش پر بے تحاشہ دباؤ پوشیدہ بیماریوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو مزید نفسیاتی خلجان پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ کئی تو جنسی دباؤ کی وجہ سے ہسٹریا کا شکار ہو جاتی ہیں جسے نا سمجھ والدین جن چمٹ جانے کا نام دیتے ہیں اور اپنی بیٹی کو علاج کے لیے چالاک عاملوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔

ایسی لڑکیوں کا شادی کے بارے میں تصور آئیڈیل حد تک رومانٹک بھی ہوتا ہے اور خوف زدہ کرنے والا بھی۔ یہ لڑکیاں اپنے سارے رومانی خواب ہونے والے (اجنبی) شوہر کے تصور کے ساتھ وابستہ

کر لیتی ہیں۔ شادی میں اگر دیر ہونے لگے تو ان کا انتظار اپنا لطف کھو کر اذیت میں بدلنے لگتا ہے۔

بہر حال ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب وہ دھڑکتے دل کے ساتھ حجلۂ عروسی میں اپنے جیون ساتھی کی منتظر بیٹھی ہوتی ہیں۔ یہ لمحے عجب خوف اور لطف کا ملغوبہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بدن میں جاگنے والے جذبوں کی پکار سے تو آگاہ ہوتی ہیں مگر تجربے کی محرومی کی بنا پر ان جذبوں کی گہرائی کا انہیں اکثر ادراک نہیں ہوتا۔ یہ لمحے جوئے جیسے ہوتے ہیں، پانسہ الٹا بھی پڑ سکتا ہے اور سیدھا بھی۔

مردوں کی اکثریت سرعتِ انزال کا خوف لئے حجلۂ عروسی میں داخل ہوتی ہے۔ اور اکثر وہی ہوتا ہے جس کا انہیں خوف ہوتا ہے۔ عورت کے بدن کی تپش انہیں موم کی طرح پگھلا دیتی ہے۔ عورت کا بدن بھڑکنے بھی نہیں پاتا کہ مرد کی مردانگی کا چراغ آناً فاناً بھڑک کے بجھ بھی جاتا ہے۔ عورت اذیت کے ساتھ سوچتی ہے کہ کیا یہی وہ لمحہ تھا جس کے لئے اس نے طویل عرصہ تک اپنی خواہشات کو سوسائٹی اور اپنے ضمیر کی طرف سے نافذ کردہ اخلاقی جبر کی بھاری سِل تلے دبائے رکھا۔ ارے یہ مرد تو نرا نامرد نکلا۔ مگر وہ کوئی بات بھی زبان پر نہیں لاسکتی کیونکہ وہ عورت ہے۔ وہ تو نکاح کے نام پر خود پر مسلط ہونے والے مرد سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ اگر تم میری بنیادی ترین بھوک بھی نہیں مٹا سکتے جو صرف اور صرف تمہاری ذمہ داری تھی، تو میرے پاس لینے کیا آئے تھے؟ وہ واقعی کچھ نہیں بول سکتی کیونکہ وہ ایک مشرقی عورت ہے، ایک ڈری سہمی بزدل عورت۔ بولے گی تو بے حیا کہلائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسکے ہاتھ میں ویسے سے پہلے ہی طلاق کا کاغذ تھما دیا جائے۔

شادی کوئی آسان اسائنمنٹ تو ہے نہیں۔ پہلے تو رشتہ ڈھونڈنا ہی کسی عذاب سے کم نہیں۔ مل جائے تو پھر لاکھوں کے خرچے سے بیٹی کی رخصتی۔ طلاق کا مطلب ہوا ماں باپ کی پہلے سے خوفزدہ عزت کی نیلامی اور اوپر سے لاکھوں کا نقصان۔ سو فیصلہ یہی ٹھہرتا ہے کہ اسی 'نامرد' کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا جائے۔ کئی مرد دوسری تیسری کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں اور گاہے بگاہے کامیاب رہتے ہیں مگر کئی تمام عمر ناکام ہی رہتے ہیں۔ عورت کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے بدن کی جائز ترین فطری تسکین کی محرومی پر احتجاج بھی نہیں کر سکتی۔ سماجی اور اخلاقی ضابطے اس سے یہی تقاضہ کرتے ہیں کہ وہ بقیہ عمر

محض روٹی کپڑے یا چند آسائشوں اور مرد سے ملنے والے نام کے بدلے ایک ادھورے مرد کے ساتھ گزار دے اور اپنے ان والدین کی ''عزت'' کی لاج رکھے جو اس کے لیے مناسب رشتہ ڈھونڈنے کی صلاحیت سے بھی عاری ہیں۔

ہمارے سماج میں عورت ہونے کا عمومی مطلب ہے ادھورے مرد کی غلامی، جو اسے مکمل جسمانی تسکین فراہم کرنے کے فن سے ناآشنا ہے۔ جو مردانگی کی بجائے محض مردانگی کے غرور سے بھرا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ پورے طمطراق سے بیوی کے لئے یہ حکم بھی موجود کہ وہ اس ادھورے مرد کی عمر بھر وفادار رہے اور سالہا سال درد زہ سے بھی گزرتی رہے۔ مردوں کے لئے یہ صورتحال بالکل نارمل ہے۔ بیوی کی عدم تسکین کی انہیں اصلاً کوئی فکر نہیں۔ فکر ہے تو بس اس بات کی کہ کہیں وہ اس کی مردانگی کا راز فاش نہ کردے۔ مرد پردھان ہونے کے ناطے سماج اس مسئلے پر مجرمانہ خاموشی اختیار کیے بیٹھا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ عورت اپنی اس اذیت ناک محرومی کا تذکرہ زبان پر لائے۔ مگر کیا کسی بھوک کے مارے ہوئے شخص کا یہ بتانا جرم یا گناہ ہے کہ اسے کھانے کی طلب ہے؟ یہ کیا بات ہوئی کہ ایک جانب تو مرد عورت کی جسمانی تسکین کرنے سے عاری ہو اور اوپر سے مذہب، روایات اور اخلاقیات کا ناجائز سہارا لے کر اسے ایک اذیت ناک زندگی گزارنے پر بھی مجبور کردے؟

ہم نے ازل سے یہ طے کر رکھا ہے کہ جسمانی رشتے میں مرد فاعل اور عورت مفعول ہے۔ اس کے لئے ہم بہت سے جانوروں کی مثالیں بھی دیتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ جانوروں کی طرح ہم محض جبلی نہیں شعوری وجود بھی رکھتے ہیں۔ جانوروں کی طرح انسانوں میں یہ رشتہ موسمی نہیں ہوتا کیونکہ جانور فطری ماحول کے اثرات کے قیدی ہیں جبکہ انسان جہاں چاہے اپنی مرضی کا ماحول تخلیق کر لیتا ہے۔ وہ لُو سے جھلستی دوپہروں میں اپنی عمارتوں کو برف خانوں میں بدل لیتا ہے اور یخ برفانی موسم میں کمروں کے اندر جسم کو راحت پہنچانے والی گرمی پیدا کر لیتا ہے۔ سو اگر ہم واقعی خود کو جانوروں سے الگ شعوری وجود سمجھتے ہیں تو پھر ہمیں مرد عورت کے جسمانی تعلق کو جبلت کی سطح سے اوپر اٹھ کر دیکھنا ہوگا۔ یقین کیجئے اگر یہ رشتہ صرف جبلی ہوتا تو نہ تو مردوں کو اپنی مردانگی کا راز کھلنے کا کوئی خوف ہوتا اور نہ ہی

عورتوں کو ان سے عدم تسکین کی کوئی شکایت۔

ایک معنی میں مرد اور احساسِ ملکیت ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ اسی طرح عورت اور غلامی بھی ہم معنی ہیں۔ غلامی ان معنوں میں کہ وہ اپنی زندگی کے چھوٹے بڑے فیصلوں میں مرد کی مرضی کی محتاج ہے۔ بظاہر یہ بات مرد کی انا کو تسکین پہنچانے والی ہے مگر یہی تسکین اسے زندگی کے بہت بڑے لطف سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ اسے عورت کو مفعول بنانے یعنی اپنے نیچے لگانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ بستر کے تعلق میں بھی وہ اسی ذہنیت کا مظاہرہ کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ عورت کو جسمانی اور ذہنی دونوں سطحوں پر ہار بیٹھتا ہے۔ بس نکاح کے نام پر ایک بے بس جسم اس کے تصرف میں رہتا ہے جسے وہ اپنی یک طرفہ ہوس پوری کرنے کے لئے جب چاہے خشک ہڈی کی طرح جھنجھوڑ لے۔

بستر کے تعلق میں مکمل تسکین عورت کا کوئی غیر اخلاقی مطالبہ ہرگز نہیں کہ اس کے اظہار پر ناجائز پابندیاں عائد کی جائیں۔ یہ تو سراسر اس کا جائز فطری حق ہے۔ بستر کے رشتے میں ہم آہنگی کے فقدان کی ذمہ داری سراسر مرد پر عائد ہوتی ہے۔ مگر اس کے لئے اسے اپنی مردانگی کی وہ جھوٹی قبا اتارنا ہوگی جس میں اس کی نامردی کی اصل وجہ چھپی ہے۔ اسے مردانگی اور پردھانگی کے سنگھاسن سے اتر کر عورت کے ساتھ برابر کھڑا ہونا پڑے گا۔ اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ نہ تو عورت کمتر ہے اور نہ ہی وہ برتر، بلکہ دونوں ایک دوسرے کے برابر کے ساتھی ہیں۔

عورت کو اپنے برابر نہ ماننے کا یہ نتیجہ ہے کہ مرد جسمانی تعلق میں سراسر اپنی من مانی کرتا ہے۔ وہ بیوی سے کبھی یہ پوچھنے کی زحمت نہیں کرتا کہ وہ ان لمحات میں کیا چاہتی ہے۔ اس کے لئے بیوی کی حیثیت ایک سانس لیتے ربڑ نما وجود سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی جس کی سسکاریوں کی آواز اس کی سماعت کو بہت مرغوب ہوتی ہے۔ لیکن یہ مرغوب آواز اکثر اسے نصیب نہیں ہوتی۔ کیونکہ بیوی کو اس منزل تک پہنچانے سے پہلے ہی وہ کپڑے جھاڑ چکا ہوتا ہے۔

یہ سراسر یک طرفہ تعلق کا المیہ ہے جسے مرد کی مردانگی ہی اسے سمجھنے نہیں دیتی۔ وہ عورت کو خاموش رہنے کا حکم دے کر اس کی لذت بھری سسکاریوں کی آواز سننے کا متمنی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کے لئے

اسے عورت کو اپنا سچ بیان کرنے کی آزادی دینا ہوگی۔ وہ سچ جو وہ صرف ایسے شریک حیات سے ہی سانجھا کر سکتی ہے جس کے سامنے اسے اپنے کسی بھی طرح کے سچ پر شرمندہ ہونے کا خوف نہ ہو۔

عورت اپنے بدن کے حساس منطقوں کے بارے میں مرد کے مقابلے ڈھیر زیادہ واقف ہے۔ مگر بہت کچھ جاننے کے باوجود وہ اپنا آپ بیان کرنے سے ڈرتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اگر اس نے شوہر کے طریق سے ہٹ کر اپنے بدن کا تسکین دینے کا کوئی مشورہ دیا یا مطالبہ کیا تو وہ نہ صرف اسے اپنی انا کے لئے تازیانہ سمجھے گا بلکہ اس کے کردار پر بھی انگلی اٹھائے گا۔ اس کے نزدیک عورت کے باکردار ہونے کا مطلب یہی ہے کہ وہ جنسی معاملات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بے خبر ہو۔ مرد عورت کے احساس اور جنسیت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے کہ وہ عورت سے جنسی تسکین حاصل کرے جبکہ یہ تسکین بے چون و چرا فراہم کرنا عورت کا مذہبی فریضہ ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہ عورت کی کوکھ کو بارآور کر سکتا ہے۔ بلکہ وہ کوکھ کی بارآوری پر پھولے نہیں سماتا کیونکہ وہ اسے سماج کے سامنے اپنی مردانگی کے تصدیقی سرٹیفکیٹ کے طور پر پیش کرتا ہے۔

مرد اگر عورت کو اپنی بات بیان کرنے کا اذن دے دے تو اس کے سر پر لدے بہت سے ناجائز بوجھ اتر سکتے ہیں اور دل و دماغ پر پڑے کئی دبیز پردے ہٹ سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے اسے خود کو عورت کی جگہ پر رکھ کر سوچنا ہوگا۔ عورت سے اس کی جنسی تسکین کے رموز معلوم کرنا ہوں گے۔ اپنی نام نہاد مردانگی کی خلعتِ فاخرہ اتار کر ایک طرف پھینکنا ہوگی اور پھر اس سے پوچھنا ہوگا اس کے دل اور بدن کے مطالبے کیا ہیں۔

مرد کے تئیں جنسی عمل یک طرفہ ہے جس میں عورت کی حیثیت محض لطف دینے والے مفعولی وجود سے زیادہ کچھ نہیں۔ زیادہ کھلے لفظوں میں کہا جائے تو وہ عورت کے ساتھ سیکس کرتا ہے مگر اسے کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ دراصل ملکیت کے جذبے سے لتھڑے مرد کا مائنڈ سیٹ ہے جس کا سبق ماں کی گود سے شروع ہوتا ہے۔ اسے پہلے دن سے بتایا جاتا ہے کہ وہ عورت کے مقابلے میں ایک حاکم وجود ہے۔ اس کی پیدائش اس کی ماں کی حیثیت کو سسرال میں مضبوط بنانے کا باعث ہے۔ جبکہ لڑکی کی

پیدائش ماں کی خانگی سیکیورٹی کے لئے خطرے کاالارم۔

مرد کی یک طرفہ اور خود غرضانہ سوچ نے صرف عورت کو نہیں بلکہ خود اس کو بھی برباد کر ڈالا ہے۔ وہ سیکس کی خواہش میں اس قدر الجھ جاتا ہے کہ اس کی تسکین کے حقیقی علم سے کبھی آشنا نہیں ہو پاتا۔ اس کے تئیں یہ عمل کم و بیش اتنا ہی سادہ ہوتا ہے جیسا کہ جانوروں میں۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھ پاتا کہ اگر جسمانی رفاقت کا عمل اتنا ہی سیدھا اور سادہ ہے تو پھر عورت کی جانب بے پناہ کشش ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی جنسی طاقت کا بھرم کھلنے کے خوف میں کیوں مبتلا ہوتا ہے۔ ناتجربہ کار ہونے کی صورت میں وہ پہلی رات بیوی کے پاس جانے سے پہلے دواؤں اور اور حکیمی ٹوٹکوں کا سہارا کیوں لیتا ہے۔ ہمارے شہروں اور دیہاتوں کی دیواروں پر جابجا لگے اور لکھے حکیموں کے اشتہار مرد کے اسی خوف کا اعلان ہیں۔

عورت ایک سماجی پراڈکٹ ہے نہ کہ صرف ایک بایولاجیکل وجود۔ اس پر موسم اور مناظر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور لوگوں کے رویئے بھی۔ وہ جاگتی آنکھوں کے خواب بھی دیکھتی ہے۔ وہ کہانیاں بھی پڑھتی ہے اور فلم بھی دیکھتی ہے۔ اس کے ذہن میں اپنی طرز کے ایک آئیڈیل محبوب کا تصور ہوتا ہے۔ ایک خوبی جو ہر عورت اپنے محبوب مرد میں دیکھنے کی متمنی ہوتی ہے وہ یہ کہ اسے کیئرنگ یعنی بہت خاص انداز میں احساس رکھنے والا ہونا چاہئے۔ وہ بستر کے تعلق میں کسی وحشی مرد کی ہرگز خواہشمند نہیں ہوتی جو اس کی چیخیں نکلوادے۔

اس کے برعکس مرد کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ پہلی رات ہی کسی طور عورت کی چیخیں نکلوا کر اپنی مردانگی ثابت کر دے۔ اس کے نزدیک عورت انسان نہیں بلکہ کسی دشمن کا قلعہ ہے جسے ہر حال میں فتح کرنا ہے۔ مگر ایسا مرد ایک بدعائے ہوئے فرد کی زندگی جیتا ہے۔ اسے تاعمر عورت کی حقیقی محبت اور رفاقت نصیب نہیں ہوتی۔ وہ عورت کے بدن کو رگید سکتا ہے، اس پر اپنی ہوس کے گھوڑے دوڑا کر اسے روند سکتا ہے مگر اس کی محبت کی حاصل نہیں کر سکتا۔

ایسی عورت ہمیشہ ایک محبوب کے انتظار میں رہتی ہے جس کی حیثیت اس حبس زدہ جیل میں ایک خوشگوار جھونکے کی سی ہوتی ہے جہاں اس کا بدن اور روح دونوں سولی پر ٹنگے رہتے ہیں۔ ہم جس سماج میں

رہتے ہیں وہاں شکاری مردوں کی کوئی کمی نہیں۔ سو عورت کو برا یا بھلا محبوب حاصل کرنے کے وافر مواقع دستیاب ہوتے ہیں۔ ہاں بس اس کے لیے تھوڑی سی جرأت اور چالاکی درکار ہوتی ہے۔ اکثر یہ مواقع کسی قریب ترین سسرالی رشتہ دار یا شوہر کے ''قابلِ اعتماد'' دوست کی شکل میں بھی دستیاب جاتے ہیں جو کہ عورت کے لیے زیادہ سہولت کی بات ہے۔ ورنہ موبائل اور انٹرنیٹ سے کم از کم ذہنی تسکین کا کام تو ضرور لیا جا سکتا ہے۔

اخلاق کے نام پر بداخلاقی

ہماری سوسائٹی میں پر چلت اخلاقیات کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نے بداخلاقی کو عین اخلاق کا درجہ دے دیا ہے۔ اس سے بڑا ظلم یا بداخلاقی کیا ہو سکتی ہے کہ کسی عاقل اور بالغ فرد کو نام نہاد اخلاقیات کے نام پر اس کی زندگی کے اہم ترین فیصلے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے ہاں ننانوے فیصد سے بھی زیادہ شادیاں والدین یا خاندان کے دوسرے بزرگوں کی مرضی سے طے پاتی ہیں جن میں خود شادی کرنے والوں کی حقیقی مرضی کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اکثر تو یوں ہوتا ہے کہ بزرگ اپنی بے معنی خوشی کی خاطر بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کے رشتے طے کر دیتے ہیں۔ کئی بار جوان اولاد کو رشتہ طے ہو چکنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شادی کس سے طے پا چکی ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کئی بار بیمار ماں یا باپ اپنی زندگی کی آخری خوشی پوری کرنے کا واسطہ دے کر اولاد کی جذباتی بلیک میلنگ کرتے ہیں اور یوں اَن مل بے جوڑ رشتوں کا باعث بنتے ہیں۔ اکثر اوقات اولاد کو ایسے رشتوں کا بھگتان والدین کے بعد ساری عمر بھگتنا پڑتا ہے۔

یہ سارے کام 'اعلیٰ' اخلاقیات اور صدیوں سے چلی آ رہی روایات کے نام پر کیے جاتے ہیں جن کے نتائج اولاد اور ان کی آنے والی نسلوں کے حق میں بہت تباہ کن نکلتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ کہ غلط نتائج کے تسلسل کے باوجود ہم اپنی روش بدلنے پر تیار نہیں ہوتے۔ سوسائٹی میں رائج اخلاقی نظام اور کلچرل روایات کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کی زندگی کو پہلے سے زیادہ سہل بنائے، مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ سماج کا دانشور طبقہ تجزیاتی صلاحیتوں کا حامل ہو بلکہ اپنی تحریروں سے عوام

اور حکمرانوں کو روایات میں ضرورت کے مطابق تبدیلیوں کی طرف مائل بھی کر سکتا ہو۔

ہماری زبان میں ایک لفظ ہے احترام، جس کا بہت ناجائز استعمال ہوتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر احترام ایک اعلیٰ اور مثبت قدر ہے تو اس پر عمل کرنے کے نتائج بھی خوشی اور سکون کا باعث بننے چاہئیں۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہمیں اس قدر کے ساتھ جڑے اپنے تصورات اور عمل کو سنجیدگی سے زیر غور لانا چاہیے۔ ہمارے مروجہ طرز عمل میں احترام کا ایک مطلب ہے بزرگوں کی غلط باتوں کو بھی بنا دلیل اور غور و فکر کے قبول کر لینا، چاہے کل کو اس کے نتائج کتنے ہی بھیانک کیوں نہ نکلیں۔ میں ذاتی طور پر ایسے بہت سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو جانتا ہوں جنہوں نے احترام کے نام پر اپنے بڑوں کے غلط فیصلوں کو مان کر اپنی زندگی بربادی کی بھینٹ چڑھا دی۔ کئی والدین ایسے بھی ہیں جنہیں میں نے اپنی اولاد کی اذیت پر بعد میں پچھتاتے دیکھا۔ مگر کیا کیا جائے کہ بہتے دریا میں دوبار قدم نہیں رکھا جا سکتا۔

ملازمت پیشہ خواتین

یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ کام یا پیشے کی نوعیت فرد کی شخصیت پر اپنے اثرات مرتسم کرتی ہے۔ دوسرے بہت سے عوامل کے علاوہ یہ کاموں کا فرق بھی ہے جو عورت کو عورت کا اور مرد کو مرد کا روپ دیتا ہے۔ جن کاموں کا تعلق کمائی سے جڑا ہوتا ہے وہ کرنے والے کو لامحالہ ایک خاص طرح کی اہمیت اور اعتماد بخشتے ہیں۔ مرد کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ کما کر لاتا ہے لیکن ہمارے ہاں معیشت میں حصہ ڈالنے کے باوجود عورت کو اہمیت نصیب نہیں ہوتی۔ کام عورت کی شناخت نہیں بن پاتا بلکہ الٹا اسے کئی اور طرح کے چکروں سے دوچار کر دیتا ہے۔ وہ جو کماتی ہے اس کا کم و بیش آدھا حصہ تو اسے خود کو آفس میں پریزنٹیبل بنانے کے لئے خرچ کرنا پڑ جاتا ہے۔ اور پھر وہ گھر کی کفالت میں معاون بننے کی بنا پر شوہر کی مردانگی کے لئے چیلنج بن جاتی ہے۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ مرد اگر "مردانگی" کا مظاہرہ نہ کرے تو وہ یہ منصب خود سنبھال لیتی ہے۔ اس کے دماغ میں یہ بات گھس جاتی ہے کہ جیسے یہ گھر صرف اور صرف اسی کی کمائی سے چل رہا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ گھر میں صنفی توازن بدل جاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں اکثر شوہر کی 'مردانگی' کو شدید دھچکا لگتا ہے اور میاں بیوی کے رشتے میں ناقابلِ مرمت دراڑیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ مردانگی کے ناجائز فخر سے بھرا مرد نہیں چاہتا کہ عورت اس کے مقابل آن کھڑی ہو۔

عموی طور پر یہ مقابلہ صلاحیت کا نہیں بلکہ کمائی کا ہوتا ہے۔ عورت جانتی ہے کہ مرد کمائی کی بنیاد پر ہی دھونس جماتا ہے نہ کہ کسی خاص کام کی صلاحیت یا کمانڈ کا، سو وہ بھی کمائی کے ہتھیار سے ہی اس کی دھونس کا مقابلہ کرتی ہے۔ ہاں اگر مقابلہ صلاحیتوں کا ہو تو دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھ سکتے

ہیں اور مقابلہ بازی کے منفی پہلوؤں سے بھی بچ سکتے ہیں۔ بد قسمتی سے ہماری سوسائٹی میں ابھی تک محض صلاحیتوں کی بنیاد پر فرد کو عزت دینے کا ادراک پیدا نہیں ہوا۔ یہاں صلاحیتیں بھی تبھی اہمیت اور پہچان پاتی ہیں جب وہ ایک بڑی آمدنی کا موجب بن جائیں۔ یعنی ہمارے ہاں فرد کی اہمیت اس کی صلاحیت اور رویوں سے نہیں بلکہ اس کی معاشی حیثیت سے طے ہوتی ہے۔ کوئی گلوکار بھلے کتنا ہی عمدہ کیوں نہ گاتا ہو اگر اس کا ہنر کمائی سے نہیں جڑا تو گھر والے بھی اسے گھاس نہیں ڈالتے بلکہ الٹا اسے مطعون کرتے ہیں۔ ہاں اگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹی وی سکرین پر جلوہ گر ہو جائے تو وہی گھر والے اپنے ایک ایک جاننے والے کو بڑے فخر سے اطلاع دے رہے ہوتے ہیں۔

اگر انسانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کام ہی فرد کی اصل شناخت ہے بشرطیکہ وہ من مرضی کا ہو۔ من مرضی کے خلاف کام بیگار سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا اور اس کے کرنے کی واحد وجہ پیسے کا حصول رہ جاتا ہے۔ ایسا کام عورت کی شخصیت کو نکھارنے اور سنوارنے کی بجائے مسخ کر ڈالتا ہے۔ اسے گھریلو ضرورتوں سے کہیں زیادہ ان کپڑوں کی فکر کھائے جاتی ہے جو اس نے آفس جانے کے لئے پہننے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو جگانے کی بجائے اپنے میک اپ پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ کولیگز اور باس کی نظریں اسے یہ باور کروانے کے لیے کافی ہوتی ہیں کہ کام پر کمانڈ سے کہیں زیادہ اس کی ادائیں، میک اپ اور لباس اس کی نوکری کے تحفظ کے ضامن ہیں۔ یہ ماحول اس کے اندر لاشعوری طور پر ایک محدود سا طوائفانہ رویہ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ہر روز اپنے نئے لباس یا ہیئر سٹائل پر اپنے کولیگز سے کوئی نہ کوئی ستائشی جملہ سنتی ہے تو اسے لگتا ہے کہ اس کا خاوند یا تو اندھا ہے اور یا پھر اس کی اہمیت اور محبت سے لاتعلق۔ وہ اس سے اپنی تعریف سننا چاہتی ہے مگر اسے ایک مسلسل سرد مہر خاموشی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

کولیگز اور شوہر کے رویوں کا یہ تفاوت پہلے تو اسے پریشان کرتا ہے اور پھر اسے کچھ اور ہی سوچنے پہ مائل کرنے لگتا ہے۔ وہ مرد کولیگز کے ستائشی جملے سنتے ہوئے بالکل نہیں سوچتی کہ یہ بھی اپنی بیویوں کے لیے اتنی ہی روٹین کی سرد مہری سے لبریز ہیں جتنا کہ اس کا اپنا شوہر۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگتی ہے کہ اگر وہ اپنے شوہر کی بجائے فلاں کولیگ کی بیوی ہوتی تو زندگی واقعی بڑی رومانی ہوتی مگر نہیں جانتی

کہ یہ نظروں کو دھوکہ دینے والا جادو کا وہ محل ہے جو کسی بھی لمحے غائب ہو سکتا ہے۔

اس کے سامنے کئی لڑکیاں اور خواتین ایسی بھی ہوتی ہیں جو اس صورتحال کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی ہوتی ہیں۔ کولیگ ان کے کام بھی کر رہے ہوتے ہیں اور نخرے بھی اٹھا رہے ہوتے ہیں۔ وہ ان سے حسد بھی کرتی ہے اور کولیگز کے ساتھ مل کر ان کی کردار کشی بھی اور کبھی کبھار خود بھی ان کی جگہ لینے کی خواہاں بھی۔ مگر اس کی سماجی مجبوریاں اور بچپن کی تربیت اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہیں۔

ہمارے ہاں ابھی وہ وقت نہیں آیا جب عورت واقعی اپنی صلاحیت کے مطابق کام سے جڑ پائے گی اور اپنے عورت پن کی بجائے ایک فرد کی حیثیت سے شناخت حاصل کر سکے گی۔ ابھی تو جاب کا مطلب پیسے اور معاشرتی سٹیٹس کا حصول ہے، جو مل بھی جائے تو سکون نصیب نہیں ہوتا بلکہ نفسیاتی بے چینیاں مزید گنجلک ہو جاتی ہیں۔

شادی کا ایک المناک پہلو

بیمار بن کر توجہ حاصل کرنے کا حربہ

شادی سے پہلے ہماری لڑکیاں اکثر نارمل صحت کی مالک ہوتی ہیں مگر شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی ان پر مختلف اقسام کی بیماریاں حملہ آور ہونے لگتی ہیں۔ ان بیماریوں میں سے اکثر کی وجہ طبعی کی بجائے نفسیاتی ہوتی ہے۔ جہاں تک طبعی وجوہات کا معاملہ ہے ہم کہہ سکتے ہیں ایک ایسی لڑکی جس نے ایک لمبے عرصے تک اپنی جبلت پر پابندی لگائے رکھی ہو اور جس نے ہمیشہ اس کام کو گناہ اور گندا سمجھا ہو، اس کے لئے اس عمل میں یکدم اتنی افراط سے شامل ہونا کئی مسائل کا باعث بن سکتا ہے۔ ایسے ہی جیسے بھوکے آدمی کو زیادہ کھانے سے بدہضمی ہو جائے۔ ہمارے سماج کے مرد تو ویسے بھی بہت ترسے ہوئے ہوتے ہیں سو وہ ساری کسر ہنی مون کے عرصے میں ہی نکال لیتے ہیں۔ جبکہ مڈل کلاس کی اکثر لڑکیاں اس صورتحال کے لئے پوری طرح تیار بھی نہیں ہوتیں اور نہ ہی انہیں ان معاملات سے باقاعدہ طور پر آگاہ کیا گیا ہوتا ہے۔

کئی حوالے سے یہ عرصہ لڑکی کے لیے خوشگوار بھی ہوتا ہے کہ اسے ضرورت سے کہیں زیادہ اہمیت مل رہی ہوتی ہے۔شوہر سمیت سبھی اس کے ناز اٹھار ہے ہوتے ہیں۔مگر عموعی طور پر خوش بختی کا یہ دور زیادہ عرصہ قائم نہیں رہتا۔وہ شوہر سے اب بھی شروع دور والے التفات اور تعریف کی توقع رکھتی ہے مگر اسے معلوم ہی نہیں پڑتا کہ وہ کب ایک اہم اور خاص انسان کے درجے سے پھسل کر عام عورت بن چکی ہے۔وہ دیکھتی ہے دیکھتے ہی دیکھتے شوہر کا معمول بدل چکا ہے۔اب اسے گھر پہنچنے کی کوئی خاص جلدی نہیں ہوتی۔فون بھی کرو تو ادھر سے جان چھڑوانے کا رویہ صاف محسوس ہوتا ہے۔اس کے ذمہ داریاں پوری کرنے کے کام میں شوق کی بجائے جھنجلاہٹ حاوی ہونے لگی ہے۔وہ شکوے شکائت کرتی ہے،لڑتی جھگڑتی ہے تو معاملات مزید اس کے خلاف ہی جاتے ہیں۔وہ ہر قیمت پہ پہلے دن والی اہمیت حاصل کرنا چاہتی ہے۔اس کے پاس اب ایک ہی حربہ بچا ہے۔یعنی کوئی ایسا طریقہ جس سے توجہ دوبارہ حاصل کی جا سکے۔

اس حربے کو سمجھنا ہو تو کبھی ایک تجربہ کر دیکھیں۔بس ایک چھوٹا سا کام کیجئے کہ اپنے ہاتھ پر یونہی ایک پٹی باندھ لیجئے اور اپنی گلی کا ایک چکر لگائیے۔آپ دیکھیں کہ آپ کا جاننے والا ہر شخص نہ صرف آپ کی جانب متوجہ ہوگا بلکہ خصوصی طور پر یہ پوچھے گا۔"بھائی خیریت تو ہے؟ یہ آپ کے ہاتھ کو کیا ہوا؟؟"اگر آپ جھوٹ موٹ کوئی کہانی سنائیں گے تو وہ علاج کے بارے میں مشورے بھی ضرور دے گا۔معذور یا زخمی افراد کی جانب متوجہ ہونا ہماری سوسائٹی کا ایک عام خاصہ ہے۔اسی نفسیات کو سمجھنے والے اکثر بھکاری خود کو مصنوعی طور پر معذور یا زخمی کے روپ میں پیش کرتے ہیں جبکہ حقیقت میں انہیں خراش تک نہیں آئی ہوتی۔

تو جناب شوہر کی توجہ سے محروم عورت کو بھی یہی طریقہ سوجھتا ہے۔وہ لاشعوری طور پر بیمار پڑنے یا کسی حادثے کے رونما ہونے کی خواہش کرنے لگتی ہے۔تاکہ کسی بھی بہانے وہ شوہر کا التفات دوبارہ پا سکے۔اس کا ذہن مسلسل اس کے جسم کو بیمار ہونے کا پیغام بھیجتا رہتا ہے۔اور ایک دن آتا ہے کہ ذہن میں پلنے والی یہ خواہش حقیقی بیماری کا روپ دھار لیتی ہے۔کسی کو مسلسل سر درد رہنے لگتا ہے،کسی کو تبخیر کا

مرض لاحق ہو جاتا ہے اور کوئی دل کو لے بیٹھتی ہے۔ یہ بیماریاں عورت کے لئے جہاں جسمانی اذیت کا باعث بنتی ہیں وہیں اسے یک گونہ تسکین کا احساس بھی ہوتا ہے، جیسے اس کا کوئی انتہائی خفیہ منصوبہ کامیاب ہو گیا ہو۔ اسے شوہر کا اس کے علاج پر پیسہ خرچ کرنا بہت تسکین بخش لگتا ہے۔ وہ ملنے جلنے والوں کو مسکین مگر خفتہ فخر سے لبریز لہجے میں بتاتی ہے کہ کتنے مہنگے ڈاکٹروں سے اس کا علاج ہو رہا ہے۔ اور اس کا شوہر اس کے علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہا رہا ہے۔

شادی شدہ عورتیں، مردوں کا آسان شکار

والدین پیدائش سے شادی تک خود کو مصیبت میں ڈال کر لڑکی کی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں۔ اکثر حالات میں بذاتِ خود مرد کا خوف بھی اس کی عصمت کا محافظ بن جاتا ہے۔ مرد سے جسمانی دوری کی وجہ سے ابھی اس نے سیکس کا مزا بھی نہیں چکھا ہوتا۔ بلکہ اس کی جنسی خواہش ابھی خاصی حد تک خیالی رومانویت کی طلسماتی بھول بھلیوں میں چھپن چھپائی کے کھیل سے لطف اندوز ہو رہی ہوتی ہے۔ وہ مرد کی توجہ بھی چاہتی ہے اور اس کی قربت سے ڈرتی بھی ہے۔ ایک جھجک ہمہ وقت اس پر نگران رہتی ہے۔ مگر شادی شدہ ہونے کے بعد ساری جھجک ایک ہی رات میں ازنچھو ہو جاتی ہے۔ اس پر اپنی جنسی خواہش کا طلسم آشکار ہو جاتا ہے۔ بدن اپنے مطالبے کی ماہیت اور شدت سے واقف ہو چکا ہوتا ہے۔ مگر مرد کے برعکس عورت کے بدن کی تسکین کا مطالبہ محض جسمانی نہیں ہوتا بلکہ وہ جنسی تعلق بنانے سے پہلے رومانی باتوں کی میٹھی میٹھی آنچ پر دھیرے دھیرے گرم ہونا چاہتی ہے، ابلنا چاہتی ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ مردوں کی اکثریت اس نازک اور باریک راز سے آشنا ہی نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک تو اوّل و آخر جسمانی ملاپ ہی اہم ہوتا ہے اور وہ بھی اکثر اپنی یکطرفہ تسکین کے لیے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں مرد عورت کو گنوا بیٹھتا ہے۔ وہ عورت کو محض جسمانی طاقت کے بل پر جیتنا بلکہ زیر کرنا چاہتا ہے۔ اس میں اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں۔ اسے تو بتایا ہی یہ گیا ہے کہ اصل مرد وہی ہے جو عورت کی توبہ کروا دے اور وہ ہاتھ باندھ کر کہے کہ حضور اب بس کر دیجیے! میں آپ کی مردانگی پر دل و جان سے ایمان لے آئی ہوں۔ ممکن ہے آپ نے بھی ایسے مردوں کے بارے میں کچھ سن رکھا ہو

جنہوں نے دواؤں کے بل پر اپنی مردانگی ثابت کرنے کے چکر میں پہلی ہی رات اپنی دولہن کو ہسپتال پہنچا دیا۔ مگر افسوس عورت کو یہ مرد مطلوب نہیں ہے۔ ہاں ممکن ہے ایسا مردان عورتوں کو ضرور مطلوب ہو جو شادی سے پہلے ہی یہ مزا کئی بار چکھ چکی ہوں اور ان کو گہرائی تک مطمئن کرنے کے لئے اسی طرح کے جنونی مرد کی ضرورت ہو۔

شادی کے بعد عورت کو ایک ناقابلِ پیشین گوئی حالات کا سامنا ہوتا ہے۔ اگر شادی کے ابتدائی ابتدائی زمانے میں جسمانی تعلق کا لطف مناسب طور پر نصیب ہو بھی جائے تو بوجوہ یہ صورت کچھ عرصہ بعد ہی بدلنے لگتی ہے۔ عورت کی لڑکپن سے بنائی گئی خیالی رومانویت کی طلسماتی بھول بھلیاں جلد یا بدیر ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بدلنے لگتی ہیں۔ شوہر جسے اس نے محبوب بنا کر پوجنا تھا، محض ایک سماجی تحکمانہ اتھارٹی بن کر رہ جاتا ہے جس کے حکم پر وہ اپنا جسم پیش کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

شادی کے تعلق میں دو کام لازماً ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا کہ پہلی ہی رات جسمانی تعلق کے حوالے سے اس کی جھجک ختم یا کم ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے اندر بھڑک اٹھنے والے الاؤ سے واقف ہو جاتی ہے۔ مگر وہ مرد کہاں ہے جو اس بھڑک اٹھنے والی آگ کو سرد بھی کر سکے۔ جتنا شوہر سے اس کی ناامیدی بڑھتی ہے اس کے اندر کسی محبوب نما دوست کا انتظار بھی بڑھنے لگتا ہے۔ ایک ایسا دوست جو پورے انہماک سے اسے روکے ٹوکے بنا اس کی ہر طرح کی کہانی نما باتیں سن سکے۔ اس کا کیتھارسز کروا سکے۔ اور پھر اپنی رومانی رسیلی باتوں سے اسے اس کے نامکمل رہ گئے خوابوں کی جنت کی سیر کروائے۔ اس کے بدن کو گنگناتی گفتگو کی آنچ پہ دھیرے دھیرے گرم کرے اور پھر وہ لمحہ آئے کہ وہ دہکنے لگے اور محبوب کی بانہوں میں موم بن کر پگھل جائے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ یہ پانچ پانچ بچوں کی مائیں اپنے آشناؤں کے ساتھ کیوں بھاگ جاتی ہیں؟

موبائل اور انٹرنیٹ نے کام آسان کر دیا ہے جن کے ذریعے نہ صرف مردوں کا عورتوں سے ربط بڑھانا ممکن ہے بلکہ وہ ان ڈیوائسز کے ذریعے رومانی گفتگو بھی کسی ایکسپرٹ کی طرح باآسانی کر لیتے ہیں۔ عورتیں فاصلوں سے بھی بنا کسی حقیقی قربت کے ایسی گفتگو کے باعث تسکین کی اس بلندی کو چھو لیتی ہیں

جس کا شوہر کے ساتھ جسمانی تعلق میں بھی انہوں نے تجربہ نہیں کیا ہوتا۔ یہ رابطے اس کی بے لطف زندگی کو وقتی طور پر بہار آشنا کر دیتے ہیں۔ ایک بار پھر سے محبوبہ ہونے کا احساس اسے حیران کن لذت سے واقف کرواتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان رابطوں سے ملنے والی خوشی شوہر کے ساتھ بوریت بھرے تعلق کو بھی قدرے گوارہ بنادیتی ہے۔

کئی عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنے دوست کے سامنے اپنی چاہت کا کبھی واضح اظہار تو نہیں کرتیں مگر بہانے بہانے سے ملنے ملانے کا سلسلہ جاری رکھتی ہیں۔ مذہبی شوہر کی بیوی ہونے کے ناطے انہیں شوہر کے ساتھ نقاب اور عبایا پہن کر گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔ ریسٹورانٹ میں کھانا پینا بھی زیر نقاب ہی کرنا پڑتا ہے۔ یہ عورتیں شوہر سے وفاداری کی اداکاری میں بھی طاق ہوتی ہیں اور اپنے ڈھکے چھپے دوست سے بھی ملاقات کے لیے وقت نکال لیتی ہیں۔ اس ملاقات میں ان کے اندر کی لڑکی چہرہ پر دہ سرکا کر باہر نکل آتی ہے اور اپنے انگ بدن کے گرد کسے گئے بند ڈھیلے کر دیتی ہے۔ وہ اپنے محبوب سے بنا مطالبہ کیے اپنی اور اپنے لباس کی تعریف سننے کی متمنی ہوتی ہیں۔ یہ عورتیں تھوڑی سی تعریف اور ایک آدھ رومانی گیت سے اس ذہنی فضا میں چلی جاتی ہیں جسے پانے کی خواہش میں انہوں نے شادی کی تھی۔ اگر مرد تھوڑی سی جرأت کا مظاہرہ کرے تو وہ بآسانی انہیں اپنے بیڈروم میں لے جاسکتا ہے۔ بات صرف موقع ملنے کی ہے۔

یہ تعلق فلرٹ بھی ہوسکتا ہے اور سچا جذباتی بھی مگر دونوں صورتوں میں عورت کی روح کو نہال کر دیتا ہے۔ اس تعلق تک پہنچنا عورت کی جذباتی مجبوری ہے۔ وہ بھلے دوست کو اپنا بدن نہ بھی چھونے دے مگر وہ اس کی طرف سے تعریف اور ڈھکے چھپے رومانی جملوں کی ضرور متمنی رہتی ہے۔ شوہر کے ساتھ تعلق کے لمحوں میں یہ جملے اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہیں تو وہ رومان کی خواہش کا کسی نہ کسی حد تک مداوہ کر لیتی ہے اور اس کے اندر دبا ہوا جوش وقتی طور پہ بیدار ہو جاتا ہے۔

اکثر عورتوں کے محبوب ان کے مائیکے میں ہوتے ہیں جن سے شادی سے پہلے تھوڑی یا زیادہ راہ و رسم رہ چکی ہوتی ہے۔ اگر شادی سے پہلے سماجی خوف کی وجہ سے ان سے جسمانی تعلق نہ بنا ہو تو اب جسم کی حد

تک تو یہ خوف اپنا وجود کھو چکا ہوتا ہے۔ اب اگر ڈر ہے تو صرف اس بات کا کہ اس تعلق کی کسی کو خبر نہ ہو جائے۔ وگرنہ بدن تو محبوب کی آغوش میں جانے کے لیے ہمہ وقت بے تاب ہے۔ کنوار پن کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری کا بھاری بوجھ شادی کے بعد سر سے اتر چکا ہوتا ہے۔ اب بات بات پر مائکے کی یاد ستانے لگتی ہے۔ اس حوالے سے ہمارے ہاں ایک پنجابی محاورہ معروف ہے جس میں ساس بہو کو مائکا کی یاد میں روتے ہوئے دیکھ کر طعن کرتی ہے۔ ''روندی یاراں نوں لے لے ناں بھراواں دے۔'' یعنی تم بھائیوں کے بہانے اصل میں اپنے یاروں کو یاد کر رہی ہو۔

شادی کی بربادی

مشترکہ خاندانی نظام

ہم ایک دعویٰ کرتے نہیں تھکتے کہ یہ ہم ہیں جنہوں نے مغرب کی 'مادر پدر' آزاد بلکہ بے مہار سوسائٹی کے مقابلے میں مشترکہ خاندان کے 'مقدس' اور 'اعلیٰ' ادارے کو اپنی مذہبی اقدار کے بل پر ابھی تک بچا کے رکھا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی کسی خاندان کے سبھی افراد کے لیے یہ ادارہ اہم اور احترام کے قابل رہ گیا ہے؟ سچ پوچھیے تو اب مشترکہ خاندان کو سوائے ماں باپ کے کوئی بھی خوشی سے قائم رکھنے کو تیار نہیں ہے۔ اس کی وجوہات معاشی بھی ہیں اور حکمرانی کا محبت کش جذبہ بھی۔ والد کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ اس کے بڑھاپے میں اب بیٹے اس کا معاشی سہارا بنیں اور اس کے سامنے احترام کے نام پر ایسی عاجزی دکھائیں کہ وہ معاشرے میں اپنا سر فخر سے بلند کر سکے۔ جبکہ ماں کی خواہش یہ بھی ہوتی ہے کہ اسے حکمرانی کے جذبے کو تسکین دینے کے لیے ایک بہو میسر ہو۔ یہ مشترکہ خاندان اکثر بہو اور بیٹے کے لیے کسی جہنم سے کم نہیں ہوتا۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ کسی تنے ہوئے رسے پر چل رہے ہوتے ہیں۔ ایسے گھروں میں مسلسل اور ناجائز سمجھوتے کو اعلیٰ تہذیبی قدر کا نام دیا جاتا ہے، ایک ایسی تہذیب جو انسانی رشتوں کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹتی رہتی ہے۔ میاں بیوی کے رشتے میں جسمانی تعلق مرکزی کردار کا حامل ہوتا ہے جس کے لیے انہیں اچھے موڈ کے علاوہ من مرضی کی تنہائی اور ماحول درکار ہوتا ہے۔ شروع شروع میں تو خیر یوں بھی ہوتا ہے کہ جنسی جذبے کا وفور خراب موڈ پہ با آسانی قابو پالیتا ہے مگر جیسے ہی یہ وفور نارمل ہونے لگتا ہے موڈ دونوں کے تعلق پہ

اثر انداز ہونے لگتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ صرف موڈ ہی فیصلہ کن کردار حاصل کر لیتا ہے اور آپس میں جسمانی تعلق بنانے کی خواہش خواب بلکہ خاک ہو جاتی ہے۔

میاں بیوی میں شادی کے ابتدائی دنوں میں پروان چڑھنے والی ہم آہنگی کو برباد کرنے میں سب سے اہم کردار لڑکے کی ماں کا ہوتا ہے جو اپنے کئی طرح کے مفادات کی وجہ سے اپنا کھیل کھیلتی ہے۔ وہ عموی طور پر بہو کے وجود کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کر پاتی۔ اگر اس کے اپنے شوہر کے ساتھ تعلقات کشیدہ رہتے ہوں تو مسئلہ اور بھی گھمبیر ہو جاتا ہے۔ وہ لاشعوری طور پر بہو سے حسد میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ جو خوشی وہ اپنے شوہر سے حاصل نہیں کر پائی وہ اس کی بہو کو ملے۔ وہ یہ بھی سوچتی ہے کہ کہیں اس کا بیٹا بیوی کا گرویدہ ہو کر ماں کی اہمیت کو نظر انداز نہ کر دے، وہ اہمیت جو معیشت اور بیٹے کی ملکیت کے جذبے پر استوار ہے۔ وہ ماں کے احترام کے نام پر بیٹے پر اپنا 'قبضہ' برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ وہ کوشش کرتی ہے کہ جب بیٹا کام سے واپس آئے تو کسی نہ کسی بہانے دیر تک اسے اپنے پاس بٹھائے رکھے۔ وہ جانتی ہے کہ کمرے میں ایک نوجوان لڑکی اس کے بیٹے کی منتظر ہے جو معلوم نہیں اپنے شوہر کو سوچ کر کیسے کیسے رومانی مناظر بنا رہی ہوگی مگر ماں ہے کہ اپنے احترام کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ولن بنی بیٹھی ہے۔ ایسی صورت میں ممکن ہی نہیں کہ بہو کے دل میں ساس کے لئے کوئی مثبت جذبہ پیدا ہو سکے۔ شوہر کی آمد پر جب وہ اس کی ماں کی شکایت کرتی ہے تو مشرقی تہذیب کا قیدی شوہر اکثر اس کے جذبات کو سمجھنے کی بجائے اسے والدہ کا گستاخ ڈکلیئر کر دیتا ہے اور یوں ان کے درمیان پیدا ہونے والی محبت کے امکانات تیزی سے معدوم ہونے لگتے ہیں۔ دلہن عموی طور پر ابتدائی سالوں میں خاموشی کے ساتھ یہ سب کچھ برداشت کرتی ہے اور پھر یوں ہوتا ہے کہ وہ بھی ساس کے ساتھ مقابلے کے لیے میدان میں اتر آتی ہے۔ اور یوں ایک مشترکہ گھرانہ عافیت کا گاہ کی بجائے میدانِ جنگ بن جاتا ہے اور ساس اور بہو کی اس جنگ میں سب سے زیادہ اذیت بیٹے کو اٹھانی پڑتی ہے جو کھل کر کسی فریق کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ایک وقت آتا ہے کہ اسے تنگ آکر اس جھوٹی جنت کو بیوی بچوں کے ساتھ خیر آباد کہنا پڑتا ہے۔ ستم ظریفی کی بات یہ کہ اس تجربے سے سبق سیکھنے کی بجائے

بہو بھی اپنے بیٹے کی دلہن لانے کے خواب دیکھنے لگتی ہے۔

ازدواجی تعلق کی بربادی میں ماحول کا کردار

شادی چاہے محبت کی ہو یا بزرگوں کی طرف سے طے کردہ، دونوں صورتوں میں جسمانی تعلق بنیادی اور ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔اور جسمانی تعلق ایک انتہائی پرائیویٹ یعنی نجی معاملہ ہے۔ ہمارے ہاں کم وبیش چالیس فیصد افراد غربت سے بھی نچلی سطح پر زندگی بتا رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہیں ہے بلکہ انہیں تو یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ دوسرے وقت کا کھانا کس ذریعے سے نصیب ہوگا۔ ایسے خاندانوں کے ہاں ایسے کسی گھر کا تصور ناپید ہوتا ہے جہاں باتھ روم، ڈرائنگ روم اور بیڈ روم جیسی سہولت دستیاب ہو۔ ان کا ٹائلٹ کھیت ہوتے ہیں، گندے نالے یا سرکاری نلکے باتھ روم کا کام دیتے ہیں اور جھونپڑی یا جھونپڑی نما کمرہ ان کا مکمل گھر ہوتا ہے۔ ان بے چاروں کے ہاں تو ازدواجی تعلق جانور کی سطح سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاں تعلیم، تہذیب اور سوک سینس کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔

جہاں تک لوئر مڈل کلاس کا تعلق ہے ان کو بھی جھونپڑی یا ڈربہ نما گھر دستیاب ہوتا ہے جو ایک دو چھوٹے سائز کے کمرے، غسلخانہ، بیت الخلاء اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل ہوتا ہے جس میں اکثر پانچ سے زیادہ افراد پر مشتمل خاندان رہائش پذیر ہوتا ہے۔ باورچی خانے کے لئے برآمدے یا صحن میں جگہ بنائی گئی ہوتی ہے اور برتن دھونے کے لیے صحن میں کھرا بنا ہوتا ہے۔ الماریاں اکثر ناپید ہوتی ہیں جہیز میں ملنے والی لوہے کی ایک بڑی پیٹی میں نئے کپڑے اور بستر اور بچیوں کے جہیز سنبھالے جاتے ہیں۔ اسی چھوٹے سے گھر میں بیٹوں کی شادیاں بھی ہوتی ہیں اور انہیں عارضی طور پہ برائے نام ایک کمرہ مل جاتا ہے جہاں پھوڑوں کے لیے نئے جوڑے کو کھل کھیلنے کا موقع نصیب ہوتا ہے اور وہ بھی رات کے وقت۔

جسمانی تعلق ایسا معاملہ ہے جو انتہائی درجے کی تنہائی کا تقاضہ کرتا ہے۔ یعنی ایک ایسا ماحول جہاں جوڑے کو اس بات کا خدشہ نہ ہو کہ کوئی انہیں دیکھ یا سن رہا ہے۔ مگر ہمارے ہاں شب زفاف میں عجب صورتحال ہوتی ہے۔ گھر کے سارے کونے کھدرے دور پار سے آئے ہوئے مہمانوں سے بھرے

ہوتے ہیں۔ اور پھر ہر کسی کو معلوم ہوتا ہے کہ حجلۂ عروسی میں کیا سرگرمی ہونے جارہی ہے۔ کم وبیش گھر کا ہر باہوش فرد کیا مرد اور کیا عورت، اس ہونے والی سرگرمی کو سوچ کر اپنا تخیل بنا اور سجا رہے ہوتے ہیں۔ دولہا دولہن کو شائد یہ لگتا ہے کہ وہ ایک ایسی چوری کرنے جارہے ہیں جس کی سب کو پہلے سے خبر ہے۔ زندگی کی سب سے پر جوش ترین سرگرمی کے لیے یہ ماحول بالکل مناسب نہیں ہے، مگر کیا کیا جائے یہ حالات کا وہ جبر ہے جسے برداشت کیے بنا کوئی چارہ بھی نہیں۔ اس صورتحال کو منٹو نے اپنے افسانے 'ننگی آوازیں' میں بہت خوبصورتی سے دکھایا ہے۔

یہ کہانی ہے ایک نوجوان بھولو کی جو اپنے بھائی کے ساتھ ایک پرانی بلڈنگ کے کوارٹر میں رہائش پذیر ہے۔ یہ کوارٹر جب گرمی میں تنور بن جاتے تو بلڈنگ کے غریب باسیوں کو چھت پر سونا پڑتا۔ کلن نامی ایک کردار جو کہ شادی شدہ ہے، وہ اپنی پرائیویسی کو محفوظ بنانے کے لیے چارپائی کے گرد بانس گاڑ کر ٹاٹ تان لیتا ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی بھولو کا بڑا بھائی اور دوسرے شادی شدہ جوڑے بھی یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ پہلی رات جب بھولو چھت پر سوتا ہے تو اسے ٹاٹ گھروں سے ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں جن سے اس کی جنسی جبلت انگیخت ہونے لگتی ہے۔ اسے یہ آوازیں لطف بھی دیتی ہیں اور بے چین بھی کرتی ہیں۔ ایک روز وہ تنگ آکر اپنے بھائی سے مطالبہ کردیتا ہے کہ اس کی فوراً شادی کردی جائے۔ اس کے پرزور مطالبے پر فوراً ایک شریف اور خوبصورت لڑکی کا رشتہ ڈھونڈا جاتا ہے اور ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر شادی ہوجاتی ہے۔

یہاں کہانی میں ایک معکوس موڑ آتا ہے۔ شادی سے چار روز پیشتر ہی وہ چھت پر اپنے لئے ٹاٹ گھر بناتا ہے، چارپائی پر نئے کھیس بچھاتا ہے۔ مگر جب رات کو بستر پر لیٹ کر اپنی ہونے والی دولہن کا تصور کرتا ہے تو اس کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ اسے یوں لگتا ہے جیسے چھت پر لیٹے ہر شخص کے کان اس کی چارپائی کی طرف متوجہ ہیں۔ اس کے سامنے وہ سب آوازیں یکدم زندہ ہوجاتیں ہیں جو وہ خود سنتا رہا تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ اب تک جن جوڑوں کی انگیخت کرنے والی آوازیں وہ سنتا آیا تھا اب وہی لوگ اس کے ٹاٹ گھر سے برآمد ہونے والی آوازوں پر کان لگائیں گے۔ شادی والے دن اس

کا دل چاہتا ہے کہ وہ کہیں بھاگ جائے۔ دلہن رخصت ہو کر آتی ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ کوارٹر کے کمرے میں ہی رات گزارے مگر گرمی کے ہاتھوں تنگ آکر ناچار اسے چھت کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ارد گرد لیٹے لوگوں کی موجودگی اس کے اعصاب کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ وہ شب زفاف منانا تو دور کی بات، اپنی نئی نویلی دولہن سے سرگوشی تک نہیں کر پاتا۔ اس تکلیف دہ صورتحال کی منظر کشی منٹو یوں کرتا ہے۔

''اس کے دل میں بڑے ولولے تھے۔ بڑا جوش تھا۔ جب اس نے شادی کا ارادہ کیا تھا تو وہ تمام لذتیں جن سے نا آشنا تھا، اس کے دماغ میں چکر لگاتی رہتی تھیں۔ اس کو گرمی محسوس ہوتی تھی۔ بڑی راحت بخش گرمی، مگر اب جیسے پہلی رات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس نے رات میں کئی بار یہ دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر آوازیں۔۔۔۔۔۔ وہ تصویریں کھینچنے والی آوازیں سب کچھ درہم برہم کر دیتیں۔ وہ خود کو ننگا محسوس کرتا، الف ننگا جس کو چاروں طرف سے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔۔۔''

شادی کے بعد ایک دو روز کے وقفے کے بعد بیوی ہفتہ بھر اس کے پاس رہتی ہے مگر اس کے ساتھ کسی بھی طرح کا تعلق بنانے کی نوبت نہیں آتی۔ بات گھر سے باہر نکل جاتی ہے اور نتیجہ یہ کہ بھولو اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے اور جہاں کہیں کسی دروازے پر ٹاٹ لٹکا دیکھتا ہے اسے دیوانہ وار پھاڑنے لگتا ہے۔

منٹو نے جو صورتحال پینٹ کی ہے کم وبیش ہماری ساری لوئر مڈل کلاس کی حالت ہے۔ ایک ایسی صورتحال جو اچھے بھلے نارمل مرد کو نامرد بنا دیتی۔

اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی بہت توجہ طلب ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ جسمانی تعلق کسی بھی طرح کے ڈر اور ڈسٹربنس سے پاک انتہائی درجے کی ایسی تنہائی چاہتا ہے جہاں وقت کی کوئی قید نہ ہو۔ اگر ان میں سے ایک بھی شرط پوری نہ ہو تو سمجھو یہ تعلق برباد ہو گیا۔ ہمارے سماج کے کم

وبیش نوے فیصد جوڑے مرضی کی تنہائی سے محروم ہیں۔ یہ صورت ازدواجی تعلق کو بیمار بنا دیتی ہے جس کا علاج مرد کسی نئے تعلق میں تلاش کرتا ہے جبکہ عورت اکثر حالات کے بھاری پتھر تلے سسکتی رہتی ہے۔ ایسی صورت میں مرد بھلے دس عشق کر لے مگر اس کی نہ صرف جنسی تشفی ممکن نہیں ہوتی بلکہ الٹا خانگی مسائل پیچیدہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

سنگل والدین کا المیہ

جہاں ایک جانب اولاد کو یہ شکائت ہوتی ہے کہ والدین ان کے محبت کے معاملات بے جا پابندیاں عائد کرتے ہیں ہیں، وہیں والدین کے بارے میں اولاد کا رویہ بھی کچھ زیادہ صحت مند نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک یہ تصور اذیت ناک ہوتا ہے کہ ان کے والدین کا کوئی جسمانی سمبندھ بھی ہو سکتا ہے۔ بھلے ہم باقی لوگوں کے جسمانی تعلق کا تذکرہ مزے لے لے کر کرتے ہوں مگر ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے والدین کے بارے میں ایسے کسی خیال کو دماغ میں نہ آنے دیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے محرم رشتوں کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے گھن محسوس ہوتی ہے۔ ہم انہیں 'پاک صاف' اور فرشتہ دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے معاملے میں جسم کا رشتہ ہمیں سراسر غلیظ اور گھناؤنا محسوس ہوتا ہے۔

یہ صورت حال تب اور گھمبیر ہو جاتی ہے جب ساتھی کی فوتیدگی یا طلاق کی وجہ سے والد یا والدہ کو تنہائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ بچوں کی شعوری یا لاشعوری خواہش یہی ہوتی ہے کہ والدین اپنی ذاتی زندگی کے ہر لطف کو تیاگ کر صرف ان کی خوشیوں کی فکر کریں۔ ان کے نزدیک والد یا والدہ کے کسی نئے تعلق میں بندھنے کی خواہش ایک صریح خودغرضی بلکہ عیاشی کے زمرے میں آتی ہے۔ اگرچہ ان کا دعویٰ تو یہی ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ ان کے والد یا والدہ کا کسی اور کو احساس ہو ہی نہیں سکتا، مگر عملی طور پر وہ ان کی ایک نہ گزیر خوشی بلکہ ضرورت کے سب سے بڑے دشمن بن کر سامنے آتے ہیں۔ ہمارا سماج بھی والدین دشمنی کی اس روائت کی ایک عمدہ اخلاقی قدر کے طور پر پرزور حمائت کرتا ہے۔

بچوں کا یہ ردعمل جو سراسر غیر انسانی ہے، کسی خلاء میں نہیں اُگتا بلکہ یہ والدین ہی ہیں جو ان کے اندر اس کا بیج ڈالتے ہیں۔ وہ اپنے جائز جسمانی تعلق سے لے کر پیدائش تک کے عمل کو ایک گناہ کی طرح

مخفی رکھتے ہیں۔ بچوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ یہی باور کروایا جاتا ہے کہ ان معاملات پر گفتگو کوئی گندی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب والدین میں سے کسی ایک کو نیا رشتہ بنانے کی ضرورت پڑتی ہے تو اولاد کا ردعمل ایسا ہوتا ہے جیسے وہ انہیں واقعتاً کسی گندی حرکت سے روک رہے ہوں۔ ان کی نظر میں والدہ یک دم ایک پر تر ماں سے فاحشہ میں بدل جاتی ہے اور باپ ایک عیاش مرد میں۔

والد کی نئی شادی کی صورت میں ایک خوف یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک اجنبی عورت کے آنے کے بعد گھر کی ہر شے کے ساتھ ساتھ باپ بھی تقسیم ہو جائے گا۔ ان کے لیے یہ تصور بڑا روح فرسا ہوتا ہے کہ والد کا وہ کمرہ جہاں وہ کسی بھی وقت بلا روک ٹوک بلکہ ایک مالکانہ احساس کے ساتھ داخل ہو سکتے ہیں، وہاں جانے کے لیے اب انہیں ایک اجنبی عورت کی اجازت درکار ہوگی۔ عرصہ سے جمے جمائے ماحول میں تقسیم کا یہ خیال خاص طور پر بیٹیوں کے لیے بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد وہ کہانیاں جو سوتیلی ماں کے حوالے سے سوسائٹی میں پھیلی ہوتی ہیں۔

جہاں تک عورت کا تعلق ہے اسے تو خیر اپنی جائز خواہشات کو دبانے کے لیے صبر کا سبق ہی پڑھایا جاتا ہے، سو اگر کوئی دوسری شادی کا تذکرہ کر بھی دے تو وہ خود اپنی جائز خواہشات کے راستے میں دلن بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ جبکہ مرد اکیلا ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی ملنے جلنے والوں سے اپنے لیے 'مناسب' رشتہ ڈھونڈنے کی درخواست کرنے لگتا ہے، جس کا سوائے اس کی اپنی اولاد کے کوئی برا نہیں مناتا۔ ایسے مرد کی حالت یوں ہوتی ہے جیسے اچانک شدت کی پیاس بھڑک اٹھے اور وہ جوہڑ کے پانی کو بھی منہ لگانے کو تیار ہو جائے۔ یہی وہ فرسٹریشن ہے جو مرد سے ایسے فیصلے کرواتی ہے کہ اس کا مستقبل جہنم میں بدل جاتا ہے۔

کئی مرد حضرات بھی سماج کی نظروں میں ایثار اور قربانی کا ہیرو نما پیکر بننے کے لیے دوسری شادی سے انکار کر دیتے ہیں مگر ان کی حالت قابل رحم ہوتی ہے۔ یہ بات بات پر اپنی اولاد کو اپنی 'عظیم' قربانی یاد دلاتے اور سوسائٹی سے اس کی داد کے طلبگار رہتے ہیں۔ یہ تجرد ان کی برداشت کا بہت امتحان لیتا ہے۔ اپنی تشنہ خواہشوں کے ہاتھوں کبھی کبھی تو یہ ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں کہ ہیرو کا مجسمہ زمیں بوس ہو جاتا ہے۔ منٹو نے

اپنے افسانے 'تقی کاتب' میں ایک ایسے ہی کردار کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

یہ ایک رنڈوے مولانا کا دلچسپ کردار ہے جو بیوی کے انتقال کے بعد تجرد کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں مگر اب وہ اپنی قربانی کا صلہ یہ چاہتے ہیں کہ بیٹا (تقی) بھی تجرد کی زندگی گزارے۔ وہ حیلے بہانوں سے بیٹے کے لیے آنے والے ہر رشتے سے انکار کر دیتے ہیں۔ قربانی کے بوجھ تلے دبا سعادت مند بیٹا پہلے پہل تو یہی سمجھتا ہے کہ والد پورے اخلاص کے ساتھ ایسا کر رہے ہیں مگر منو کے دھیان دلوانے پر اسے احساس ہوتا ہے کہ نہیں یہ تو مولانا کا کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ یہ بات سمجھ آنے کے بعد تقی ضد کر کے شادی کر لیتا ہے۔ مولانا بہو اور بیٹے کے تعلقات میں اڑچن ڈالنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ لگتا ہے جیسے ان دونوں کا ملن ان کی اپنی تشنہ آرزوؤں کی اذیت میں اضافہ کرتا ہو۔ وہی والد جس نے تجرد کی زندگی کو بیٹے کے لیے عظیم قربانی کا نام دے رکھا ہوتا ہے، خود ایک دن غسل خانے کے دروازے کی درزوں سے غسل کرتی ہوئی بہو کو جھانکتے ہوئے پکڑے جاتے ہیں۔ کہانی کا انجام کیا ہوا یہاں اس کا ذکر مطلوب نہیں۔ بتانے کا مقصد بس یہی تھا کہ یہ تجرد کے نام سے دی جانے والی قربانی، جسے ہم سراہتے نہیں تھکتے انسان کی شخصیت میں کیسی کیسی بھیانک کجیاں پیدا کر دیتی ہے۔

شادی یا خوشی کی بربادی

شادی کا عمومی مقصد اور تصور یہ لیا جاتا ہے کہ یہ انسانی نسل بڑھانے کے لیے ناگزیر ہے۔ جبکہ صورت یہ ہے کہ ہم شادی کے نام پر زمین کا بوجھ اور جرائم کی تعداد بڑھا رہے ہیں۔ ہمارا یہ شادی کا تصور خاصہ قابلِ رحم ہے۔ ہم شادی کے نام پہ اپنی نسل نہیں بڑھاتے بلکہ خود اپنی ذات کو، اپنی من مرضی کو، اپنی خوشیوں کو قسط وار موت کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کون ایسا ہوگا جو خوشی کا متمنی نہ ہو۔ مگر خوشی ہے کہاں؟؟؟

شادی یقیناً ایک ذمہ داری ہے، مگر ایسی ذمہ داری جسے ہم ناپسندیدہ بوجھ کی طرح اٹھائے پھرتے ہیں۔ ایسا بوجھ جسے کئی بار دل میں آتا ہے کہ سر سے اتار پھینکیں مگر ایسا کر نہیں پاتے۔ کیا ذمہ داری

واقعی بوجھ ہوتی ہے؟ نہیں ہر ذمہ داری بوجھ نہیں ہوتی۔ مگر ہر وہ ذمہ داری بوجھ بن جاتی ہے جو ہم پہ مسلط کر دی جائے۔ اور ہر وہ بوجھ پھولوں جیسا ہلکا اور سبک لگتا ہے جسے ہم من مرضی سے اٹھاتے ہیں۔ ہمیں محبوبہ یا گرل فرینڈ کی طرف سے کہا گیا مشکل سے مشکل کام بھی بوجھ نہیں لگتا بلکہ اسے پورا کرنے کے لیے ہم کسی بھی مشکل میں پڑنے کے لیے دل سے تیار ہو جاتے ہیں جبکہ بیوی کی طرف سے کی جانے والی معمولی سی فرمائش بھی ہمارا موڈ بگاڑ سکتی ہے۔ بچوں کی بیماری اور فیس کے معاملات ہمیں فالتو سے بوجھ لگنے لگتے ہیں۔ ہمیں بیوی کو شاپنگ پہ لے جاتے ہوئے خوف آتا ہے۔ اس لمحے وہ ہمیں ایک عیار ڈکیت جیسی لگتی ہے جس کے سامنے ہم بے بسی کے ساتھ لٹنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ہماری زندگی ہوش سنبھالتے ہی ناپسندیدہ کاموں سے بندھ جاتی ہے۔ ناپسندیدہ سلیبس، ناپسندیدہ اساتذہ، ناپسندیدہ سکول اور پھر ایک ناپسندیدہ جاب جس میں واحد وجہِ کشش تنخواہ ہوتی ہے، وہ بھی اس صورت میں کہ معقول ہو۔ شادی ایک ایسا فیصلہ ہے جس میں ہماری مداخلت کو اکثر ناممکن بنا دیا جاتا ہے۔ ہم بھی کئی بار نتائج کی ذمہ داری سے بچنے یا پھر والدین کے سامنے سر جھکا دینے والی تربیت کی وجہ سے اپنی زندگی کا اہم ترین انتخاب بزرگوں کو سونپ دیتے ہیں۔ اکثر یہی شادی بہت جلد ایک اذیت ناک ذمہ داری میں بدل جاتی ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس اذیت ناک تعلق سے وجود میں آنے والی اولاد کو نسلِ انسانی بڑھانے کا خوبصورت عنوان کیونکر دیا جا سکتا ہے؟ ایک ناخوش جوڑا کیونکر اچھے انسان پیدا کر سکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ہمیں آگے بڑھنے سے پہلے انسانی خوشی کو ڈیفائن کر لینا چاہئے۔

یہ خوشی کیا ہے؟

دنیا میں شاید ہی کوئی بدنصیب ایسا ہو گا جو خوشی کا متلاشی نہ ہو۔ مگر یہ خوشی ہے کیا؟ غور کریں تو انسان اپنی ساخت میں جسم اور ذہن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جسم اپنی حسیات کے توسط سے دماغ کے ساتھ منسلک ہے جو ان حسیات کو ذہن میں بدلتا اور پھر کیفیت اور خیال کی صورت میں منعکس کرتا ہے۔ انہی کیفیات کے نتیجے میں ہم بتاتے ہیں کہ ہم خوش ہیں، دکھی ہیں، اذیت میں ہیں یا ڈیپریشن میں۔ خوشی کے کئی رنگ اور کئی

سطحیں ہوتی ہیں جن کا تعلق ہماری ذہنی سطح سے ہوتا ہے۔ خوشی کو عام طور پر عارضی اور غم کو مستقل مانا جاتا ہے۔ عام آدمی کی حد تک معاملہ ایسا ہی ہے کیونکہ اس کی خوشی کسی بڑے مقصد کی بجائے عارضی قسم کے مزے یا کامیابیوں سے عبارت ہوتی ہے۔ عارضی ضرورتوں سے جڑی خوشی بھی بہت عارضی ہوتی ہے۔ جیسے کسی بھوکے کو کھانا میسر آ جانا۔ جنسی ابال کا معاملہ بھی ایسے ہی ہے جسے ماسٹربیشن یا طوائف کی مدد سے ٹھنڈا کر لیا جائے

عدم تحفظ کے شکار سماج میں سب سے بڑا مسئلہ جسم و جان کی سروائیول کا ہوتا ہے۔ ایسے میں ساری خوشیاں جسمانی تقاضوں کے محدود دائرے سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ذہن کہ جس کا کام تخلیقی امکانات کی کائنات کی تلاش ہے، جسم کے چھوٹے چھوٹے تقاضوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ ایسے میں پائیدار خوشی کہاں سے آئے۔ یہ تو تبھی ممکن ہوگا جب ذہن جسم کے تقاضوں سے فارغ ہو کر خود اپنی جانب متوجہ ہو۔ ذہن کو جسم کے تقاضوں کی تکمیل تک محدود کر لینا ایسے ہی ہے جیسے کسی کرین سے پانچ دس کلو کا وزن اٹھوانا۔ یا کسی بے انت خزانے سے چند ہزار کی رقم خرچ کر لینا۔

انکشاف اور تخلیق کا عمل

نامختتم خوشی کی اصل کلید

ذہن کی اہمیت، طاقت اور وسعت کا دائرہ کتنا بے انت ہے اسے جاننے کے لیے آپ صرف چند لمحوں کے لیے اپنے موبائل یا لیپ ٹاپ کے بارے میں ہی سوچ لیں۔ اور بتائیں کہ اگر یہ آپ سے واپس لے لیے جائیں تو آپ کی زندگی سے کیا کچھ منہا ہو جائے گا۔ یہ تو ذہن کا ایک چھوٹا سا کرشمہ ہے۔ ابھی تو آپ نے میڈیکل سائنس پہ غور نہیں کیا کہ ایک چھوٹی سی گولی یا چند سی سی کا انجکشن مرگ آسا لمحوں میں کتنا معجزنما ثابت ہوتا ہے۔ ابھی تو ہم نے علم اور فن کے ان منطقوں کے بارے میں بھی سوچنا ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے ہمیں جہنم جیسی اذیت سے نکال کر بہشت جیسی کیفیت میں داخل کر دیتے ہیں۔ محض ایک اچھی پینٹنگ، ایک عمدہ شعر، ایک مدھر گیت ہمیں کسی اور ہی جہان میں لے جاتا ہے اور تھکا ہوا بے زار ذہن پھر سے تازہ دم ہو جاتا ہے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے ذہن کے طاقتور جن کو بدن کی معمولی ضرورتوں کا غلام بنا رکھا ہے۔ یاد رکھیے جب تک ذہن آزاد نہیں ہوگا، وہ خود پر توجہ نہیں دے پائے گا۔ زندگی انکشاف، علم، ایجاد اور دریافت کے عمل سے آگے بڑھتی ہے، نکھرتی سنورتی ہے۔ اور یہ عمل ذہن کی آزادی کے بغیر ممکن نہیں۔ ذہن

آزاد ہوگا تو تب ہی تخلیق کی وسیع بلکہ بے انت کائنات میں داخل ہوگا اور پھر یہیں سے ہماری نا ختم خوشیوں کا سفر آغاز ہوگا۔

جو لطف دینے میں ہے لینے میں نہیں۔ اور بھکاری ہونا تو نری ذلت ہے۔ غیر تخلیقی آدمی انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا کہ تخلیقی ذہن ہی انسان اور حیوان کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ جہاں تک جبلتوں کا تعلق ہے وہ تو انسان اور حیوان دونوں میں سانجھی ہیں۔ تخلیقی ذہن دنیا کو بدلتا ہے اور اپنے ہم جنسوں میں علم اور آسانیاں تقسیم کرتا ہے۔ وہ لیتا کم اور دیتا کہیں زیادہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس کا احسان نہیں چکا سکتے۔ ذرا اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سمارٹ فون پہ دھیان کیجئے اور بتایئے کہ ہم گراہم بیل کو اس کی ایجاد کے بدلے میں کیا دے سکے۔ اور وہ جس دیوانے نے پینسلین ایجاد کر کے ارب ہا زندگیاں بچائیں، اسے کیا دے سکتے تھے ہم!!!؟ ہمارے پاس تو ان کے لیے تحسین کا ایک کلمہ بھی نہیں کیونکہ ہم وہ بدنصیب ہیں جو اپنے محسنوں کے نام تک نہیں جانتے۔ شائد ہماری سرشت میں علم اور تخلیق دشمنی سرائت کر گئی ہے۔ ہمارے پاس علم تو دور کی بات اپنے عظیم محسنوں کے بارے میں ڈھنگ کی معلومات بھی نہیں۔ سقراط، بقراط، ارسطو اور افلاطون کا نام شائد سن یا پڑھ رکھا ہو مگر اچھے خاصے پڑھے لکھے افراد یہ بتانے کے قابل نہیں کہ ان کا علم ہارون الرشید کے زمانے میں مسلمانوں سے ہوتا ہوا کیسے یورپ تک پہنچ کر نشاۃ ثانیہ کا باعث بنا اور آج ہماری زندگی کے کن کن شعبوں میں دخیل ہے۔ نیچرل سائنس اور سوشل سائنس کا کون سا ایسا مضمون ہے جو ارسطو کے نام سے شروع نہ ہوتا ہو۔ ہمیں علم اور تحقیق سے غرض ہوتی تو آج یقیناً ہمیں ان جینئس لوگوں کے کارنامے از بر ہوتے۔ ہماری مجہولیت کا تو یہ عالم ہے کہ ہم نے ابنِ رشد اور غزالی جیسی متضاد شخصیات کو ان کے خیالات پڑھے بنا ایک جیسا اہم مان رکھا ہے۔ ہمارے نزدیک بس دونوں کا مسلمان ہونا کافی ہے۔ ہمیں تو یہ بھی علم نہیں کہ ہماری علمی پس ماندگی میں غزالی اور اشاعرہ کا کتنا حصہ ہے اور یوروپ کی ترقی میں ابنِ رشد، بوعلی سینا اور معتزلہ کا کیا کردار ہے۔ یہ غزالی تھا جس نے علت اور معلول کے قانون کو غلط کہہ کر ہمیں سائنسی سوچ سے دور کیا اور ہمیں نان پروڈکٹو (Non productive) بنا کر

مغرب کا محتاج بنایا۔یہی وجہ ہے کہ تب سے آج تک ہم بھکاری قوموں کے ساتھ اگلی صف میں ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں۔اور بلاشبہ ان قوموں میں اکثریت مسلمان ملکوں کی ہے۔

ذہن کی اڑان لامحدود ہے۔اگر بچپن میں سوچنے،غوروفکر کرنے اور فیصلہ سازی کی تربیت نہ ملے تو فرد کا ذہن جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔وہ نئی تبدیلیوں کو قبول کرنے سے نہ صرف گھبراتا ہے بلکہ اولاد کو بھی اپنے جیسی محدود اور ٹھہری ہوئی زندگی جینے پر مجبور کرتا ہے۔وہ اظہار کا بے ساختہ پن کھو بیٹھتا ہے۔اس کی زندگی کولہو کے بیل کا استعارہ بن جاتی ہے۔رجعت پسندی اس کے مزاج میں سرائت کر جاتی ہے۔وہ تبدیلی کی بجائے اپنے ذات کے تحفظ اور تصوراتی سنہرے ماضی کو واپس لانے کے لئے کسی نہ کسی مذہبی تنظیم کا حصہ بن جاتا ہے۔اسے سائنسی انکشافات سے الجھن ہوتی ہے کہ وہ اس کے بنے بنائے خیالات کو مسلسل چیلنج کرتے ہیں۔وہ اکثر اپنے انتہائی محدود بلکہ غلط علم کی مدد سے سائنسی حقائق کو غلط ثابت کرنے کے کارِ بے کار میں لگا رہتا ہے۔ذہن کی پرواز کو راستہ دینے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ کوئی بھی نیا انکشاف زندگی کے جمے جمائے سماجی نقشے میں بھونچال لا سکتا ہے،جیسے کہ کلوننگ اور مصنوعی نسل کشی کا معاملہ۔

نظریاتی لوگ بظاہر تبدیلی اور انقلاب کے پرجوش مبلغ ہوتے ہیں مگر جب ریاست ان کے قبضے میں آجاتی ہے تو ذہنوں کی اڑان ان کے لیے سوہان روح بن جاتی ہے۔یہ لوگ دراصل انقلاب کے پردے میں ایک نیا قسم کا جمود نافذ کر دیتے ہیں۔ان کے تئیں ان کے لائے ہوئے 'انقلاب' کو برقرار رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہوتا ہے کہ نئی سوچ کے ہر رخنے کو بند کر دیا جائے۔

تخلیق اور وجدان کا رشتہ

تخلیق عقل اور جذبے کا اعلیٰ ترین سنجوگ مانگتی ہے۔اس عمل میں جذبہ طاقتور انجن اور عقل آنکھوں کا کام کرتی ہے۔تخلیقی عمل سے زیادہ اعلیٰ پائے کی مصروفیت ممکن ہی نہیں۔یہ نہ صرف انسان کو بہت سے روزمرہ کے جھنجھٹوں سے ملکت کر دیتی ہے بلکہ اس پر ایک سرشاری کی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔اس پر ہر وقت کچھ نیا کرنے کی دھن سوار رہتی ہے۔مسلسل سوچنے اور ذہن کو مرتکز کرنے کے نتیجے میں اس کی

ذات میں وجدان کی صلاحیت بیدار ہو جاتی ہے۔ دھیان رہے کہ وجدان کوئی مافوق الفطرت مظہر ہرگز نہیں ہے۔ آپ کسی بھی معاملے کو مکمل انہماک اور جذبے کے ساتھ سوچنا شروع کر دیں، آپ کو بھی وجدان کا تجربہ ہو جائے گا۔

کسی بھی علمی معاملے پر مسلسل غور و فکر سے انسان میں فکری گہرائی اور وسعت پیدا کرتا ہے۔ چھوٹے اور محدود ذہن کے آدمی کے لیے چھوٹے چھوٹے مسائل بھی پہاڑ جیسے بڑے بن جاتے ہیں۔ یہ مسائل اس کے ذہن کو الجھا کر مزید محدود اور بیکار کر دیتے ہیں۔ اور یوں وہ حقیقی خوشی کا مفہوم جاننے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کے لیے خوشی یوں ہوتی ہے جیسے بے انت اور بے تھا سمندر کی سطح پر بننے والا بلبلا جس کی زندگی لمحاتی ہوتی ہے۔ مگر غور و فکر کا عادی فرد خوشی کے دشمن چھوٹے چھوٹے مسائل سے شائد ہی متاثر ہوتا ہو بلکہ وہ تو کم و بیش ہمہ وقت غور و فکر کی ستی میں گم رہتا ہے۔ اس پر زندگی مسلسل اپنے بھید کھولتی رہتی ہے۔ اور یقین جانئے کہ علمی انکشاف سے بڑی لذت شائد ہی کوئی اور ہو کیونکہ یہ انسانی ذہن کو مسلسل تازہ اور پر جوش رکھتی ہے۔

علم اور تحقیق کے ساتھ ساتھ فن اور ہنر کا دائرہ بھی منسلک ہے۔ ہنر کو ہم علم اور تخلیق کا کیریئر بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہنر جتنا بلند پایہ ہوگا علم اتنے ہی موثر انداز میں اپنے مخاطبین تک رسائی حاصل کرے گا۔ جو خیال ہم عام گفتگو کے ذریعے بیان کرتے ہیں، اگر اسے شاعری میں ڈھال دیا جائے تو اس کا اثر مزید بڑھ جاتا ہے۔ اور اگر شاعری کو موسیقی کا کاندھا نصیب ہو جائے تو اس کی تاثیر پہلے سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس خیال کو موسیقی کے ساتھ دلکش دھن میں ڈھال کر ڈرامے یا فلم کا حصہ بنا دیا جائے تو آپ خود سوچ لیجئے کہ اس سادہ سے خیال کی اثر انگیزی کا عالم کیا ہوگا۔

فنون براہ راست ہمارے جذبوں سے ہم کلام ہوتے ہیں اور پھر اسی راہ سے دماغ میں اترتے ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہاں ریکارڈ ہو جاتے ہیں۔ ہماری دھیمی اور خوبصورت یادوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہم میں سے کون ایسا ہوگا جسے موسیقی بری لگتی ہو۔ نغمگی اور غنائیت تو ہمارے دل کی مجبوری ہیں۔ ان کے اثر کا تو یہ عالم ہے کہ سال ڈیڑھ سال کا بچہ بھی بے ساختہ تھرکنے لگتا ہے جبکہ وہ ابھی شعوری طور

پر کسی خوشی یا دکھ کے تجربے بھی نہیں گزرا ہوتا۔ ہمارے ساتھ تو اب تک بہت کچھ اچھا یا اذیت ناک بیت چکا ہوتا ہے۔ ہم نے ہجر اور وصال کے ذائقے چکھ لیے ہوتے ہیں اور یہ ذائقے شاعری اور موسیقی کے سوا کسی اور طرح یوں بیان نہیں کئے جاسکتے کہ ہمارا دل نوکِ زبان پر آکر کہے کہ واہ۔ مگر وہ کہتے ہیں نا کہ 'مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات'۔ ہمارے ساتھ یہ ہوا کہ ہمارے بزرگوں نے غلط سلط اور سنی سنائی باتوں کے نتیجے میں موسیقی کو حرام سمجھ لیا اور یوں اچھے خاصے دودھ میں مینگنیاں ڈال دیں۔ حیرت ہے کہ ہم ایک جانب موسیقی کو روح کی غذا کہتے ہیں اور دوسری طرف اس غذا کو حرام بھی سمجھتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ساری گڑبڑ کی وجہ موجود ہے۔ ہم اگر موسیقی کو احساسِ جرم کے ساتھ سنیں گے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہمارے دل و دماغ کو پاکیزگی بخشے اور روح کو بالیدگی عطا کرے۔

یہی حال مصوری کا ہے۔ تصویر اور پینٹنگ کی جانب کشش بھی ہوتے ہیں اور اسے حرام بھی جانتے ہیں۔ جب اس کشش کی ماہیت سمجھ میں نہیں آتی تو اسے شیطان کی کارستانی کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن اطمینان تب بھی نصیب نہیں ہوتا۔ حیرت ہے ایک جانب ہم جس کسی کے فن سے مسحور ہوتے ہیں تو اسے خداداد کا نام دیتے ہیں لیکن اس کی حرمت کے بارے میں پوچھا جائے تو بالآخر وہ اسے حرام اور شیطان کی کارستانی کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں۔ یہی صورتحال ہمیں سیکس میں کشش کے معاملے میں بھی درپیش ہوتی ہے۔ مگر یہ خواہش ایسی ظالم ہے کہ ہمہ وقت ہمارے دماغ سے چمٹی رہتی ہے اور لاحول پڑھنے پر بھی جان نہیں چھوڑتی۔ تو کیا ہم نے زندگی کے ہر لطف اور ہر مزے کو خود پر حرام کرنے کی ٹھان لی ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے اور ہم نے ہر فن کا احساسِ جرم کے ساتھ ہی مزا لینا ہے تو پھر یقین کر لیجئے ہمیں کبھی بھی خوشی کا سراغ نہیں مل سکتا۔ خوشی کے لیے لازم ہے کہ ہم اپنے اور فن کے بیچ سے شیطان کو خارج کر دیں جو اور کچھ نہیں صرف اور صرف ہماری غلط اور بے سوچی سمجھی مذہبی تفہیم کی ناجائز پیداوار ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر موسیقی اور مصوری شیطانی کام ہوتے تو ان سے جڑے ہوئے لوگ بہت کرپٹ، کرخت، ظالم اور برے ہوتے۔ اور نمازی پرہیزگار لوگ بہت ایماندار سراپا محبت

ہوتے۔ مگر سچ پوچھئے تو تجربہ یہی بتاتا ہے کہ عبادت گزاروں کی اکثریت کے جُبّوں میں مہان قسم کے شیطان اور خوشی کے دشمن کرخت اور بدصورت چہرے چھپے ہوتے ہیں۔

فن اور ہنر اپنی ذات میں محض ایک بے انت طاقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ انسان کا مسئلہ ہے کہ وہ ان کا تعمیری استعمال کرے یا تخریبی۔ ہم چاہیں تو ان کی مدد سے جمالیات سے لبریز تہذیب یافتہ سماج وجود میں لا سکتے ہیں اور چاہیں تو ان کی باگیں وحشی جبلتوں کے ہاتھ میں دے کر سماج کو برباد کر سکتے ہیں۔ فنون کو حرام یا شیطانی سمجھنے سے کئی طرح کی سماجی اور نفسیاتی بیماریاں جنم لینے لگتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ سماج فنون سے پیدا ہونے والی جمالیات سے محروم ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ فن اور ہنر ایسے گروہوں کا ہتھیار بن جاتے ہیں جو ان کے ذریعے فحاشی اور ولگیریٹی کو فروغ دے کر پیسہ سمیٹنے لگتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے فن کی فحش اور ولگر صورتیں اسی سوسائٹی میں تیزی سے فروغ پاتی ہیں جس کے مذہبی اور سماجی رہنما انہیں سماج سے کاٹنے پر مصر ہوتی ہیں۔ ہمارا پاکستانی معاشرہ اس کی نمایاں ترین مثال کا درجہ رکھتا ہے۔

شناخت کی خواہش

ہر فرد چاہتا ہے کہ لوگ اسے پہچانیں، اس کو عزت دیں اور مرنے کے بعد بھی اچھے لفظوں میں یاد کریں۔ آخر ہم ایسا کیا کریں جس سے ہمیں یہ قابلِ فخر شناخت حاصل ہو سکے۔ دولت؟ نہیں یہ تو جتنی بھی کما لو بالآخر خرچ ہو جاتی ہے۔ جسمانی طاقت؟؟ نہیں اس کا طلسم بھی موت کے ساتھ ہی اڑن چھو ہو جاتا ہے۔ تو کیا پھر سرکاری منصب؟؟؟ نہیں یہ بھی نہیں کہ اس کی طاقت اور اہمیت کا مرکز انسان کی ذات سے باہر کرسی میں مضمر ہوتا ہے اور یہ طاقت جادو ریٹائرمنٹ کے ساتھ ہی غائب ہو جاتا ہے۔

اس کا جواب بہت آسان ہے کہ ایسا کیا کیا جائے جو یاد رکھنے کے قابل ہو اور ہمارے مرنے کے بعد بھی تا دیر مٹایا نہ جا سکے بلکہ وہ صدقۂ جاریہ بن جائے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ ہم نام، شناخت یا پہچان کے مفہوم کو جان لیں۔

نام چلانے کا مسئلہ

یہ نام چلانے کا مسئلہ بھی عجیب ہے کہ جس کی خاطر اوپر تلے ہم سات سات ناپسندیدہ بیٹیوں کی پیدائش برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں اولادِ نرینہ کا خبط کسی عذاب سے کم نہیں۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ آخر یہ 'نام' ہے کیا جس کی خاطر ہم اتنی مصیبت اٹھاتے ہیں۔ کیا نام وہ ہے جس سے ہمیں پکارا جاتا ہے۔ اگر پہچان کا تعلق اس پکارے جانے والے نام ہی سے ہے تو پھر ایک جیسے نام والے تمام افراد کی شناخت ایک جیسی ہونی چاہیے۔ پھر ایسا کیوں کہ ایک ہی نام کے حامل دو افراد میں ایک با کردار ہو اور دوسرا بدکردار۔ تو گویا یہ فارمولہ پہلے ہی ٹیسٹ میں فلاپ ہو گیا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک ہی نام کے دو مختلف افراد کے لیے وہی نام الگ الگ بلکہ متضاد پہچان کا باعث بن جاتا ہے۔ جیسے عمر بن ہشام اور عمر بن خطابؓ۔ یزید بن معاویہ اور یزید بسطامیؒ۔ اور ایسی ہی کئی اور مثالیں آپ کے اپنے تجربے میں بھی ہوں گی۔ تو پھر آخر نام کے علاوہ وہ کونسی بات ہے جو ایک ہی نام کے افراد کو مختلف پہچان دیتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ نام تو آدمی کے کام کردار اور کارکردگی سے ہوتا ہے نہ کہ دھن دولت سے۔ کتنے مشاہیر ہوں گے جن کے والدین یا اولاد کے نام ہم جانتے ہوں گے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ارسطو، سقراط اور افلاطون جیسے نابغے کن حضرات کے بیٹے تھے۔ تو طے یہ ہوا کہ نام صرف انہی کا چلتا ہے جن میں کوئی گن ہو۔ اکثر تو ایسے ہوتے ہیں جن کا تعارف چند سو لوگوں سے زیادہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہوتا اور وہ بھی ایسا کہ جس کی کوئی خاص معنویت بھی نہیں ہوتی۔ ناکارہ اور نکمے آدمی کا نام آپ بھلے آئین سٹائین رکھ دیں یا صلاح الدین ایوبی، وہ دھیلے کی عزت نہیں کما سکتا۔ بلکہ الٹا لوگوں کی تفننِ طبع کا وسیلہ بن جائے گا۔

نام اور مثبت پہچان کی سعادت صرف اور صرف تخلیقی لوگوں کے حصے میں ہی آتی ہے۔ اس کے لیے فرد کا اپنی صلاحیتوں کو پرکھنا اور نکھارنا شرط ہے۔ اور اس کے لیے صنف یا جنس کی کوئی تفریق یا قید نہیں۔ صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی نامور ہو سکتی ہیں بشرطیکہ انہیں اپنا آپ سامنے لانے کے مواقع میسر

ہوں۔ سائنس اور فلسفے کے میدان میں مادام کیوری اور سیمون ڈی بوائر ایسی ہی خواتین تھیں۔ حکمرانوں کی بات کریں تو گولڈا میئر، بندرانائیکے، اندرا گاندھی، مارگریٹ تھیچر اور بےنظیر بھٹو سامنے کی بات ہیں۔ جہاں تک ادبی دنیا کی بات ہے عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، امرتا پریتم، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر شہرت میں بڑے بڑے مرد ادیبوں کے مقابل پورے قد سے جمی کھڑی ہیں۔

بےکار اور نکھٹو آدمی کا کوئی نام نہیں ہوتا بھلے وہ ایک درجن بیٹے پیدا کرلے۔ یہ دراصل فیوڈل دور کا مسئلہ تھا جب زمین گاہنے، سنبھالنے اور شریکوں سے لڑنے کے لیے مردانہ طاقت درکار ہوتی تھی۔ مشین نہ ہونے کے سبب بوجھ ڈھونے کا کام یا تو ڈھور ڈنگر کرتے تھے اور یا خود انسان۔ شائد اسی لیے اس دور میں پہلوانی ایک قابلِ عزت و شہرت شعبہ تھا۔ ایسا نہیں کہ عورتیں پہلوان بننے کی صلاحیت سے محروم تھیں بلکہ انہیں نام نہاد عزت کے نام پر ایسا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ وہ دور تھا جب عورت کھیت کھلیانوں میں مرد کے شانہ بشانہ کام کرتی تھی مگر مرد کا بنایا ہوا سماج اس کے کام کی اہمیت کو ماننے سے صاف انکاری تھا۔ شہروں میں عورتیں گھر کی چار دیواری میں بند رہنے پر مجبور تھیں۔ انہیں تعلیم اور نوکری سے اس خوف کی وجہ سے محروم رکھا جاتا تھا کہ کہیں وہ مرد کی برابری نہ کرنے لگیں۔ انہیں صرف ایسی احادیث اور واقعات پڑھائے اور رٹائے جاتے تھے جو ان میں مرد کی بے چون و چرا اطاعت کا جذبہ پیدا کریں اور اپنے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کو اپنا نصیب جان کر قبول کرلیں۔ اشرف علی تھانوی نے اسی طرح کی خواتین کو بہشتی زیور میں آئیڈیل کے طور پر پیش کیا تھا۔

عورت کے لیے صرف طوائفیت کا شعبہ کھلا تھا کیونکہ وہ مردوں کی گھریلو زندگی کی بوریت دور کرنے کے لیے ناگزیر تھا۔ کیا آپ نے منٹو کا افسانہ 'لائسنس' پڑھا ہے جس میں ایک کوچوان کی نوجوان بیوہ کو تانگہ چلانے کا لائسنس تو نہیں ملتا مگر پیشہ کرنے کا لائسنس فوراً مل جاتا ہے۔ یہ کہانی بھلے منٹو کے اپنے ذہن کی اختراع ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ آج سے سو برس پہلے اس خطے کی صورت ایسی ہی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے مرد کے تمام منفی حربوں کے باوجود عورت نے اس بدنام شعبے میں بھی حیران کن طریقے سے اپنی مثبت پہچان بنائی۔ اس کے ثبوت کے لیے ہم میرزا ہادی رسوا کے معروف ناول کی

ہیروئن امراؤ جان ادا کا نام لے سکتے ہیں۔ ویسے تو اردو کے شاعرِ اعظم غالب کا تذکرہ بھی ایک مغنیہ اور طوائف کے ذکر کے بغیر نہایت پھیکا اور ادھورا رہ جاتا ہے جس کے آگے وہ دل ہار بیٹھے تھے۔ ہماری ماضی کی فلموں کی اکثر معروف اور فنکار کے طور پر عزت اور احترام پانے والی ہیروئنوں اور گلوکاراؤں کا تعلق بھی طوائف گھرانوں سے تھا۔

اگر لوک کہانیوں کی بات کریں تو سوائے میرزا صاحباں کے سبھی کہانیوں کے عنوان عورت کے نام سے شروع ہوتے ہیں اور سب کہانیوں میں عورت کا کردار ہی غالب ہے۔ جبکہ مرد کا کردار ایک طرح کی مفعولیت میں لپٹا ہے۔ رانجھا کسی نہ کسی طور ہیر تک پہنچتا ضرور ہے مگر پہنچنے کے بعد ہیر فیصلہ کن کردار حاصل کر لیتی ہے۔ سوہنی مہینوال میں بھی کہانی عورت کے گرد ہی گھومتی ہے اور سسی پنہوں میں بھی سسی زیادہ متحرک دکھائی دیتی ہے۔

ان قصوں کو محض لکھنے والوں کے ذہنوں کی اختراع کہہ کر ایک طرف نہیں رکھا جاسکتا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو یہ سب قصے اب تک ہمارے اجتماعی حافظے سے مٹ چکے ہوتے۔ یہ دراصل ان ادوار کی چیدہ چیدہ عورتوں کے عمل اور فیصلے کی وہ طاقت تھی جس نے ہیر، سسی، سوہنی کے نام کو امر کر دیا۔ تو جناب طے یہ ہوا کہ صرف انہی لوگوں کا نام امر ہوتا ہے جو علم، عمل اور فن کے میدان کے دھنی ہوتے ہیں وگرنہ اکثریت کی حیثیت تو چلتی پھرتی لاشوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

شادی کے معاملے پر
تاریخ کے تناظر میں ایک نظر

ہم شادی کے جس تصور سے آشنا ہیں اس کی ہم بھلے لاکھ تعریف کریں مگر حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔ یہ رشتہ اپنی ماہیت میں جلد یا بدیر مرد اور عورت دونوں کی خوشیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے۔ محدود معلومات کی بنا پر ہم اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ شائد دنیا بھر میں شادی کا یہی مطلب ہے۔ جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یوروپ کے لوگوں کے لیے یہ بات کسی اچنبھے سے کم نہیں کہ ہمارے ہاں شادی کے معاملے میں لڑکے لڑکی کی مرضی کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ وہ حیرت زدہ ہو کر پوچھتے ہیں کہ اوہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے!!!

یہ تو رہا آج کا معاملہ، تاریخ میں جھانکیں تو ہمیں شادی یا میاں بیوی کے رشتے کی ایسی ایسی صورتیں ملیں گی جنہیں جان کر شائد ہمارے حواس ہی مختل ہو جائیں۔ قبائلی اور فیوڈل مذہبی اقدار کے زیر اثر ہمارے ہاں عصمت کا تصور تکلیف دہ حد تک اپنی اہمیت رکھتا ہے اور بھی صرف عورت کی عصمت کا تصور۔ مرد ان کہے طریقے سے اس بوجھ سے مبرا ہے۔ زیادہ ہوا تو ہم اسے نہایا دھویا گھوڑا کہہ کر صرف نظر کر لیتے ہیں کیونکہ

عصمت کی پاکیزگی کا فیصلہ بھی عورت نے نہیں بلکہ مرد نے ہی کرنا ہے۔ ہمارے ہاں اب بھی یہ روایت قائم ہے کہ شب زفاف کی صبح دولہن کے بستر پر خون کے دھبے یہ جاننے کے لیے دیکھے جاتے ہیں کہ شادی سے پہلے لڑکی کنواری بھی تھی یا نہیں۔ جبکہ ہمارے پاس دولہا کے کنوار پن کو جانچنے کا نہ تو کوئی طریقہ ہے اور نہ ہم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اس دنیا میں ہماری سوسائٹی کے علاوہ اور بھی کئی سماج موجود ہیں جہاں شادی اور عصمت کے حوالے سے تصورات ہم سے بالکل اُلٹ ہیں بلکہ ہمارے نظام فکر کے مطابق تو وہ سراسر فحاشی اور گناہ کے زمرے میں آتے ہیں۔

ایکواڈور کے دارالحکومت کیوٹو کے انڈئینز مرد شادی کے لیے کنواری لڑکی کی بجائے بچے والی عورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ کامچاڈل (Kamchadal) قبیلے کا دولہا اگر کنواری دوشیزہ سے شادی کر بھی لے تو وہ ساس کو طعنے دیتا رہتا ہے کہ اس نے اپنی بیٹی کو جنسی آداب کیوں نہیں سکھائے۔ ایسٹ افریقہ کے اکامبا قبیلہ میں شادی کے لیے کنواری کے مقابلے میں حاملہ لڑکی کو زیادہ موزوں سمجھا جاتا ہے۔ کانگو کے قبیلہ موگواندی میں کنواری لڑکی کے مقابلے میں بڑی عمر کی بچے والی عورت کے دام چھ گنا زیادہ ہوتے ہیں۔

بعض قبائل ایسے بھی ہیں جن کے ہاں شادی سے پہلے ہی جنسی رشتہ بنانے کی اجازت ہوتی ہے۔ منگنی کرنے والے جوڑے آپس میں جنسی تعلق قائم کر لیتے ہیں اور پھر حمل ظاہر ہونے کی صورت میں باقاعدہ شادی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ قبائل جنسی بداخلاقی جیسی کسی قباحت سے واقف نہیں ہوتے۔ اسے ہم آج کے جدید معاشروں کی کورٹ شپ کے مشابہہ قرار دے سکتے ہیں۔

برٹش نیوگنی میں قبیلہ میسم کے بارے میں یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ ان کے ہاں طویل جنسی رفاقت کے بغیر شادی کا کوئی تصور نہیں، اور فلرٹ کے طور پر قائم کئے گئے تعلق کو بالکل پسند نہیں کیا جاتا۔ والدین کی طرف سے محبت کی شروعات کی اجازت صرف اس شرط پر دی جاتی ہے کہ یہ تعلق بالآخر شادی پر منتج ہوگا۔

ناگ پور کے قبیلہ کیریہا والوں کی زبان میں سرے سے شادی کے لیے کوئی لفظ ہی نہیں پایا جاتا۔ قبیلہ

گوبکورس کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں یک زوجگی پائی جاتی ہے مگر اس کو باقاعدہ شادی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ دونوں فریق جب چاہیں بڑی آسانی سے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ تاہم علیحدگی کے واقعات شاذ ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اگر ہم عرب کے قبل اسلام یا بعد از اسلام کے حالات کا جائزہ لیں تو ہمیں شادی بیاہ اور طلاق معمول کے معاملات دکھائی دیتے ہیں جہاں (سوائے لونڈیوں اور غلاموں کے) مرد اور عورتیں دونوں ہی اپنی مرضی سے نکاح کرنے میں آزاد تھے۔ صورت یہ تھی کہ مرد ہی نہیں عورتیں بھی شادی کا پیغام بھیج سکتی تھیں۔ پیغمبر ﷺ کی پہلی شادی اس بات کی گواہ ہے کہ رشتے کی بات خاتون محترم کی جانب سے شروع کی گئی تھی جسے آپ نے مناسب جان کر قبول کر لیا۔ حضرت زینبؓ کے ساتھ شادی کے سلسلے میں بھی نکاح کی خواہش کا اظہار بی بی زینبؓ کی جانب سے ہوا تھا۔ عورت کی آزاد رائے کی اہمیت کے حوالے سے ان دو مثالوں کو پورے فخر کے ساتھ جدید دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔

متمول مردوں اور عورتوں کے لیے کسی بھی عمر میں شادی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ بیوگی کوئی عیب نہیں تھی سو پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے شوہر کی وفات کے بعد بھی نئے شوہر کی دستیابی آسان تھی۔ شادی کے لیے عمروں کا بہت بڑا فرق بھی کوئی مسئلہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس دور کے عربوں کے ہاں ہمیں شادی ایک روزمرہ کے معمول جیسی لگتی ہے جس میں نہ رشتہ لینے کے لیے جوتیاں گھسانے کا مسئلہ تھا، نہ جہیز جمع کرنے کی مصیبت۔ نہ منگنی کی رسمیں، نہ شادی کارڈ چھپوانے کا جھنجھٹ۔ ادھر بات ہوئی اور ادھر شادی ہو گئی۔

مغرب والوں نے ساری ذمہ داری شادی کے اصل فریقین یعنی لڑکے اور لڑکی کو سونپ دی۔ وہ جیسے ہی قانونی بلوغت کی حد پار کریں اپنے لیے ساتھی ڈھونڈنے کی انہیں مکمل آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ اب یہ ان دونوں پہ منحصر ہے کہ چاہیں تو پہلی ملاقات کے اگلے لمحے ہی شادی کر لیں اور چاہیں تو کئی کئی برس آزاد تعلق کے ساتھ ایک دوسرے کو پرکھتے رہیں۔ مگر ہمارے ہاں شادی لڑکے لڑکی کی بجائے والدین کا مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ بلکہ یہ مسئلہ خود انہوں نے اپنے گلے ڈال رکھا ہے۔

ہمارے ہاں والدین کا المیہ یہ ہے کہ وہ عمومی طور پر اولاد کو زندگی کا کوئی واضح اور بامعنی مقصد سمجھانے اور سکھانے میں ناکام ہیں۔ حالات کی مار نے انہیں اس قابل ہی نہیں رہنے دیا کہ وہ اولاد کے ساتھ وابستہ اپنی اہم ترین ذمہ داری کو سمجھ پائیں۔ ان جانے میں انہوں نے سماجی روایات کے بہت سے ایسے ناروا بوجھ اپنے کاندھوں پہ لاد رکھے ہیں جو ان کے شعور کو معطل کیے رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں کوئی بھی قدم اٹھاتے وقت یہ سوال ان کے سامنے پھن اٹھا کے کھڑا ہو جاتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ سماج بھلے کتنے ہی غلط راستے پر کیوں نہ گامزن ہو، والدین کی کم علمی اور سماج کی ناراضگی کا خوف انہیں اس راستے سے انحراف کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ بے چارے تو یہ سوچنے کے قابل بھی نہیں رہتے کہ سماج کے تتبع کے نتیجے میں وہ اپنے اور اپنی اولاد کے مستقبل کو کن مصائب کی بھٹی میں جھونک رہے ہیں۔

جو اقوام بامعنی اور دیرپا خوشی کے مفہوم سے آشنا نہیں ہوتیں وہ اپنی زندگی کے خالی پن کو بے معنی اور وقتی خوشیوں سے بھرنے کی کوشش کرتی ہیں جن کا نتیجہ خوشی کے مقابلے میں کئی گنا بڑے نقصان کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اس بات کا مطلب سمجھنا ہو تو آپ اپنے ہاں ہونے والی شادیوں سے جڑے معاملات اور تقریبات پر نظر ڈال لیں جہاں ہم صرف اپنی نام نہاد عزت کو بچانے کے لیے کیے گئے نمائشی اقدامات پر اپنی اوقات سے بڑھ کر خرچ کر ڈالتے ہیں۔ اور اس کے بعد شکوے شکایتوں اور پچھتاووں کا ایک نامختتم سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

بزرگی کا مطلب ہے دانائی مگر افسوس کہ ہمارے ہاں والدین کی اکثریت بڑھاپے کی سٹیج پر ضرور پہنچتی ہے مگر بزرگی کے منصب پر فائز ہونے میں ناکام رہتی ہے۔ انہیں اپنی تمام تر جہالت کے باوصف یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں جبکہ ان کی اولاد میں اتنی عقل نہیں کہ وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کر سکیں۔ وہ عمر کو عقل کا پیمانہ سمجھتے ہیں۔ جبکہ صورتحال یہ ہے کہ پاکستانی والدین کی اکثریت اپنے خوف اور روائت پسندی کی بنیاد پر نہائت غیر عقلی اور ناکام فیصلے کرنے کی مہارت سے متصف ہوتی ہے۔ والدین ہونے کے ناطے وہ خود کو اپنی اولاد کا مالک جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہیں اپنے بچوں کے لیے ان کی مرضی اور دلائل کو رد کر کے فیصلے کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ لڑکوں

کے لیے پھر بھی یہ گنجائش کسی حد تک موجود ہوتی ہے کہ وہ اپنی معاشی اہمیت کی بنیاد پر والدین کو اپنا فیصلہ ماننے پر مجبور کر دیں مگر بیٹی کے لیے ایسا کرنا ناممکنات کا درجہ رکھتا ہے۔ اسے تو روزِ اول سے ہی ماں باپ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے لیے سدھایا جاتا ہے۔

جنسی شناخت کا ایک اہم پہلو

ہم جنس پسندی اور اس کا المیہ

ہماری بندھی ہوئی نفسیات کا المیہ ہے کہ وہ ہمیں روٹین سے ہٹ کر سوچنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ہم سٹیریو ٹائپس کے کھونٹے سے بندھے ہیں اور انہیں دنیا کا سب سے بڑا سچ اور نارمل مظہر سمجھے بیٹھے ہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم صرف اپنی اور اپنے جیسے دوسروں کی فطرت کو ہی نارمل کا درجہ دیتے ہیں۔ اور اگر کسی کی فطرت ہم سے مختلف ہو تو ہم اسے نیچرل اور نارمل ماننے سے نہ صرف انکار کر دیتے ہیں بلکہ ایسے افراد کو اپنی فطرت کے اظہار کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ جب ہم ان معاملات کو اپنی محدود اور ناقص مذہبی آنکھ سے دیکھتے ہیں تو ہماری سوچ میں سختی اور تشدد کا عنصر بھی در آتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب ہم دلیل سے محروم ہو کر تجزیے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔

دنیا کا کوئی بھی معاشرہ ایسا نہیں جہاں ہوموسیکسوئل (مرد) لزبین (عورتیں) اور تیسری جنس کے حامل خواجہ سرا نہ پائے جاتے ہوں۔ سوائے جنسیت کے اختلاف کے ان گروہوں سے وابستہ افراد بالکل ویسے ہی اچھے یا برے، اعلیٰ و ادنیٰ، تخلیقی یا غیر تخلیقی ہوتے ہیں جیسے کہ ہم، جو اپنی جنسیت کی وجہ سے خود کو امتیازی طور پر 'نارمل' کا درجہ دیئے بیٹھے ہیں اور محض اپنی اکثریت کی دھونس سے انہیں خوفزدہ کیے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ جو ہم اپنی جنسی شناخت کے نارمل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس میں ہمارا

کیا کمال ہے؟ یہ تو سراسر ایک فطری معاملہ ہے جس میں ہماری کسی خواہش یا فیصلے کا ذرا بھی عمل دخل نہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم سے مختلف جنسی شناخت رکھنے والے لوگ فطرت کی تخلیق نہیں ہیں؟ آپ کا کیا خیال ہے کہ ان گروہوں سے وابستہ افراد نے قدرت سے بغاوت کرتے ہوئے خود اپنی سیکسوئیلٹی کو ہم سے مختلف شکل میں ڈھال لیا ہے اور اب ہمارا یہ فرض ہے کہ ان کو اس بغاوت کی سزا دی جائے۔ اگر ہماری سوچ یہی ہے تو یقین جانئے ہم سخت غلطی پر ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس مسئلے کا تعصب کی عینک اتار کر جائزہ لیا جائے؟

پہلی بات تو یہ عام جنسی شناخت سے ہٹی ہوئی شناخت کے حامل افراد جو مرد اور عورت کے معمول کے رشتے سے ہٹ کر اپنی جنسی تشفی پر خود کو مجبور پاتے ہیں، وہ خود سے ایسے نہیں بنتے بلکہ یہ وصف ان کی فطرت میں موجود ہوتا ہے۔ خواجہ سرا بنتے نہیں بلکہ پیدا ہو تے ہیں۔ ممکن ہے کچھ افراد کے حوالے سے یہ معاملہ مختلف ہو اور وہ سماجی وجوہات کی بنا پر خواجہ سرا بننے کی جانب مائل ہو جاتے ہوں۔ اگر ایسا ہے بھی تو ہم پھر بھی اس بات پر اصرار کریں گے کہ سماجی اثرات بھلے کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں، فرد کی سرشت میں ایسا بننے کا رجحان لازماً موجود ہوتا ہوگا۔ ہاں البتہ سماجی رویے اس رجحان کو انگیخت کر کے واضح شکل دینے کا کام ضرور کرتے ہیں۔ فرض کیجئے اگر یہ انگیخت موجود نہ بھی ہو تو ہم ایسے فرد کی مختلف جنسی شناخت سے کیونکر انکار کر سکتے ہیں۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس صورت میں بھی وہ فرد مسلسل ایک خاص طرح کی بے چینی، کرب اور ذہنی تناؤ کا شکار رہتا ہوگا۔ میں ایسے کئی افراد کو جانتا ہوں جو ادھیڑ عمری تک گناہ کے تصور کے تحت اپنی جنسیت سے انکار کے عذاب میں مبتلا رہے۔ یہ نام نہاد نارمل جنسیت کے حامل افراد کے سماج کی ظالمانہ بے حسی ہے جو انسان کو انسان سمجھنے سے عاری ہے۔

مختلف جنسی شناخت ایب نارمیلٹی کیوں؟

ایک اور سوال بھی اٹھایا جانا ضروری ہے کہ ہم جو خود کو نارمل سمجھتے ہیں، آخر کن بنیادوں پر اپنے سے مختلف سیکسوئیلٹی کے حامل افراد کو ایب نارمل کہتے ہیں؟ صرف اس بنیاد پر کہ ان کی جنسی جبلت ہم سے

ذرا مختلف انداز میں تسکین پاتی ہے۔ اگر آپ کو عورت کشش کرتی ہے تو اس میں آپ کا کیا کمال ہے؟ اور اگر ایک گے (Gay) کو عورت کشش نہیں کرتی تو اس میں اس کا کیا قصور؟؟ اگر یہ قصور ہے تو پھر اس کی ذمہ داری سیدھی سیدھی قدرت پر عائد ہوتی ہے کہ اس نے ہوموسیکسوئل کی سرشت میں ٹیڑھ رکھ دی۔ یہی الزام کہیں زیادہ تیقن کے ساتھ خواجہ سراؤں کے حوالے سے عائد کیا جاسکتا ہے کہ قدرت ان کے جنسی اعضا مکمل کرنے میں ناکام رہی۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ الزام تراشی سے حل نہیں کیا جاسکتا، ہاں البتہ اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں کہ ہمارے درمیان بہت سے ایسے افراد موجود ہیں جن کی جنسی شناخت روٹین سے ہٹی ہوئی ہے۔ تو کیا اس سے اس بات کا جواز حاصل کیا جاسکتا ہے کہ ان افراد کو اجتماعی جبر کے ساتھ مجرموں کی طرح چھپنے پر مجبور کر دیا جائے۔ آخر ہم کس دلیل کے ساتھ ان سے نفرت اور تضحیک کا رویہ رکھ سکتے ہیں۔ کیا ان میں اور آپ میں جنسی شناخت کے علاوہ کوئی اور فرق بھی ہے؟ کیا وہ تخلیقی ذہن کے مالک نہیں؟ کیا وہ روٹین کے کام سرانجام دینے سے معذور ہیں۔ کیا وہ عبادت گزار نہیں ہیں؟ اگر ان میں کچھ لوگ اچھے کردار کے حامل نہیں تو نام نہاد نارمل جنسیت کے حامل افراد میں بدکردار افراد کی تعداد ان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ آخر وہ آپ سے جنسیت کے علاوہ اور کس معاملے میں مختلف یا عجیب ہیں۔ اگر ہم مرد اور عورت کی جنسی شناخت کو بلا اکراہ تسلیم کرتے ہیں تو ان کی شناخت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ سوچنے کی بات تو یہ بھی ہے کہ اس فطری اختلافی صورت کو تسلیم کرنے کی وجوہات اپنی اصل میں فطری ہیں یا سماجی؟

کیا آپ کوئی ایسی ڈش خوشی سے اور پیٹ بھر کے کھا سکتے ہیں جسے دیکھتے ہی نہ صرف آپ کی بھوک مر جائے بلکہ اُلٹا متلی ہونے لگے؟ جبکہ پاس ہی آپ کی کوئی پسند کی ڈش بھی موجود ہو۔ اور اگر کوئی آپ کو حکماً ایسا کرنے پر مجبور کرے تو آپ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے؟ کیا آپ اس سے اس کی دھونس کی دلیل طلب نہیں کریں گے؟ کیا آپ اس سے یہ نہیں کہیں گے کہ وہ آپ کو وہ ڈش کھانے پر کیوں مجبور کر رہا ہے جسے ہضم کرنا تو دور کی بات آپ زبان پر بھی نہیں رکھ سکتے۔ اگر آپ حکم دینے والے سے خوف زدہ ہیں اور مزید یہ کہ اس کی پشت پر اکثریت کی دھونس بھی کھڑی ہے تو پھر ایک ہی

صورت بچتی ہے، اور وہ یہ کہ آپ بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیں۔

غور کیجئے کیا ہم نام نہاد نارمیلٹی کے دعوے دار اپنے سے مختلف سیکسویلیٹی رکھنے والے انسانوں کے ساتھ ایسا ہی نہیں کر رہے۔ مجھے ایک گے (Gay) نے بتایا کہ عورتیں اسے ایک پرسینٹ بھی کشش نہیں کرتیں۔ ان کا جسم اسے بالکل بے جان ربر جیسا لگتا ہے جسے چھو کر اس کی جنسی حس ذرا سا بھی ارتعاش محسوس نہیں کرتی۔ جبکہ ان کے آرگیزم کے وقت ایسی متلی انگیز بدبو آتی ہے کہ کچھ دیر کے لیے باقاعدہ سانس روکنا پڑتا ہے اور پھر فراغت پاتے ہی باتھ روم کی جانب بھاگنا پڑتا ہے۔ یہ ایک شادی شدہ شخص کی کہانی ہے جسے اس کے گھر والوں نے زبردستی شادی کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ بیوی کے ساتھ سیکس کرنا کسی عذاب جیسا تھا جو زبردستی اس پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ وہ تو شکر ہوا کہ سات برس بعد طلاق ہوئی تو ان صاحب کی اپنی فطرت کے خلاف اس رشتے سے جان چھوٹی۔ یہی معاملہ لیزبین عورتوں کا ہے کہ جنہیں دوسری عورتوں کے برعکس مردوں میں بالکل کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کے دل کا انتخاب ان کی ہم جنس ہی ہوتی ہیں۔

پیٹ کی بھوک ہو یا سیکس کی، یہ ہر حال میں اپنی تسکین چاہتی ہے، ہمیں نہ تو یہ حق حاصل ہے اور نہ ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل کہ ہم کسی کی جبلت کی تسکین کے خلاف کوئی حکم صادر کر سکیں۔ ہاں البتہ اس تسکین کے لیے اختیار کیے گئے راستوں پر ضرور بحث ہو سکتی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک سوال اٹھاتے چلیں اور وہ یہ کہ آخر مرد اور عورت آپس میں تعلق کیوں بناتے ہیں؟ کیا صرف اولاد کے لیے؟ یا اس کا محرک کوئی اور جذبہ ہے، جیسے کہ جنسی کشش۔ کیا آدم اور حوا نے پہلا جنسی تعلق اپنی نسل آگے بڑھانے کے لیے بنایا تھا یا اس کا محرک ان میں ظاہر ہو جانے والا جنسی جذبہ تھا؟ میرے خیال میں اگر معاملہ جنسی نہ ہوتا تو کھایا ہوا سیب یا گندم کا دانہ کبھی آدم اور حوا کے اولین سنجوگ کی علامت کا روپ نہ دھارتے۔ جدید سائنس نے تو ویسے ہی سیکس ریلیشن اور اولاد کی پیدائش کے دائروں کو بالکل الگ کر دیا ہے۔ سو اب سیکس نسل بڑھانے سے کہیں زیادہ صرف لطف لینے کا معاملہ ہے۔ یہ لطف ایک خاص وقت میں دو افراد کا سراسر ایک نجی معاملہ ہے جس میں کسی تیسرے کو مداخلت یا فتویٰ بازی کا حق

نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں البتہ کسی فرد کا کسی دوسرے کو زبردستی اپنے لطف کے لیے استعمال کرنا (بھلے وہ اس کی منکوحہ ہی کیوں نہ ہو) ایک سنگین سماجی جرم ہے۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کتنے ایسے شوہر ہوں گے جو اپنی بیویوں سے ان کی مرضی کے خلاف نہ صرف سیکس کرتے ہوں گے بلکہ اس دوران ایسے طریقے اختیار کرتے ہوں گے جو ان کی بیویوں کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تکلیف دہ ہوتے ہوں گے، مگر وہ عورتیں سماجی دباؤ کی وجہ سے خاموش رہنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اگر آپ نے پورن فلمیں دیکھ رکھی ہیں تو پھر مجھے اپنی بات سمجھانے کے لیے تفصیل میں جانے کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔ تو کیا ہم نے کبھی سوسائٹی کے اس ناجائز اور قابل نفرت دباؤ کو ختم یا کم کرنے کے بارے میں سوچا جس نے ممکن ہے خود ہماری اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی ہو۔ بلکہ عملی صورت حال یہ ہے کہ اگر کوئی عورت آواز اٹھاتی بھی ہے تو سوسائٹی کی ساری مردانگی اس کے مقابل اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ نارمل سیکسوئیلٹی کے دعویداروں کے ہاں ان سے مختلف جنسیت کے حامل افراد کے لیے نفرت کی حد تک ناپسندیدگی پائی جاتی ہے، اور یہ معاملہ ہماری سوسائٹی میں کچھ زیادہ ہی شدید ہے۔ مگر ان شریف لوگوں نے جواباً کبھی ایسا رویہ نہیں اپنایا کیونکہ وہ اکثریت کی جابرانہ دھونس سے ڈرے ہوئے لوگ ہیں۔ سماج کی اجتماعی پر چلت سوچ اور اخلاقی معیار اکثر اپنے ہی اراکین کے لیے مصیبت بن جاتے ہیں کیونکہ وہ ان کی حقیقی ضروریات کی مخالف سمت میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اکثریت سے ہٹ کر مختلف سیکسوئیلٹی کے حامل افراد کے لیے تو یہ صورتحال بہت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

عوام ہی نہیں خواص کی سطح پر بھی فرد کی جنسی شناخت کا معاملہ سخت غلط فہمی کا شکار ہے۔ ہم نے روٹین سے ہٹی ہوئی جنسی شناخت کو خوامخواہ گناہ سے جوڑ دیا ہے جبکہ اس کے لیے ہمارے پاس کوئی علمی اور عقلی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ مذہبی افراد بنا کسی سنجیدہ تحقیق کے اس موقف پر کھڑے ہیں کہ ہم جنسیت سماجی کج روی کا معاملہ ہے اور اس کی ابتدا حضرت لوط کی قوم سے ہوئی تھی جبکہ سائنسی ریسرچ

یہ بتاتی ہے نہ صرف انسانوں میں یہ خلقی معاملہ ہے بلکہ جانوروں کی 1500 کے قریب انواع ایسی ہیں جن میں ہم جنسیت کا واضح میلان پایا جاتا ہے جن میں پینگوئن، چمپینزی اور ڈالفن شامل ہیں۔ گویا یہ معاملہ کسی سماجی کج روی کا نہیں بلکہ جانوروں اور انسانوں کی فطرت کا ناگزیر حصہ ہے۔ سگمنڈ فرائڈ جسے جدید نفسیات کا باوہ آدم مانا جاتا ہے، اس کے مطابق ہر فرد دونوں طرح کے جنسی رجحان لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر اسے آزادانہ انتخاب کا موقع فراہم کیا جائے تو پھر وہ خود سے طے کر سکتا ہے کہ اسے کس صنف کے ساتھ تعلق بنانا زیادہ تسکین دہ لگتا ہے۔ لیکن سماجی دباؤ اکثر ہم جنس پسندوں کو اپنی سیکسوئیلٹی کے اظہار کی اجازت نہیں دیتا۔ مذہبی ذہن کے مقابل فرائڈ کی بات اس لیے زیادہ وزنی ہے کہ وہ اس کے برعکس ریسرچ کی بنیاد پر بات کرتا ہے جسے محض مذہبی اساطیر کے ذریعے غلط ثابت کرنا ممکن نہیں۔

1973ء سے پہلے تک ہم جنسیت کو ایک بیماری تصور کیا جاتا تھا اور خیال تھا کہ علاج کے ذریعے فرد کو 'نارمل' جنسی رویئے کی جانب لایا جا سکتا ہے مگر جب علاج سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی تو اس رجحان کو بیماریوں کی فہرست سے نکال کر فطری تسلیم کر لیا گیا۔ بہت سے سائنسدان اس رائے کے حامل ہیں کہ ہم جنسی رویہ خلقی اور پیدائشی ہے نا کہ سماجی۔

بہت سے افراد ایسے ہیں جو اگرچہ مخلوط جنسی ہیں مگر ان میں عورت بن کر جینے کی خواہش حاوی ہوتی ہے۔ وہ اپنی غیر واضح مخلوط جنسی شناخت کے ساتھ بے چینی کا شکار رہتے ہیں۔ انہیں یوں لگتا ہے جیسے ان کے مردانہ بدن میں کوئی عورت قید ہو جس کی آزادی کے بعد ہی وہ نارمل زندگی جی پائیں گے۔ یہ یقیناً ایک اذیت ناک زندگی ہے جو انہیں قدرت کی غلطی کے نتیجے میں ملتی ہے۔ اگرچہ جدید سائنس نے ان کے لیے تبدیلی جنس کے آپریشن کے ذریعے واضح جنسی شناخت کا انتخاب ممکن بنا دیا ہے مگر اس عمل کو سماجی قبولیت پانے میں شدید دشواری کا سامنا ہے۔ ایک چوبیس سالہ ایرانی نوجوان علی عسکر جو آپریشن کے بعد نگار کے نام سے لڑکی بن کر اپنی فطری شناخت حاصل کر چکا ہے، اپنے باپ کے رویئے سے شدید پریشان ہے۔ نگار کے باپ نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے آپریشن کروایا تو وہ اسے قتل

کردے گا۔ نگار کے بقول وہ اسے چائے میں چوہے مار گولیاں ملا کر مارنے کی کوشش کر چکا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر آپریشن ناگزیر نہ ہوتا تو وہ خدا کے کام میں دخل کیوں دیتی۔ مگر وہ کیا کرے کہ علی عسکر کے نام سے اس کی کوئی شناخت نہیں تھی۔ وہ مردوں میں کام نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ اسے ہراساں کرتے تھے۔ اور عورتوں کے ساتھ کام کرنے میں یہ رکاوٹ تھی کہ وہ قانونی طور پر عورت نہیں تھی۔

پوری اسلامی دنیا میں ایران واحد ملک ہے جہاں آیت اللہ خمینی کے فتوے کے ذریعے ایسے آپریشن کی قانونی اجازت دی گئی ہے۔ دنیا میں تھائی لینڈ کے بعد ایران ایسا ملک ہے جہاں تبدیلی جنس کے سب سے زیادہ آپریشن ہوتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مخلوط النسل افراد کے جنسی تبدیلی کے آپریشن کے نصف اخراجات ایرانی حکومت ادا کرتی ہے۔ مگر اس معاملے کا ایک دردناک پہلو بھی ہے کہ ایران میں ہم جنس پسند ہونے کی سزا موت ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر فرد اپنی جنس بدلنے کا خواہاں ہو لیکن المیہ یہ ہے کہ اپنی سیکسوئیلٹی کے اظہار کی قیمت انہیں سزائے موت کی صورت میں ادا کرنا ہوگی۔ ایسے بہت سے افراد ہیں جنہیں اس سماجی اور حکومتی جبر سے نجات کے لیے وطن سے فرار ہونا پڑا۔

پاکستان میں ایسے افراد کے لیے تبدیلی جنس کا کوئی قانون موجود ہی نہیں جو اپنے ظاہری مردانہ جسم میں عورت بننے کی خواہش لیے پھرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے پاس اپنی اس عین فطری خواہش کو پورا کرنے کا صرف ایک ہی راستہ بچتا ہے کہ وہ اپنا مردانہ عضو قطع کروا کے خواجہ سراؤں کی کسی ٹولی میں شامل ہو جائیں۔ ایسے فرد کو نربان کہا جاتا ہے اور خواجہ سرا اسے بہت عزت دیتے ہیں۔ نربان بننے کا عمل بڑے دل گردے کا تقاضہ کرتا ہے۔ یہ ایک خطرناک جراحی ہے جو کسی سرجن کی مدد کے بغیر سرانجام دی جاتی ہے۔ اس میں متعلقہ فرد کی جان بھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ خواہش کتنی منہ زور ہوگی جس کے لئے کوئی فرد ایک ایسے عضو کی قربانی پر بخوشی راضی ہو جاتا ہے جس کے لیے کوئی مرد کروڑوں کے عوض بھی حامی نہ بھرے۔

یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر نفرت بھری ہونہہ کہہ کر منہ پھیر لیا جائے۔ یہ کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس کے اندر قید عورت کے راستے میں اس کا مردانہ بدن کسی ولن کی طرح کھڑا ہے جس کی اسے

کوئی خواہش نہیں ہے کہ وہ اس کی حقیقی جنسی شناخت کا دشمن ہے۔ یہ جسم جیل کی کال کوٹھڑی جیسا ہے جس میں بند ایک عورت کا دم گھٹ رہا ہے۔ سماج اس عورت کو باہر آنے کی اجازت دینے پر راضی نہیں کیونکہ وہ خود گناہ اور ثواب کے تصور کا قیدی ہے۔ اگرچہ اس کے پاس اپنے ان تصورات کی کوئی مدلل توضیح بھی نہیں ہے۔ سماج کے پاس ایسے مظلوم انسان پر سوائے استہزاء کرنے اور اس کے فطری لطف پر پابندی کا حکم جاری کرنے کے نہ تو کوئی علاج ہے اور نہ ہی کوئی جواب۔ سماج ایسے فرد کی اذیت محسوس کرنے سے یکسر عاری ہے۔ ایک ایسا فرد جو اپنی حقیقی جنسی شناخت کی بازیافت چاہتا ہے، سوسائٹی بے دلیل دھونس کے ساتھ اس پر اپنا جبر نافذ کر دیتی ہے۔

میں ایسی کئی لڑکیوں کے بارے میں اخبارات پڑھ چکا ہوں اور چند ایک کو ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں جو اپنی محبوبہ کی مستقل رفاقت کی خاطر جنس کی تبدیلی کا آپریشن کروانے کو تیار ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی تو خود ڈاکٹر ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ ایک لڑکی کے اپنی حقیقی شناخت کو پانے کی تڑپ کا معاملہ ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس تبدیلی کے بغیر اس کی روح قرار نہیں پا سکے گی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کیا سماج کے نارملیٹی کے دعوے داروں کو کسی دوسرے کی جنسیت کو طے کرنے کا حق دیا جا سکتا ہے؟ آخر سماج کے پاس اس تحکم کے لیے کیا دلیل ہے؟؟

ممکن ہیں وہ یہ کہیں کہ یہ جنسی بے راہروی کا معاملہ ہے۔ مگر یہ ایک بہت بودی بات ہے۔ جنسی بے راہروی کی اگر تعریف متعین کی جائے تو وہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ کسی بھی فرد کی کسی دوسرے کی جنسی زندگی میں مداخلت ہی اصل میں جنسی بے راہروی ہے نہ کہ دو آزاد افراد کا باہمی مرضی سے تعلق۔

جہاں تک حقیقی معنوں میں جنسی بے راہروی کا تعلق ہے، اس سے تو ہمارا سماج لتھڑا پڑا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا جب معصوم بچوں، لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں کے ساتھ زیادتی کی خبریں میڈیا میں نہ آتی ہوں۔ ابھی حال ہی میں قصور کے ایک سرحدی گاؤں میں سامنے آنے والا اسکینڈل اس کی بدترین مثال ہے۔ اس سے پہلے جاوید نامی ایک جنونی کا معاملہ بھی سامنے آیا تھا جس نے سو کے قریب بچوں

کے ساتھ زیادتی کے بعد انہیں قتل کر کے ان کے اجسام کو تیزاب میں گلا ڈالنے کے بھیانک جرم کا اعتراف کیا تھا۔

یہ تو خیر سیدھے سیدھے غیر قانونی اور غیر اخلاقی معاملات کی بات ہے مگر ہمارے ہاں تو اخلاق مذہب اور قانون کے نام پر بھی جنسی جرائم عام ہیں لیکن انہیں جرم نہیں سمجھا جاتا بلکہ الٹا شادیانے بجائے جاتے ہیں۔ میرا اشارہ ان شادیوں کی طرف ہے جن میں دولہا دولہن کی بالکل مرضی شامل نہیں ہوتی۔ کئی معاملات میں تو دونوں ہی کہیں اور شادی کے خواہشمند ہوتے ہیں مگر انہیں شادی کے مقدس بندھن کے نام پر جبراً ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ کئی شادیاں تو اتنی انمل بے جوڑ ہوتی ہیں کہ کم عمر بچیوں کو باپ سے بڑی عمر کے شخص سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ عموی طور یہ وہ عمر ہوتی ہے جب بچیوں کو معلوم تک نہیں ہوتا کہ شادی کس چڑیا کا نام ہے۔ وہ بے چاریاں تو بس نئے کپڑوں کے چاؤ میں ماری جاتی ہیں۔ اگر ہم ریپ کی تعریف کے تعین کی بات کریں تو یہ ایسا عمل ہے جس میں کوئی فرد اپنی مخالف جنس کے فرد کے ساتھ زبردستی جنسی تعلق بنائے۔ اس تعریف کے مطابق دیکھیں تو ہمارے ہاں ہونے والی ناپسندگی شادیاں ریپ کے زمرے میں ہی آتی ہیں۔

خواجہ سرا

ہمارے سماج کی ایک بدنصیب کمیونٹی جن کے لیے ہم نام نہاد نارمل اور مہذب لوگوں کے پاس ایک استہزا اور بھیک کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم انہیں ایک ایسی خامی کی سزا دینے پر تلے ہیں جن میں ان بے چاروں کا ایک فیصد بھی قصور نہیں۔ اور سزا بھی یہ کہ ہم انہیں انسان کے طور پر قبول کرنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ ہم نے ان کی جنسیت کو زبردستی ان کے کردار کے ساتھ نتھی کر دیا ہے اور کردار بھی ایسا کہ جس پر اٹھتے بیٹھتے اخ تھو کر کے ہم اپنے کردار کا بھرم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ اس کمیونٹی کے حوالے سے بدچلنی اور بے راہ روی کے ہزاروں الزام دہرائیں مگر سچ تو ہے کہ ان کے ساتھ ہمارا رویہ ظالمانہ حد تک غیر انسانی ہے بلکہ یہ رویہ ہمیں اخلاقی حوالے سے بے حد کمزور، گھٹیا اور معذور ثابت کرتا ہے۔ ہمیں کیونکر یہ حق حاصل ہے کہ ہم انہیں محض جنسیت کی بنیاد پر ایک کریہہ بلکہ مضحکہ خیز زندگی جینے پر

مجبور کریں۔ اگر ہم خواجہ سراؤں پر بے راہ روی کا الزام دھرتے ہیں تو یہ کیوں نہیں سوچتے کہ انہیں اس راہ پر دھکیلنے میں ہمارا کتنا ہاتھ ہے۔ وہ کون ہیں جو خوبصورت مخنثوں پر عاشق ہوتے ہیں، ان کے ساتھ تعلق بنانے کے لیے مرے جاتے ہیں۔ کئی تو ان کے ساتھ شادی تک کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ کون ہیں جو گاڑیوں میں ان مقامات کا طواف کرتے ہیں جہاں یہ مخنث رات ڈھلے اپنی 'روزی' کمانے کی آس میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اور وہ کون معززین ہوتے ہیں جو انہیں گاڑیوں میں بٹھا کر یا قریبی جھاڑیوں میں لے جا کر چند روپوؤں کے عوض گھٹیا لذت کا گھناؤنا کھیل کھیلتے ہیں۔ اور پھر دن کی روشنی میں اپنے جیسے دوسرے 'معززین' کے ساتھ مل کر ان کے کردار پر طعن کستے ہیں۔ ان پر بدکرداری کی تہمت دھر کر خود کو باکردار ثابت کرتے ہیں۔

سچ پوچھیے تو یہ خواجہ سرا اپنی ذات میں ہماری منافق اور بدکردار سوسائٹی کے عکس کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ ہم ہیں جنہوں نے انہیں یہ کردار ادا کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ یہ کوئی جرم نہیں کہ انہیں عورتوں کی طرح بننا سنورنا اور رقص کرنا اچھا لگتا ہے۔ مگر یہ بناؤ سنگھار اور رقص کو ہم کس بنیاد پر غیر اخلاقی حرکت گردان سکتے ہیں۔ یہ تو سراسر کسی فرد کا وہ ذاتی فعل ہے جو کسی دوسرے کا کوئی نقصان نہیں کرتا۔ اگر ان کا لباس دیکھ کر کسی کے اندر کا وحشی جانور بھڑک اٹھتا ہے تو وہ اپنا علاج کروائے نہ کہ خواجہ سراؤں کے انداز زیست کو بدلنے کا مطالبہ کرے اور انہیں اپنے جیسا 'نارمل' بننے پر مجبور کرے۔ اگر آپ کو ان کا کردار بدلنے کی اتنی ہی خواہش ہے تو انہیں ایک انسان کے طور پر قبول کیجیے۔ ان کے لیے تعلیم، تربیت اور روزگار کے وہ تمام دروازے کھول دیجیے جو آپ نے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے روا سمجھ رکھے ہیں۔

جنسی بے راہروی میں سماجی جبر کا حصہ

سچ تو یہ ہے کہ یہ جسے ہم جنسی بے راہ روی کہتے ہیں یہ سراسر نام نہاد نیک اور پارسا سماج کا پیدا کیا ہوا مسئلہ ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ اس بے راہ روی سے جنسی بھوک مٹانے والے مرد بھی اس کے خلاف بلند آواز میں نعرہ زن ہیں۔ سماج کی طرف سے ہونے والا دوہرا ظلم یہ ہے کہ پہلے تو مختلف جنسی شناخت

کے افراد کو اچھوت بنا دیا جاتا ہے اور پھر چھپ چھپا کر انہی سے جنسی لذت بھی کشید کی جاتی ہے۔ سماج صدیوں سے اس بات پر اڑا کھڑا ہے کہ انہیں نارمل انسان کے طور پر قبول نہیں کرنا بھلے وہ عام لوگوں کے مقابلے میں کتنے ہی زیادہ باکردار اور پروڈکٹو کیوں نہ ہوں۔

خواجہ سراؤں کی صورتحال بڑی تکلیف دہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یہ لوگ لڑکے کی پیدائش اور شادی بیاہ کے مواقع پر ناچ گا کر روٹی کما لیتے تھے مگر شادی ہالوں اور میٹرنٹی ہومز کے رواج نے ان کو تقریباً بے روزگار کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ ہم نے کام کے تقریباً سبھی شعبوں میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ چونکہ سوسائٹی انہیں ایک نارمل انسان کے طور پر قبول کرنے سے انکاری ہے سو ان کے لیے دن کے وقت بھیک مانگنے اور راتوں کو سیکس ورکر کے طور کام کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچا۔

غور کریں تو اصل مسئلہ ان افراد کا نہیں جو پیدائشی طور پر ہم جنس پسند یا خواجہ سرا ہیں بلکہ اصل مسئلہ تو ان لوگوں کا ہے جو عورت دستیاب نہ ہونے کی صورت میں معصوم بچوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں اور کئی کیسز میں ان کو بے دردی سے قتل بھی کر دیتے ہیں۔ یہ ہولناک جرم ہمارے ہاں تیزی سے پھیل رہا ہے مگر سوسائٹی اس کے بارے میں ذمہ دارانہ حساسیت سے عاری دکھائی دیتی ہے۔ ہاں البتہ خوفناک سزا دلوانے کے مطالبے میں بہت اتاؤلی دکھائی دیتی ہے۔

انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کے مطابق پاکستان میں ایک کروڑ پچیس لاکھ بچے مزدوری کرنے پر مجبور ہیں اور یہی وہ بچے ہیں جو جسمانی اور جنسی تشدد کا آسان ترین شکار بنتے ہیں۔ اکثر ٹرک ڈرائیور گھروں سے کئی کئی روز دور رہنے کی وجہ سے اس خلت کے عادی ہوتے ہیں۔ اول تو وہ کوئی نوعمر لڑکا سفر میں اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور اگر یہ 'سہولت' بوجوہ دستیاب نہ ہو تو وہ راستے میں پڑنے والے ہوٹلوں پر ملازمت کرنے والے بچوں کے ساتھ زبردستی بدفعلی کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ہوٹلوں اور ورکشاپوں پر کام کرنے والے بچے اکثر اپنے مالکان کی ہوس کا آسان ہدف ہوتے ہیں۔ اسی طرح کچرا اکٹھا کر کے بیچنے والے لڑکوں پر بھی اکثر اوباشوں کی نظر ہوتی ہے اور انہیں جب بھی موقع ملے ان کے ساتھ زیادتی کر گزرتے ہیں۔

مذہبی مدارس اور علت المشائخ

ہمارے ہاں مذہبی مدرسوں میں یہ علت عام ہے، خاص طور پر ایسے مدارس جہاں دور دراز علاقوں کے غریب والدین اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم اور حفظِ قرآن کے لیے داخل کروانے کے بعد مہینوں ان کی خبر نہیں لیتے۔ زیادتی کا شکار ہونے والے یہی بچے جب تعلیم کی تکمیل کے بعد کسی مسجد میں امام بنتے ہیں تو یہ خود بھی کوئی کمی نہیں اٹھا رکھتے۔ یہ حضرات جب گھروں میں بچوں کو قرآن پڑھانے جاتے ہیں تو وہاں بھی ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جن بچوں کے ساتھ یہ واردات ہوتی ہے ان میں سے اکثر بچے خوف کی وجہ سے والدین کو نہیں بتا پاتے کہ مولوی صاحب مقدس تعلیم کے پردے میں کتنا گھناؤنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ جو بچے بتانے کی جرأت کرتے بھی ہیں اُلٹا انہیں والدین کی جانب سے مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت کم والدین ہیں جو اپنے بچوں کے سچ پر یقین کرتے ہیں، ورنہ اکثریت یہی سمجھتی ہے کہ بچہ تعلیم سے جان چھڑانے کا بہانہ کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں یہ بڑا مقبول خیال ہے اور ہم اسے بڑے فخر سے بیان بھی کرتے ہیں کہ اخلاقیات اور نیکی بدی کا تصور مذہب کی دین ہیں مگر افسوس کہ ہمارے معصوم بچے مذہب کے مبلغوں کے ہاتھوں ہی سب سے زیادہ خطرے کا شکار ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی مذہبی مدرسے سے تحصیل یافتہ طلبہ کے انٹرویو کر کے دیکھ لیجیے، آپکو تصدیق کے لیے کئی کہانیاں مل جائیں گی ورنہ اخبارات اور ٹی وی چینل تو آپکی پہنچ میں ہیں جو آئے دن ایسے گھناؤنے واقعات بیان کرتے رہتے ہیں۔

ہماری قابلِ احترام مگر ہم جنس پسند شخصیات

ہم نام نہاد نارمیلیٹی کے دعویداروں کو جب کسی کے روٹین سے ہٹے ہوئے جنسی رجحان کا علم ہوتا ہے تو ہم بنا سوچے سمجھے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کے احباب یا گھر کے افراد میں ایسے لوگ موجود ہوں جنہوں نے آپ کی نفرت کے خوف سے کبھی اس رجحان کو ظاہر نہ کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود آپ بھی اس رجحان کے حامل ہوں مگر سوسائٹی کی نفرت کا خوف آپ کو یہ حقیقت راز بنائے

رکھنے پر مجبور کرتی ہو۔ مگر عجیب بات ہے کہ سوسائٹی اس حوالے سے کبھی معروف ہستیوں اور خاص طور پر مذہبی حکمرانوں، صوفیوں، مولاناؤں، شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کو نہ صرف معتوب نہیں کرتی بلکہ اُلٹا انہیں سر پر بٹھاتی ہے۔ ایک نامِ نامی تو محمود غزنوی کا ہے جن کا اپنے غلام ایاز سے عشق بلا خیز مشہور ہے۔ اقبال کا یہ مصرعہ ''نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں'' اس عشق کی جانب ایک بلیغ اشارہ ہے۔ محمود غزنوی کے اس رجحان کے بارے میں تاریخ میں بھی کئی واقعات محفوظ ہیں۔ سلطان کے بارے میں خوند میر رقم طراز ہے۔

''سلطان محمود غزنوی کو مشتری چہرہ غلاموں سے عشق تھا۔ فضل بن احمد بھی اس شوق میں اپنے آقا کا مقلد تھا۔ مثل مشہور ہے کہ غلام اپنے آقا کی پیروی کرتا ہے۔ اسے کسی نے بتایا کہ ترکستان میں ایک نہایت حسین غلام ہے۔ اس زہرہ جبیں کو حاصل کرنے کے لیے فضل بن احمد نے اپنا ایک کارندہ وہاں بھیجا اور اسے تاکید کی کہ وہ غلام کو عورتوں کی طرح محمل میں چھپا کر لائے۔ ایک مخبر نے سلطان کو یہ بات بتادی۔ سلطان نے وزیر سے کہا کہ وہ اس سیم اندام کو حضور میں پیش کرے۔ وزیر لیت و لعل کرتا رہا۔ اگرچہ اسے یقین تھا کہ سلطان اس کی جان و مال پر قدرت رکھتا ہے۔ سلطان نے اپنے وزیر سے کہا کہ آج ہم تمہارے گھر آئیں گے۔ وزیر نے اسے اپنی عزت افزائی سمجھ کر سلطان کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ جب وہ غلام حور شمائل سلطان کے حضور میں آیا تو سلطان نے خشمگیں ہو کر وزیر کو سخت سست کہا اور اسی وقت حکم دیا کہ وزیر کا مال و متاع ضبط کر لیا جائے۔ اس کے چند روز بعد سلطان عازمِ ہند ہوا اور اس کی غیر حاضری میں دشمنوں نے اسے شکنجے میں کس کر عذاب دے دے کر مار ڈالا۔''

(دستور الوزراء)

ہماری تاریخ کا ایک معروف نام خلیفہ ہارون الرشید کا ہے جو جعفر برکی پر فریفتہ تھا۔ اس کا بڑا بیٹا امین بھی دن رات نوخیز لڑکوں کی صحبت میں وقت گزارتا تھا۔ اس کے سب سے چہیتے محبوب کا نام کوثر تھا۔

سعدی شیرازی جن کی حکایات ہمارے سکولوں کے سلیبس کا حصہ ہیں ہم جنسیت پسند تھے۔ اس حوالے سے ان کی معروف تصنیف 'گلستان' کا پانچواں باب قابل ذکر ہے۔ ان کی عادت تھی کہ خوبصورت لونڈوں کی جھلک دیکھنے کے لیے میلوں پیدل سفر کرتے تھے۔ ان کا یہ زبانِ زدِ خاص و عام شعر ان کے رجحان کی وضاحت کے لیے کافی ہے:

اگر آں ترک شیرازی، بدست آرد دل مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

پنجابی صوفی شاعر شاہ حسین بھی ایک نوخیز ہندو لڑکے کے ساتھ اپنے افلاطونی عشق کی نسبت سے مادھولعل حسین کے نام سے معروف ہوئے اور ساری زندگی اس کے نام لگا دی۔ میر تقی میر بدنامی کی حد تک اس رجحان کے حامل تھے۔ وہ اپنے دواوین میں دلی کے لونڈوں سے انتہائی بازاری زبان میں اظہارِ عشق فرماتے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے:

خط نمودار ہوا، وصل کی راتیں آئیں
جن کا اندیشہ تھا منہ پر وہی باتیں آئیں

جوش صاحب نے تو عشق کی ابتدا ہی ایک لڑکے سے کی اور اپنی خودنوشت 'یادوں کی برات' میں اس کا دھڑلے سے ذکر کیا۔ احمد بشیر نے اپنے ایک مضمون میں پطرس کے بڑے بھائی زیڈ اے بخاری کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ بھی یہ شوق فرماتے تھے۔

ان معروف شخصیات کے ہم جنسیت کی طرف میلان کا تذکرہ کرنے کا مطلب انہیں بدنام کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ سماج کے دوغلے رویئے کو آشکار کرنا مقصود ہے۔ نفسیات دان تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جنسی حوالے سے منہ زور لوگ اور ہم جنسیت پسند عموی طور پر تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔ یہاں میں نے قصداً دوسری اقوام کے مشاہیر کا تذکرہ نہیں کیا۔ اسے میرے تعصب پر محمول نہ کیا جائے تو مناسب ہوگا۔ وجہ اس کی صرف اتنی ہے کہ مجھے اس معاملے میں صرف اپنے سماج کے لوگوں سے غرض ہے جو ان معاملات سے نہ صرف آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں بلکہ اس کے برعکس اپنے اخلاقی

معیاروں کا ڈھنڈورہ پیٹنے سے بھی باز نہیں آتے۔ اس صورت میں لازم ہے کہ ہم دوسروں کی جانب انگشت اٹھانے کی بجائے حقیقت کے غیر جانبدار اور شفاف آئینے میں اپنی صورت دیکھیں کہ اس پہ کہاں کہاں اور کیسے داغ موجود ہیں۔

محرمات کے ساتھ جسمانی تعلق

اگرچہ اکثر واقعات میں یہ تعلق زور اور جبر سے بنتا ہے اور متاثرہ بچہ یا بچی خوف کی وجہ سے زبان نہیں کھولتے مگر محرمانہ جنسی تعلق کے ایسے واقعات بھی کم نہیں جہاں یہ تعلق دوطرفہ مرضی سے استوار ہوا۔ کچھ عرصہ پہلے جیو کے پروگرام 'الجھن سلجھن' میں ایک لڑکی نے اپنے سگے بھائی کے ساتھ اپنے تعلق کی کہانی بیان کی۔ ہاں البتہ اس کا کہنا تھا کہ اگرچہ وہ خود بھی اس تعلق میں شامل تھی مگر اب اسے گنہگار ہونے کا احساس تنگ کرتا ہے۔ لیکن اس کا بھائی اسے بلیک میل کر کے ابھی تک اس سے تعلق بنائے ہوئے ہے۔ آج سے کم و بیش ستر برس پہلے سعادت حسن منٹو نے 'اللہ دتا' کے نام سے ایک کہانی لکھی تھی جس میں باپ بیٹی کے ناجائز تعلق کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ممکن ہے آپ میں سے کئیوں نے یہ کہانی پڑھ رکھی ہو مگر پھر بھی اس کہانی کو یہاں دہرانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اللہ دتا

دو بھائی تھے۔ اللہ رکھا اور اللہ دتا۔ دونوں ریاست پٹیالہ کے باشندے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد البتہ لاہور کے تھے۔ مگر جب ان کا دادا ملازمت کی تلاش میں پٹیالہ آیا

تو وہیں کا ہو رہا۔

اللہ رکھا اور اللہ دتا دونوں سرکاری ملازم تھے۔ ایک چیف سیکرٹری صاحب بہادر کا اردلی تھا۔ دوسرا کنٹرولر آف اسٹورز کے دفتر کا چپڑاسی۔

دونوں بھائی ایک ساتھ رہتے تھے تاکہ خرچ کم ہو۔ بڑی اچھی گزر رہی تھی۔ ایک صرف اللہ رکھا کو جو بڑا تھا، اپنے کے چال چلن کے متعلق شکایت تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ رشوت لیتا تھا اور کبھی کبھار کسی غریب اور نادار عورت کو پھانس بھی لیا کرتا تھا۔ مگر اللہ رکھا نے چشم پوشی سے کام لیا تھا کہ گھر کا امن و سکون درہم برہم نہ ہو۔

دونوں شادی شدہ تھے۔ اللہ رکھا کی دو لڑکیاں تھیں۔ ایک بیاہی جا چکی تھی اور اپنے گھر میں خوش تھی۔ دوسری جس کا نام صغریٰ تھا تیرہ برس کی تھی اور پرائمری سکول میں پڑھتی تھی۔

اللہ دتا کی ایک لڑکی تھی زینب اس کی شادی ہو چکی تھی مگر اپنے گھر میں کوئی اتنی خوش نہیں تھی۔ اس لئے کہ اس کا خاوند اوباش تھا۔ پھر بھی جوں توں نبھائے جا رہی تھی۔

زینب اپنے بھائی طفیل سے تین سال بڑی تھی۔ اس حساب سے طفیل کی عمر اٹھارہ انیس برس کے قریب ہوتی تھی۔ وہ لوہے کے ایک چھوٹے سے کارخانے میں کام سیکھ رہا تھا۔ لڑکا ذہین تھا۔ چنانچہ کام سیکھنے کے دوران بھی پندرہ روپے ماہوار مل جاتے تھے۔

دونوں بھائیوں کی بیویاں بڑی اطاعت شعار، محنتی اور عبادت گزار تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہروں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

زندگی بڑی ہموار تھی کہ ایکا ایکی ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے۔ دونوں بھائیوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے جان و مال او عزت و آبرو پر حملہ ہو گا۔ اور انہیں افراتفری اور کسمپرسی کے عالم میں ریاست پٹیالہ چھوڑنا پڑے گی مگر ایسا ہوا۔

دونوں بھائیوں کو قطعاً معلوم نہیں کہ اس خونیں طوفان میں کون سا درخت گرا، کون سے

درخت سے کون سی ٹہنی ٹوٹی، جب ہوش و ہواس کسی قدر درست ہوئے تو چند حقیقتیں سامنے آئیں اور وہ لرز گئے۔

اللہ رکھا کی لڑکی کا شوہر شہید کر دیا گیا تھا اور اس کی بیوی کو بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا۔

اللہ دتا کی بیوی کو بھی سکھوں نے کرپانوں سے کاٹ ڈالا تھا۔ اس کی لڑکی زینب کا بدچلن شوہر بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

رونا دھونا بیکار تھا۔ صبر شکر کر کے بیٹھ رہے۔ پہلے تو کیمپوں گلتے سڑتے رہے پھر گلی کوچوں میں بھیک مانگا کئے۔ آخر خدا نے سنی، اللہ دتا کو گوجرانوالہ مین ایک چھوٹا سا شکستہ مکان سر چھپانے کو مل گیا۔ طفیل نے دوڑ دھوپ کی تو اسے کام مل گیا۔

اللہ رکھا لاہور ہی میں در بدر پھرتا رہا۔ جوان لڑکی ساتھ تھی۔ گویا ایک پہاڑ کا پہاڑ اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اللہ ہی جانتا کہ اس غریب نے کس طرح ڈیڑھ برس گزارا۔

بیوی اور لڑکی کا غم وہ بالکل بھول چکا تھا۔ قریب تھا کہ وہ کوئی خطرناک قدم اٹھائے کہ اسے ریاست پٹیالہ کے ایک بڑے افسر مل گئے جو اس کے بڑے مہربان تھے۔ اس نے ان کو اپنی حالت زار الف سے لے کر یے تک کہہ سنائی۔ آدمی رحم دل تھا۔ اس کو بڑی دقتوں کے بعد لاہور کے ایک عارضی دفتر میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے دوسرے روز ہی اس کو چالیس روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور چھوٹا سا کوارٹر بھی رہائش کے لئے دلوا دیا۔

اللہ رکھا نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس کی مشکلات دور کیں۔ اب وہ آرام سے سانس لے سکتا تھا اور مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکتا تھا۔ صغریٰ بڑے سلیقے والی سگھڑ لڑکی تھی۔ سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ اِدھر اُدھر سے لکڑیاں چن کے لاتی۔ چولہا سلگاتی اور مٹی کی ہنڈیا میں ہر روز اتنا سالن پکاتی جو دو وقت کے

لئے پورا ہو جائے۔ آٹا گوندھتی، پاس ہی تنور تھا، وہاں جا کر روٹیاں لگوا لیتی۔

تنہائی میں انسان کیا کچھ نہیں سوچتا۔ طرح طرح کے خیالات آتے ہیں۔ صغریٰ عام طور پر دن میں تنہا ہوتی تھی اور اپنی بہن اور ماں کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہتی تھی، پر جب باپ آتا تو وہ اپنی آنکھوں کے سارے آنسو خشک کر لیتی تھی تاکہ اس کے زخم ہرے نہ ہوں۔ لیکن وہ اتنا جانتی تھی کہ اس کا باپ اندر ہی اندر گھلا جا رہا ہے۔ اس کا دل ہر وقت روتا رہتا ہے مگر وہ کسی سے کہتا نہیں۔ صغریٰ سے بھی اس نے کبھی اس کی ماں اور بہن کا ذکر نہیں کیا تھا۔ زندگی افتاں وخیزاں گزر رہی تھی۔

ادھر گوجرانوالہ میں اللہ دتا اپنے بھائی کے مقابلے میں کسی قدر خوش حال تھا، کیونکہ اسے بھی ملازمت مل گئی تھی اور زینب بھی تھوڑا بہت سلائی کا کام کر لیتی تھی۔ مل ملا کے کوئی سو روپے ماہوار ہو جاتے تھے جو تینوں کے لئے بہت کافی تھے۔ مکان چھوٹا تھا، مگر ٹھیک تھا۔ اوپر کی منزل میں طفیل رہتا تھا۔ نچلی منزل میں زینب اور اس کا باپ۔ دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اللہ دتا اسے زیادہ کام نہیں کرنے دیتا تھا۔ چنانچہ منہ اندھیرے اٹھ کر وہ صحن میں جھاڑو دے کر چولہا سلگا دیتا کہ زینب کا کام کچھ ہلکا ہو جائے۔ وقت ملتا تو دو تین گھڑے بھر کر گھڑونجی پر رکھ دیتا تھا۔

زینب نے اپنے شہید خاوند کو کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ خوش تھی۔ اپنے باپ کے ساتھ بہت خوش تھی۔ بعض اوقات اس سے لپٹ جاتی تھی، طفیل کے سامنے بھی، اور اس کو خوب چومتی تھی۔

صغریٰ اپنے باپ سے ایسے چہل نہیں کرتی تھی۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ اس سے پردہ کرتی۔ اس لئے نہیں کہ وہ کوئی نامحرم تھا نہیں، صرف احترام کے لئے۔ اس کے دل سے کئی دفعہ یہ دعا اٹھتی تھی۔ یا پروردگار! میرا باپ میرا جنازہ اٹھائے۔

بعض اوقات کئی دعائیں الٹی ثابت ہوتی ہیں۔ جو خدا کو منظور تھا وہی ہونا تھا۔ غریب

صغریٰ کے سر پر غم واندوہ کا ایک اور پہاڑ ٹوٹا تھا۔

جون کے مہینے دوپہر کو دفتر کے کسی کام جاتے ہوئے تپتی ہوئی سڑک پر اللہ رکھا کو ایسی لو لگی کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگوں نے اٹھایا، ہسپتال پہنچایا مگر دوا دارو نے کوئی کام نہ کیا۔

صغریٰ باپ کی موت کے صدمے سے نیم پاگل ہو گئی۔ اس نے قریب قریب اپنے آدھے بال نوچ لئے ڈالے۔ ہمسایوں نے بہت دم دلاسا دیا۔ مگر یہ کارگر کیسے ہوتا۔ وہ تو ایسی کشتی کی مانند تھی جس کا بادبان ہو نہ کوئی چپوار اور بیچ منجدھار کے آن پھنسی ہو۔

پٹیالہ کے وہ افسر جنہوں نے مرحوم اللہ رکھا کو ملازمت دلوائی تھی، فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے۔ ان کو جب اطلاع ملی تو دوڑے ہوئے آئے۔ سب سے پہلے انہوں نے یہ کام کیا کہ صغریٰ کو موٹر میں بٹھا کر گھر چھوڑ آئے اور اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اسکا خیال رکھے۔ پھر ہسپتال جا کر انہوں نے اللہ رکھا کے غسل وغیرہ کا وہیں انتظام کیا اور دفتر والوں سے کہا کہ وہ اسے دفنا آئیں۔

اللہ دتا کو اپنے بھائی کے انتقال کی خبر بڑی دیر کے بعد ملی۔ بہرحال وہ لاہور آیا اور پوچھتا پوچھتا وہاں پہنچ گیا جہاں صغریٰ تھی۔ اس نے اپنی بھتیجی کو بہت دم دلاسا دیا، بہلایا، سینے سے لگایا، پیار کیا، دنیا کی بے ثباتی کو ذکر کیا، بہادر بننے کو کہا، مگر صغریٰ کے پھٹے ہوئے دل پر ان تمام باتوں کا کیا اثر ہوتا۔ غریب خاموش اپنے آنسو اپنے دوپٹے میں خشک کرتی رہی۔

اللہ دتا نے افسر صاحب سے آخر میں کہا، میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ میری گردن آپ کے احسانوں تلے ہمیشہ جھکی رہے گی۔ مرحوم کی تجہیز و تکفین کا بندوبست آپ نے کیا۔ پھر یہ بچی جو بالکل بے آسرا رہ گئی تھی، اس کو آپ نے اپنے گھر میں جگہ دی۔ خدا

آپ کو اس کا اجر دے۔ اب میں اسے اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں۔ میرے بھائی کی بڑی قیمتی نشانی ہے۔

افسر صاحب نے کہا، ٹھیک ہے، لیکن تم اسے کچھ دیر اور یہاں رہنے دو۔ طبیعت زرا سنبھل جائے تو لے جانا۔

اللہ دتا نے کہا، حضور میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس کی شادی اپنے لڑکے سے کروں گا اور بہت جلد۔

افسر صاحب بہت خوش ہوئے۔ بڑا نیک ارادہ ہے۔ لیکن اس صورت میں جب تم اس کی شادی اپنے لڑکے سے کرنے والے ہو، اس کا اُس گھر میں رہنا مناسب نہیں، تم شادی کا بندوبست کرو، مجھے تاریخ سے مطلع کر دینا۔ خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

بات درست تھی۔ اللہ دتا واپس گجرانوالہ چلا گیا۔ زینت اس کی غیر موجودگی میں بہت اداس ہو گئی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس سے لپٹ گئی اور کہنے لگی کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگائی۔

اللہ دتا نے پیار سے اسے ایک طرف ہٹایا۔ ارے بابا، آنا جانا کیا ہے، قبر پر فاتحہ پڑھنی تھی۔ صغریٰ سے ملنا تھا، اسے یہاں لانا تھا۔

زینب نہ معلوم کیا سوچنے لگی۔ صغریٰ کو یہاں لانا تھا! ایک دم چونک کر، ہاں! صغریٰ کو یہاں لانا تھا۔ پر وہ کہاں ہے؟

وہیں ہے پٹیالے کے ایک بڑے نیک دل افسر ہیں، ان کے پاس ہے۔ انہوں نے کہا جب تم اس کی شادی کا بندوبست کرلو گے تو لے جانا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے بیڑی سلگائی۔

زینب نے بڑی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ اس کی شادی کا بندوبست کر رہے ہو۔ کوئی

لڑکا ہے تمہاری نظر میں؟

اللہ دتا نے زور کا کش لیا۔ ارے بھئی اپنا طفیل۔ میرے بڑے بھائی کی صرف ایک ہی نشانی تو ہے۔ میں اسے کیا غیروں کے حوالے کر دوں گا۔

زینب نے ٹھنڈی سانس بھری، تو تم صغریٰ کی شادی طفیل سے کرو گے؟

اللہ دتا نے جواب دیا۔ ہاں! تمہیں کوئی اعتراض ہے؟

زینب نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا، ہاں! اور تم جانتے ہو، کیوں ہے، یہ شادی ہرگز نہیں ہوگی۔

اللہ دتا مسکرایا۔ زینب کی ٹھوڑی پکڑ کر اس نے اس کا منہ چوما۔ پگلی ہر بات پر شک کرتی ہے۔ اور باتوں کو چھوڑ، آخر میں تمہارا باپ ہوں۔

اللہ دتا اس کے پیچھے گیا اور اس کو پچکارنے لگا۔

دن گزرتے گئے۔ طفیل فرمانبردار لڑکا تھا۔ جب اس کے باپ نے صغریٰ کی بات کی تو فوراً مان گیا۔ آخر تین چار مہینوں کے بعد تاریخ مقرر ہوگئی۔ افسر صاحب نے فوراً صغریٰ کے لئے ایک بہت اچھا سا جوڑا سلوایا جو اسے شادی کے دن پہننا تھا۔ ایک انگوٹھی بھی لے دی۔ پھر اس نے محلے والوں سے اپیل کی کہ وہ یتیم لڑکی کی شادی کے لئے جو بالکل بے سہارا ہے، حسب توفیق کچھ دیں۔

صغریٰ کو قریب قریب سبھی جانتے تھے اور اس کے حالات سے واقف تھے، چنانچہ انہوں نے مل ملا کر اس کے لئے بڑا اچھا جہیز تیار کر دیا۔

صغریٰ جب دلہن بنی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے تمام دکھ جمع ہو گئے ہیں اور اس کو پیس رہے ہیں۔ بہر حال وہ اپنے سسرال پہنچی جہاں اس کا استقبال زینب نے کیا۔ کچھ اس طرح کہ صغریٰ کو اسی وقت معلوم ہو گیا کہ وہ اس کے ساتھ بہنوں کا سا سلوک نہیں کرے گی بلکہ ساس کی طرح پیش آئے گی۔

صغریٰ کا اندیشہ درست تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مہندی ابھی اچھی طرح اترنے بھی نہیں پائی تھی کہ اس سے نوکروں کے کام لینے شروع کر دیئے۔ جھاڑو دیتی، برتن مانجھتی، چولہا وہ جھونکتی، پانی وہ بھرتی، یہ سب کام وہ بڑی پھرتی اور بڑے سلیقے سے کرتی لیکن پھر بھی زینب خوش نہ ہوتی۔ بات بات پر اس کو ڈانٹتی ڈپٹتی، جھڑکتی رہتی۔

صغریٰ نے دل میں تہیہ کر لیا تھا، وہ سب کچھ برداشت کرے گی اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے گی۔ کیونکہ اگر اسے یہاں سے دھکا مل گیا تو اس کے لئے اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

اللہ دتا کا سلوک البتہ برا نہیں تھا۔ زینب کی نظر بچا کر کبھی کبھی وہ اس کو پیار کر لیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ کچھ فکر نہ کرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

صغریٰ کو اس سے ڈھارس ہوتی۔ زینب جب کبھی اپنی کسی سہیلی کے ہاں جاتی اور اللہ دتا اتفاق سے گھر پر ہوتا تو اس سے دل کھل کر پیار کرتا۔ اسے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔ کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کے واسطے اس نے جو چیزیں چھپا کر رکھی ہوتی تھیں، دیتا اور سینے سے لگا کر اس سے کہتا، صغریٰ تم بڑی پیاری ہو۔

صغریٰ جھینپ جاتی۔ دراصل وہ اتنے پر جوش پیار کی عادی نہیں تھی۔ اس کا مرحوم باپ اگر کبھی اسے پیار کرنا چاہتا تو صرف اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا کرتا تھا یا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا دیا کرتا تھا خدا میری بچی کے نصیب اچھے کرے۔

صغریٰ طفیل سے بہت خوش تھی۔ وہ بڑا اچھا خاوند تھا۔ جو کماتا اس کے حوالے کر دیتا مگر صغریٰ زینب کو دے دیتی۔ اس لئے کہ وہ اس کے قہر و غضب سے ڈرتی تھی۔

طفیل سے صغریٰ نے زینب کی بدسلوکی اور اس کے ساس جیسے برتاؤ کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ صلح کل تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس باعث گھر میں کسی قسم کی بدمزگی پیدا ہو۔ اور بھی کئی باتیں تھیں جو وہ طفیل سے کہنا چاہتی تو کہہ دیتی مگر اسے ڈر تھا کہ طوفان برپا ہو

جائے گا۔اور تو اس میں سے بچ کر نکل جائیں گے مگر وہ اکیلی اس میں پھنس جائے گی، اور اس کی تاب نہ لاسکے گی۔

یہ خاص باتیں اسے چندروز ہوئے معلوم ہوئی تھیں اور وہ کانپ کانپ گئی تھی۔ اب اللہ دتا اسے پیار کرنا چاہتا تو وہ الگ ہٹ جاتی یا دوڑ کر اوپر چلی جاتی جہاں وہ اور طفیل رہتے تھے۔

طفیل کو جمعہ کو چھٹی ہوتی تھی۔ اللہ دتا کو اتوار کو۔ زینب کہیں باہر گئی ہوتی تو وہ جلدی جلدی کام کاج ختم کر کے اوپر چلی جاتی۔ اگر اتفاق سے اتوار کو زینب کہیں باہر گئی ہوتی تو صغریٰ کی جان پر بنی رہتی۔ ڈر کے مارے اس سے کام نہ ہوتا۔ لیکن زینب کا خیال آتا تو اسے مجبوراً کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل سے طوعاو کرہاً سب کچھ کرنا پڑتا۔

اگر وہ کھانا وقت پر نہ پکائے تو اس کا خاوند بھوکا رہے کیونکہ وہ ٹھیک بارہ بجے اپنا شاگرد روٹی کے لئے بھیج دیتا تھا۔

ایک دن اتوار کو جب کہ زینب گھر پر نہیں تھی، اور وہ آٹا گوندھ رہی تھی، اللہ دتا پیچھے سے دبے پاؤں آیا اور کھلنڈرے انداز میں اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ وہ تڑپ اٹھی، مگر اللہ دتا نے اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

صغریٰ نے چیخنا شروع کر دیا مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ اللہ دتا نے کہا، شور مت مچاؤ۔ یہ سب بے فائدہ ہے، چلو آؤ۔

وہ چاہتا تھا کہ صغریٰ کو اٹھا کر اندر لے جائے۔ کمزور تھی مگر خدا جانے اس میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ اللہ دتا کی گرفت سے نکل گئی اور ہانپتی کانپتی اوپر پہنچ گئی، کمرے میں داخل ہو کر اس نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد زینب آگئی۔ اللہ دتا کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ اندر کمرے میں لیٹ کر اس نے زینب کو پکارا۔ وہ آئی تو اس سے کہا، ادھر آؤ، میری ٹانگیں دباؤ۔ زینب

اچک کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی ٹانگیں دبانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں کے سانس تیز تیز چلنے لگے۔

زینب نے اللہ دتا سے پوچھا۔ کیا بات ہے؟ آج تم اپنے آپ میں نہیں ہو۔

اللہ دتا نے سوچا زینب سے چھپانا فضول ہے چنانچہ اس نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ زینب آگ بگولا ہو گئی۔ کیا ایک کافی نہیں تھی؟ تمہیں تو شرم نہ آئی، پر اب تو آنی چاہیے تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہو گا، اسی لئے میں شادی کے خلاف تھی۔ اب سن لو کہ صغریٰ اس گھر میں نہیں رہے گی۔

اللہ دتا نے بڑے سکین لہجے میں پوچھا، کیوں؟

زینب نے کھلے طور پر کہا، میں اس گھر میں اپنی سوت دیکھنا نہیں چاہتی۔

اللہ دتا کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کے منہ سے کوئی بات نکل نہ سکی۔

زینب باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ صغریٰ صحن میں جھاڑو دے رہی ہے۔ چاہتی تھی کہ اس سے کچھ کہے مگر خاموش رہی۔

اس واقعے کو دو مہینے گزر گئے۔ صغریٰ نے محسوس کیا کہ طفیل اس سے کھچا کھچا رہتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ آخر ایک دن آیا کہ اس نے طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں دیا اور گھر سے نکال دیا۔

یہ کہانی ایک آئینہ ہے جس میں ہمارے سماج کا حقیقی چہرہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ ہمارے انکار سے یہ چہرہ بدل نہیں جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ پرنالے کی جگہ بدلی جائے یا اسے وہیں بہنے دیا جائے۔ یہ تو خیر ایک افسانہ تھا، میرے علم میں کئی ایسی لڑکیاں اور خواتین ہیں جن کی عصمت کو ان کے قریبی عزیزوں نے پامال کیا اور وہ نفسیاتی مریض بن گئیں۔ اس کے علاوہ بہت سے واقعات احباب کی مدد سے معلوم ہوئے۔ اگر کوئی ایسے واقعات کے ہونے سے انکار کرنا چاہتا ہے تو لاکھ کرے مگر یاد رکھئے انکار کرنے سے خطرہ ٹلے گا نہیں بلکہ اور بڑھ جائے گا۔

ایسے واقعات کے لڑکیوں اور لڑکوں پر مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لڑکیاں مردذات سے شدید نفرت کرنے لگتی ہیں اور شادی کا تصور ان کے لیے سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ جبکہ لڑکے اپنے وجود سے نفرت کرتے کرتے خود کو مفعولیت کے جہنم میں جھونک دیتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ یہی جہنم ان کے لیے لطف کا ذریعہ بن جاتا ہے جس کے حصول کی خاطر وہ کسی بھی طرح کی بے عزتی برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

بہت عرصہ پہلے مجھے ایک قریبی دوست نے واقعہ سنایا جس کے مطابق ایک نوجوان نے سٹیشن سے ان کا پیچھا کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ دوست کا گھر بالکل قریب آ گیا۔ سارا رستہ نوجوان کی ایک ہی درخواست تھی کہ میرا دوست کسی بھی قیمت پر اس کی مفعولیت کی خواہش کو پورا کر دے۔ جب میرے دوست نے اسے زیادہ ہی برے طریقے سے دھتکارا تو وہ اس کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگا۔ میرے دوست نے اسے دو تین تھپڑ رسید کر کے جان چھڑائی اور تیزی سے گھر کی راہ لی۔

یہ محض ایک نہیں بلکہ اس طرح کے ان گنت واقعات ہیں جن سے خود اس کتاب کے قارئین کو بھی واسطہ پڑا ہو گا۔ ایسے بہت سے بچے ہیں جو بچپن میں ہونے والی زیادتی کے نتیجے میں خواجہ سراؤں کی ٹولیوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور جسم فروشی کو باقاعدہ پیشہ بنا لیتے ہیں۔ ہم ایسے معاملات پر محض ایک اخلاقی فتویٰ لگا کر اپنے روزمرہ کاموں میں جُت جاتے ہیں، مگر ان کے محرکات پہ کبھی غور نہیں کرتے۔ حد تو یہ ہے کہ اگر خود ہماری اپنی اولاد کے ساتھ بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آ جائے تو ہم مجرم سے نفرت کرنے اور اسے سزا دلوانے سے آگے کچھ نہیں سوچتے۔

خطرہ باہر نہیں اندر ہے

جنسی زیادتی کے حوالے سے ہمارے ہاں عام خیال یہ ہے کہ گھر سے باہر کی دنیا ہمارے بچوں کے لیے زیادہ خطرناک ہے۔ جی باہر کی دنیا خطرناک ضرور ہے مگر اس سے کہیں زیادہ خطرہ گھر کی محفوظ چاردیواری کے اندر ہے جہاں ایسے لوگ رہتے ہیں جن پر ہم بھولے سے بھی شک نہیں کرتے۔ معاف کیجیے وہ شخص بچے کا چچا یا ماموں بھی ہو سکتا ہے اور دادا یا نانا بھی۔ لڑکیوں کا معاملہ تو اس سے

زیادہ الارمنگ ہے کہ اس صورت میں باپ اور بھائی بھی قابلِ اعتبار نہیں۔ یہ ایک بے حد تکلیف دہ اور شرم ناک بات ہے مگر کیا کیا جائے کہ ہماری سوسائٹی میں یہ سب ہو رہا ہے سو اس کو تسلیم کرنے سے مفر نہیں۔ ٹی وی چینلز پر ایسے کئی کیس سامنے لائے جا چکے ہیں۔ میری ایک لیڈی ڈاکٹر دوست جو لاہور کے ایک معروف ہسپتال کے گائنا کالوجی ڈیپارٹمنٹ سے منسلک ہیں، نے بتایا کہ ان کے ہاں ابارشن کے لیے جو غیر شادی بچیاں لائی جاتی ہیں وہ اکثر اپنے قریب ترین رشتہ داروں کا شکار بنی ہوتی ہیں جن میں چچا، ماموں، والد یا بھائی کا نام آتا ہے۔ ماؤں کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ یہ راز آشکار نہ ہو۔ وہ نہیں چاہتیں کہ ڈاکٹر بچی سے حقائق معلوم کر سکے سو وہ ابارشن کے فوراً بعد اسے گھر لے جانے پر اصرار کرتی ہیں۔

میں نے حال ہی میں مردانگی کے موضوع پر ہونے والے مختصر اکٹھ کے ایک مذاکرے میں شرکت کی، جس میں معزز خاندانوں سے تعلق رکھنے والے تین انتہائی پڑھے لکھے نوجوانوں نے یہ اعتراف کیا کہ انہیں چھ اور آٹھ برس کی عمر میں ریپ کیا گیا تھا۔ مذاکرے میں موجود باقی نوجوان خاموش رہے، سو میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے کتنے ایسے تھے جو اس اندوہناک تجربے سے محفوظ رہے تھے۔ ممکن ہے سبھی کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ جڑا ہو مگر ان میں اعتراف کی جرأت نہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ جو لوگ معصوم بچوں کے ساتھ ریپ جیسا گھناؤنا جرم کرتے ہیں، کیا وہ پیدائشی ایسے ہوتے ہیں۔ کیا ہم صرف ان سے نفرت کا اظہار کر کے یا ان کو بھیانک قسم کی سزائیں دلوا کر اس جرم کا خاتمہ کر سکتے ہیں؟ کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم اس جرم کے محرکات پر غور کریں؟ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم صرف واقعات کو زیرِ بحث لانے میں حد سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں جبکہ ان کے محرکات پر سنجیدہ غور و فکر سے مجرمانہ حد تک غفلت برتتے ہیں۔ ابھی ماضی قریب میں جو قصور کے ایک نواحی علاقے میں بچوں کے ساتھ منظم ریپ کا جو بھیانک سکینڈل سامنے آیا، اس پر سوسائٹی سے لے کر میڈیا تک، سب نے خوب گرد اڑائی مگر مجال ہے جو حکومت یا دانشوروں کے کسی گروہ نے ایسے واقعات کے سماجی اور معاشی محرکات جاننے کی کوشش کی ہو۔ بلکہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد یوں لگا جیسے رات گئی بات گئی۔

بچوں کو کیسے بچایا جائے؟

آپ ایک کام کریں۔ ایک سادہ کاغذ لیں اور اس کے درمیان لائن لگا کر دو کالم بنالیں۔ اب اپنے ذہن میں مردانہ اور زنانہ جنسی اعضا کا تصور لائیں (برائے مہربانی اس دوران اپنا ذہن بھٹکنے مت دیں) اور دائیں جانب والے کالم میں ان اعضا کے وہ نام لکھنا شروع کر دیں جو آپ سمجھتے ہیں کہ ان کا لکھنا یا بولنا خلاف تہذیب نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے بمشکل گنتی کے تین یا چار نام ہی لکھے ہوں گے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ نام بھی ایسے نہیں ہوں گے جنہیں کبھی آپ نے روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرنے کی جرأت کی ہو۔ اچھا اب یوں کریں کہ بائیں جانب کے کالم میں انہی اعضا کے وہ نام لکھیے جن کا استعمال گلی محلے کی لڑائیوں اور بے تکلف دوستوں کی محفلوں میں عام ہوتا ہے۔ میری مراد ان گالیوں سے ہے جن میں ان اعضا کا تذکرہ پورے جوش وخروش کے ساتھ ہوتا ہے اور شریف سے شریف انسان کی سماعت بھی ان سے محروم نہیں رہتی۔ سچ پوچھیے تو ہم ازدواجی تعلقات کا ابتدائی علم انہی گالیوں سے حاصل کرتے ہیں۔۔۔۔ جی تو دیکھیں دوسرے کالم کی صورت کیا بنی! ارے واہ آپ نے تو کمال کر دیا۔ پورا کالم بھر دیا اور دل میں ابھی حسرت باقی ہے کہ کاش دو چار نام اور بھی یاد آ جاتے۔ بس اب قلم ہاتھ سے رکھ دیجئے۔ ہمیں اس ایکسرسائز سے کچھ اہم نتائج اخذ کرنے ہیں۔

آپ نے غور کیا کہ جب آپ جنسی اعضاء کے وہ نام لکھنے لگے جنہیں آپ مہذب کہہ سکیں تو آپ کا ذہن جیسے خالی ہو گیا ہو۔ بہت سوچنے کے بعد آپکا قلم رک رک کے چلا تو آپ نے لکھا، عضوِ تناسل، شرمگاہ، اندام نہانی، پستان، چھاتیاں وغیرہ وغیرہ۔ یعنی گنتی کے کل پانچ الفاظ اور وہ بھی ایسے کہ جن کا اپنی گفتگو یا تحریر میں آپ نے شائد ہی کبھی استعمال کیا ہو۔ کیونکہ آپ ان نام نہاد مہذب الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے بھی سخت شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ جبکہ اس کے مقابل جب آپ دوسرا کالم بھرنے لگے تو آپ کا قلم بگٹٹ دوڑنے لگا۔ آپ کو گندے الفاظ لکھتے ہوئے دماغ پر زیادہ زور نہیں دینا پڑا۔ ممکن ہے آپ کو گالی دینے کی بالکل عادت نہ ہو مگر ہم میں سے کون ایسا ہوگا جسے چلتے پھرتے یا دفاتر اور کام کی دوسری جگہوں پر روائتی اور نت نئی گالیاں اور وہ بھی وافر مقدار اور بلند آواز میں سننے کا

اتفاق نہیں ہوتا۔ سو آپ نے ذہن پہ تھوڑا سا زور ڈالا اور الفاظ کی لائن لگ گئی۔

تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے تئیں جو زبان مہذب ہے، وہ جنس اور جنسی اعضاء کے تذکرے کے حوالے سے بانجھ ہے۔ سچ کہیے کیا یہ زبان اس قابل ہے کہ ہم اپنے بچے کو جنسی درندوں سے بچاؤ کے لیے کچھ سمجھا سکیں؟ ہم نے زبان کی اس معذوری اور اپنی جہالت کو شرم وحیا کا نام دے رکھا ہے اور نہیں جانتے کہ یہ نام نہاد شرم وحیا ہمارے بچوں زندگی کے لیے کتنے بڑے خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔ اگر ہمیں اپنی اولاد عزیز ہے تو پھر ہمیں انہیں جنسی حملے کے خطرات سے بچنے کی تربیت دینا ہوگی۔ ہمیں اپنے بچوں سے دوستی کرنا ہوگی تا کہ وہ بلا تجھجک اپنے ساتھ ہونے والا ہر اچھا برا معاملہ اعتماد کے ساتھ ہمیں بتا سکے۔ جب بچہ بولنے کے قابل ہو جائے تو ہمیں اسے یہ سکھانا ہوگا کہ اس کے بدن کے کون سے حصے انتہائی پرائیویٹ ہیں جنہیں والدین اور ڈاکٹر کے علاوہ کسی اور کو چھونے کی اجازت نہیں۔ اگر کوئی اور ان حصوں کو چھوئے یا اسے کسی کا چھونا یا چومنا برا لگے تو وہ فوراً گھر والوں کو بتائے تا کہ متعلقہ فرد سے محتاط رہا جا سکے۔ یہ تربیت بچے کو اعتماد بخشے گی اور اسے اپنے ساتھ ہونے والی کسی بھی ناپسندیدہ حرکت کی شکائت کرتے وقت کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اور یوں والدین اپنے بچوں کو بدکردار افراد سے بآسانی محفوظ رکھ سکیں گے۔

لب لباب

کوئی بھی معاشرہ اخلاقیات کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اخلاقیات کے نتیجہ خیز نفاذ کے لیے لازم ہے کہ خیر اور شر یا نیکی اور بدی کے معیاروں کو ماضی کے تجربات اور موجودہ علم کی مدد سے ڈیفائن کیا جائے۔ اخلاقیات کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں کہ معاشرے پر ایسے ضابطے نافذ کر دیے جائیں جو انسانی جبلتوں کو شر کا منبع مان کر ڈیزائن کیے گئے ہوں۔ شعور کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اخلاقی ضابطوں کا وظیفہ جبلتوں کا راستہ روکنا نہیں بلکہ ان کے بہاؤ کے لیے ہموار راستہ فراہم کرنا ہے۔ جبلتیں تو محض ایک خام اور نیوٹرل طاقت ہیں جن پر جبری پابندیاں انہیں گھٹن کا شکار بنا کر تخریبی قوت میں بدل سکتی ہیں، جس سے فرد، خاندان اور معاشرہ تینوں تباہ ہو سکتے ہیں۔ غور کریں تو ہمارا معاشرہ مغرب کے مقابلے میں اپنے اخلاقی نظام کے بارے میں رطب اللسان ہونے کے باوجود تیز رفتاری سے شکست و ریخت کا شکار ہو رہا ہے اور بہتری کی کوئی امید دور دور تک دکھائی نہیں دے رہی۔

ہمارا اجتماعی رہن سہن تین قسم کے عناصر کے زیر اثر ہے۔ ہماری خاندانی روایات، انڈین اور یورپین کلچر اور ہمارے روائتی مذہبی علماء۔ یہ تینوں عناصر ایک ملغوبے کی حیثیت سے ہمارے انداز فکر اور عمل میں شامل ہیں۔ ہمارے ہاں تجزیاتی دانش کا شدید فقدان ہے جس کی بنا پر ہمارا رویہ یہ ہے کہ ہم ان تینوں عناصر کے بارے میں مخالفانہ بیانات دینے کے باوجود بھی انہیں لاشعوری طور پر قبول کیے ہوئے

میں شامل ہیں۔ ہمارے ہاں تجزیاتی دانش کا شدید فقدان ہے جس کی بنا پر ہمارا رویہ یہ ہے کہ ہم ان تینوں عناصر کے بارے میں مخالفانہ بیانات دینے کے باوجود بھی انہیں لاشعوری طور پر قبول کیے ہوئے ہیں۔ ہم صرف عبادات اور چند رسوم کی ادائیگی کی حد تک مذہبی ہیں۔ اور یہ ایسے اعمال ہیں جن کا ہماری زندگی کے عملی معاملات سے تعلق نہ ہونے کے برابر ہے اور اگر کوئی تعلق ہے بھی تو وہ عمومی طور پر منافقت کو فروغ دینے والا ہے۔ عوام کی نفسیات کو اپنی گرفت رکھنے والے مذہبی گروہوں اور ان کے پالنہار حکمرانوں کی پوری کوشش ہے کہ عوام کو کنفیوز رکھا جائے اور اگر کہیں سے کوئی تجزیاتی رائے کا اظہار بھی ہو تو اسے "غیر اسلامی" کا شور مچا کر پسپائی پر مجبور کر دیا جائے۔

جنسی جذبہ ایک منہ زور طاقت ہے جس نے حضرتِ انسان کو ہبوطِ آدم سے لمحۂ موجود تک امتحان میں ڈال رکھا ہے اور خصوصاً مشرقی سماج کے دانشور اس جن کو قابو کرنے کے حوالے سے شدید ناکامی اور پریشانی کا شکار ہیں۔ عوام کے اندر اثر رکھنے والے مذہبی حلقوں کے لیے معاشی کرپشن اور سماجی بدانتظامی اتنا اہم معاملہ نہیں جتنا کہ نام نہاد عریانی اور فحاشی۔ ان کے تئیں اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری عورت پر عائد ہوتی ہے جو کہ مرد کی جنسی جبلت کو انگیخت کرنے کا باعث بنتی ہے۔ سو اُن کا سارا زور اس بات پر ہے کہ ملکی آبادی کے اکیاون فیصد حصے کو بزور گھروں میں بند کر دیا جائے۔ لڑکیوں کو ممکنہ حد تک تعلیم سے دور رکھا جائے اور بلوغت کی حد پار کرتے ہی ان کی شادی کر دی جائے تاکہ انہیں سسرال والے باآسانی اپنی سہولت کے مطابق ڈھال سکیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کی صورت میں بچیاں لامحالہ گھر سے باہر نکلیں گی جس سے نہ صرف وہ معاشرے میں بے راہروی کو بڑھاوا دیں گی بلکہ کل کلاں جاب کرنے کی صورت میں مرد کی برابری بھی کرنے لگیں گی اور یوں ان کی تفہیم کے مطابق مذہب کا بتایا ہوا آئیڈیل خاندانی نظام برباد ہو کر رہ جائے گا۔ ان کے نزدیک اس آئیڈیل خاندانی نظام کو بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ عورت کو علم، تعلیم اور جدید معلومات سے ممکنہ حد تک دور رکھا جائے تاکہ اسے اپنے وجود کی اہمیت اور صلاحیتوں کا ادراک نہ ہو پائے۔ وہ عورت کو گھر کی بے تنخواہ خادمہ سے زیادہ کچھ نہیں جانتے جو ان کی مذہبی تفہیم کے مطابق جملہ کاموں

کے علاوہ شوہر کو اپنی مرضی کے خلاف جنسی آسودگی فراہم کرنے کی بھی پابند ہے۔ مرد اس کا مجازی خدا ہے جس کا حکم اسے بے چون وچرا تسلیم کرنا ہے۔

لیکن حالات کا مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ یہ جسے ہم اپنا آئیڈیل خاندانی نظام بتاتے ہیں یہ ملمع کاری سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ شائد ہی کوئی بہو ہو جو اپنے سسرال کے ساتھ رہنا چاہتی ہو اور شائد ہی کوئی ساس ہو جو بہو کو اپنا گھر بنانے کی اجازت دینے کے لیے تیار ہو۔ جائز اور ناجائز مفادات کی ایک نامختتم جنگ ہے جو کسی گھر میں کھلی اور کہیں سرد انداز میں لڑی جارہی ہے۔ سارا گھرانہ چومکھی لڑائی کی لپیٹ میں ہے اور ہر فرد نت نئے نفسیاتی الجھاوے سہیڑ رہا ہے مگر ہمارے مذہبی دانشور ہر جگہ سٹیریو ٹائپ راگ الاپ رہے ہیں کہ مغرب ہمارے آئیڈیل خاندانی نظام کو برباد کرنے پہ تُلا ہے۔ بھلا جو نظام خود اپنے اندرونی تضادات کی وجہ سے شکست خوردگی کا شکار ہو اسے کسی دشمن کو تباہ کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔

ہمارے ہاں بظاہر سارا خاندان ایک چھت تلے مشترکہ زندگی گزارتا ضرور دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد نے گھر میں اپنا ایک الگ خانہ بنا رکھا ہے جس میں وہ کسی دوسرے اہلِ خانہ کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایسا کرنے کی کوشش کرے تو آپسی دوری اور ناپسندیدگی مزید بڑھ جاتی ہے۔ گھر کا شائد ہی کوئی مرد ہو جو کام سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا گھر آنے کا خواہشمند ہو۔ اکثر حضرات دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیوی کے لیے شوہر کے دوست اکثر سوتن جیسے رشتے میں بدل جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسے گھر کا نقشہ ہے جہاں کم و بیش ہر فرد اپنی آزادی اور خوشیوں کو تیاگ کر اکٹھا رہنے پر مجبور ہے اور حیات اس کے عذاب بن چکی ہے۔ گھر کا یہ ماحول شادی شدہ جوڑوں کی ازدواجی ہم آہنگی کو کھا جاتا ہے اور ان کے بعد سب سے زیادہ اثر ان کی اولاد پر پڑتا ہے اور یوں وہ اپنی آنے والی نسلوں کے عمدہ انسان بننے کے امکانات کو بہت حد تک معدوم کر دیتے ہیں۔

جبلتیں انسانی وجود کا اٹوٹ انگ ہیں جنہیں کنٹرول تو کیا جا سکتا ہے مگر فرد کے وجود سے منہا نہیں کیا جا

سکتا۔ انسان کا جبلتوں کے طابع ہو کر جینا سماج کو تباہ کر سکتا ہے مگر ان پر ناجائز پابندیاں بھی ایسی مصنوعی اور جابرانہ تہذیب کو جنم دینے کا باعث بنتی ہیں جو انسان کی مسرت اور صلاحیتوں کے پھلنے پھولنے کے امکانات کا راستہ بند کر دیتی ہیں۔ جبلتیں وہ جن ہیں جن کی سیرابی اور آسودگی معاشرے کو امن، آسودگی اور خوشی کا گہوارہ بنا سکتی ہے مگر محدود سوچ کے حامل افراد اس جن کی طاقت سے خوف زدہ ہو کر ایسے اخلاقی ضابطے اختراع کرنے میں لگے رہے جن سے اس جن کو بوتل میں بند کیا جا سکے۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ ایسا کرنے میں نہ صرف ناکام رہے بلکہ المیہ یہ ہوا کہ انہوں نے اس جن سے تعمیری کام لینے کی بجائے اسے تخریبی بنا دیا۔ غور کریں تو ہمارا حالیہ سماج اس کی واضح مثال ہے۔

ہم نے انسانی جبلتوں کے اظہار کو دبانے کے لیے جہاں جہاں بے دلیل اخلاقی ضابطوں کے بھاری ڈھکن رکھے، وہاں وہاں تخریب اور بدکرداری کے گٹر اُبل پڑے۔ جب یہ ضابطے ناکارہ ثابت ہوئے تو اس ناکامی کا تجزیہ کرنے کی بجائے یہ بیان تواتر سے دہرایا جانے لگا کہ جناب یہ سب مذہب سے دوری کا نتیجہ ہے (جبکہ ہمارے ہاں مذہب پسندی وبا کی صورت پھیلی دکھائی دیتی ہے)۔ اگر کوئی پوچھ لے کہ محترم مذہب سے دوری کی کیا وجوہات ہیں تو جھٹ سے گھڑا گھڑایا جواب حاضر کہ یہ سب یہود و ہنود اور نصاریٰ کی سازش ہے۔ اس سازش کی تشریح مانگو تو بتایا جاتا ہے کہ وہ ہم پر اپنا کلچر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ ہماری مشرقی اقدار کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر بھارت تو ہماری اقدار کو تباہ کرنے پر تلا بیٹھا ہے اور وہ بھی اپنی فلموں کے ذریعے۔ اور ہمارے شادی بیاہ میں ہندوانہ رسوم داخل ہوتی جا رہی ہیں۔

یہ سراسر ایک ناقص بلکہ بددیانتی پر مبنی الزام ہے۔ تقسیم سے پہلے صرف ہندوستانی فلم انڈسٹری ہوا کرتی تھی۔ تقسیم کے بعد جو پاکستانی انڈسٹری وجود میں آئی، چند موضوعات کے علاوہ اس نے بھی ویسی ہی فلمیں بنائیں جیسی بھارتی فلم ساز بنا رہے تھے۔ سن پینسٹھ کی جنگ سے پہلے ان کی فلمیں ہمارے سینما گھروں میں عام لگتی تھیں مگر تب تک ہمارے کلچر کو ان کی فلموں سے خطرے کا کوئی الارم نہیں بجایا جاتا تھا۔ اس کے بعد بندش کا ایک طویل دور آیا۔ اس دوران ہماری فلم انڈسٹری معقول انداز میں پھلتی

پھولتی رہی مگر فلمیں چاہے اردو تھیں یا پنجابی، ان میں پیش کیا جانے والا کلچر ہمیشہ سوالوں کی زد میں رہا۔ نہ تو کھیتوں میں ناچنے والی پنجابی فلموں کی ہیروئن ہمارے کلچر کی عکاس تھی اور نہ اردو فلموں میں پیش کیے جانے والے شیروانی میں ملبوس لکھنوی نواب، ابا حضور قسم کے کردار اور مستعلیق طوائفیں ہماری ثقافت کی نمائندہ تھیں۔ ستر کی دھائی کے آدھ بیچ سے دوردرشن کی مدد سے ایک بار پھر سے بھارتی فلمیں دکھنی شروع ہوئیں تو ان کے لیے ہمارے عوام کی بھوک ایک دم بھڑک اٹھی۔ گویا عوام کو ان کی فلموں سے اپنے کلچر کی تباہی کا کوئی خوف نہیں تھا۔ ضیاء الحق کے زمانے میں تو یہ فلمیں وی سی آر کی مدد سے ہر گھر میں جا پہنچیں۔ بس اس دوران اتنا ہوا کہ بھارتی فلموں کے مقابلے کی دعویدار ہماری فلم انڈسٹری بے معنی موضوعات اور فحش منظر نگاری کی راہ پر چل کر خودکشی کر بیٹھی۔ طویل عرصہ تک ایک گنڈاسہ اور پھر کلاشنکوف بردار ولن نما ہیرو کی مدد سے نمبر دو کمائی کرنے والوں نے فلم انڈسٹری کو یرغمال بنائے رکھا۔ فلم کے ذریعے پاکستانی کلچر کی تنزلی میں جو کسر باقی رہ گئی تھی اسے ولگر سٹیج ڈراموں نے پورا کر دیا۔ اس کے مقابلے میں ہندوستانی فلم نے کمرشل اور متوازی سینما کے میدان میں وقت کی رفتار سے اپنا سفر جاری رکھا اور اس کی فلمیں آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد ہوتی رہیں۔ ہمارا المیہ یہ رہا کہ ہم نے اپنی حقیقی قومی ثقافتوں کو اسلام اور وطن دشمنی سے تعبیر کر کے مصنوعی طور پر ایک نام نہاد پاکستانی کلچر پیدا کرنے کی کوشش کی جس کی حالت ایک ایسے بدخلقت بچے جیسی تھی جسے کوئی بھی اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ سو ایسے میں عوام کی نفسیات کا بھارت کے رنگوں اور گلیمر سے بھرپور کلچر کو قبول کرنا عین فطری تھا۔

یہاں ایک اور سوال بھی اٹھتا ہے کہ جو اقوام، خصوصاً مغربی اقوام ہمیں اپنے رنگ میں رنگنا چاہتی ہیں کیا ان کے معاشرے قانون اور اخلاقی اقدار سے یکسر خالی ہیں؟ کیا ان کا نظامِ معاشرت انسان کش ہے؟ کیا ان کے ہاں جنگل کا قانون رائج ہے؟ کیا وہاں انصاف کی بولی لگتی ہے؟ کیا وہاں لوگ سال ہا سال کورٹ کچہریوں میں دھکے کھاتے ہیں؟ کیا وہاں لوگ تعلیم اور علاج سے محروم رہتے ہیں؟ کیا وہاں ہوٹلوں اور ورکشاپوں پر ایسے 'چھوٹے' پائے جاتے ہیں جنہیں خود ان کے ہی مالکان اپنی

جنسی ہوس کا نشانہ بھی بناتے ہیں؟ کیا وہاں ایسے جنسی درندوں کی بہتات ہے جو تین تین برس کے بچوں اور بچیوں کو اپنی ہوس کا شکار بنانے کے بعد بے دردی سے قتل کر دیتے ہوں؟ کیا وہاں معصوم گھریلو ملازم بچیوں کو گرم استریوں سے داغا جاتا ہے؟ کیا وہاں عورتیں گھر سے نکلتے ہوئے خوف کھاتی ہیں؟ کیا وہاں شادی کے لئے مذہب، فرقہ، ذات برادری اور رنگ نسل کی کوئی شرط عائد کی جاتی ہے؟ کیا وہاں اولاد کو ان کی مرضی کے بغیر زبردستی بیاہنے کا رواج ہے؟ کیا وہاں لڑکیاں جہیز بناتے بناتے بوڑھی ہو جاتی ہیں؟ کیا وہاں بیٹا پیدا ہونے کی امید میں سات سات بیٹیاں پیدا کی جاتی ہیں؟ کیا وہاں بیٹا پیدا نہ کرنے کے 'جرم' میں عورت کو طلاق دے دی جاتی ہے؟ کیا وہاں طلاق یافتہ بیوی کے ساتھ دوبارہ نکاح کے لیے اسے کسی اور مرد کے ساتھ حلالہ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے؟ کیا وہاں مرضی کی شادی کرنے پر جوڑے کو قتل کر دیا جاتا ہے؟ کیا وہاں عام گلی محلوں میں رہ کر جسم بیچنے کا دھندہ کرنا ممکن ہے؟ کیا وہاں سرکاری دفاتر میں کام چوری کا امکان ہے؟ کیا وہاں کی پولیس پرامن شہریوں کے لیے خوف کی علامت ہے؟ کیا وہاں بچوں کی ویکسی نیشن اور پولیو کے قطرے پلانے والوں کو گولی ماردی جاتی ہے؟ کیا وہاں ہسپتالوں سے نومولود بچوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے؟ کیا وہاں قدرتی آفات میں پھنسی عورتوں کے کانوں سے زیور نوچ لیے جاتے ہیں؟ سونے کی چوڑیوں کے حصول کے لیے بازو کاٹ لیے جاتے ہیں؟ کیا آفت زدہ علاقوں سے بچوں اور لڑکیوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے؟ کیا وہاں لڑکیوں کے سکولوں کو جلا دیا جاتا ہے؟ نہیں وہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ اگر کہیں کچھ ہوتا بھی ہے تو قانون فوراً حرکت میں آ جاتا ہے۔

یہ ہماری ناکامی اور بدقسمتی ہے کہ ان معاشروں پر کوئی بھی ایسا گھناؤنا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے عقل اور تجربے کو اپنا رہنما مان لیا ہے۔ وہ اپنے عوام کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر ہمہ وقت اپنے قوانین میں مثبت تبدیلیوں کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان کے ہاں کوئی ایسے مذہبی گروہ نہیں پائے جاتے جو بلیک میلنگ کے ذریعے حکومت کو قانون سازی سے روک سکیں۔ ان کے ہاں کوئی ایسی اسلامی نظریاتی کونسل نہیں جہاں ریاست سے تنخواہیں اور مراعات لینے والے اور مروجہ علوم سے ناآشنا علماء

ریاست کو اپنی من مانی مذہبی تشریح سے عورتوں کے حق میں بنائے جانے والے قوانین کو رد کرنے پر مجبور کرتے ہوں۔ انہوں نے علم، عقل اور تجربے سے سیکھتے ہوئے اپنے معاشروں کو ہمارے مقابلے میں کم و بیش جنت بنالیا ہے۔ انہوں نے فرد کو اس شرط پر آزادی دے دی ہے کہ اس کی آزادی کسی دوسرے فرد کی آزادی کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔

ہمارا سماج جبر پر قائم ہے اور اس جبر کا سب سے بڑا ہتھیار مذہب ہے۔ مذہب کا کمال یہ ہے کہ وہ انسانی نفسیات کو لاشعوری طور اس طرح اپنی گرفت میں لیتا ہے کہ فرد تمام عمر اس سے باہر نہیں نکل پاتا۔ ایسے فرد کو مذہب کی کوئی بات بھلے عقل سے کتنی ہی بعید کیوں نہ لگتی ہو وہ اسے پھر بھی درست مانتا ہے، بلکہ اُلٹا اپنی عقل کو ناقص سمجھنے کی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مذہب کی یہی وہ خصوصیت ہے جو بڑی کامیابی سے عوام اور خاص طور پر خواتین کے حقوق دبانے کے لیے انتہائی کامیابی سے استعمال ہوتی ہے۔ عوام الناس کو تقدیر کا خلافِ حقیقت سبق پڑھا کر اپنے حقوق کی جدوجہد سے روک کر مفلوج اور مجہول بنایا جاتا ہے۔ خواتین کو مذہب کی من مانی تشریح کر کے مردوں کی اطاعت کا سبق پڑھایا جاتا ہے اور وہ اسے اللہ رسول کا حکم سمجھ کر انکار کی جرأت ہی کھو بیٹھتی ہیں۔

اس بات سے قطع نظر کہ حقیقی اسلام عورت کو کون کونسی آزادیاں عطا کرتا ہے اور کون کون سی پابندیاں عائد کرتا ہے، زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ اس ضمن میں مذہب کے اجارہ داروں کا عمل اور بیانیہ کیا ہے۔ اور کیا اس بیانئے کو سماج پر نافذ کرنے کی صورت میں ملک کی اکیاون فیصد آبادی ہماری اجتماعی ترقی میں کوئی فعال کردار ادا کرنے کے قابل رہ سکتی ہے؟

اس حوالے سے ہم امام غزالی، مولانا اشرف علی تھانوی، سرسید، اکبرالہ بادی، علامہ اقبال اور مولانا مودودی کے خیالات قدرے تفصیل سے بیان کر چکے ہیں جن سے یہی اتفاق کشید ہوتا ہے کہ عورت کی ہستی بہرحال مرد کی مرضی سے طے ہوگی۔ اس کا کردار ایک نیک سیرت اور عفت مآب بیٹی، بہن، ماں اور اطاعت شعار بیوی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جس کے گھر سے باہر قدم رکھنے سے معاشرے میں فحاشی اور فسق و فجور کا طوفان برپا ہو سکتا ہے۔ غور کریں تو موجودہ طالبان ہمیں ان اکابرین کے بہترین پیروکار

دکھائی دیں گے۔ اگر ہم داعش کا طرزِ عمل دیکھیں جو کہ سرِ بازار یزیدی قبیلے کی لڑکیوں کی فروخت اور ان سے بلا نکاح جنسی تمتع کو عین اسلام بتاتے ہیں تو اس کا جواز ہمیں مولانا مودودی کی تحریروں سے مہیا ہو جائے گا۔

عمومی مذہبی ذہن جو کہ سراسر مردانہ بلکہ آمرانہ ہے، عورت کو انسان نہیں مرد کی اطاعت گزار دیکھنے کا خواہشمند ہے۔ اسی لیے وہ عورت کو بیٹی، بہن، ماں اور بیوی کے طور پر دیکھنے کا عادی ہے۔ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر یہ چاہتا ہے کہ عورت ان رشتوں کی قید کو قبول کر کے اپنی جنسی جبلت کے مطالبے سے بے خبر رہے۔ اس کے تئیں جنسی تلذذ تو صرف مرد کا مسئلہ ہے جس کے لیے اسے ایک بیوی کفائت نہیں کرتی بلکہ مقدس مذہبی حوالوں کی مدد سے چار چار بیویوں کے علاوہ اس نے اپنے لیے متعہ اور مسیار نہ راستہ بھی کھول رکھا ہے۔ وہ تو صدیوں پرانے دور کو آج بھی آئیڈیالائز کرتا ہے جب لونڈیاں بھی دستیاب تھیں مگر اے بسا آرزو کہ خاک شود۔ اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اس کی جنسی تسکین کے لیے بعد از مرگ جنت کا دروازہ بھی کھلا ہے جہاں غلافی آنکھوں والی ان چھوئی ستر ستر حوریں دستیاب ہوں گی۔

ہر فرد اپنے تجربے کی روشنی میں جانتا ہے کہ جنسی جبلت کس قدر منہ زور ہے اور اس میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں۔ مگر مرد پر دھان معاشروں نے زور زبردستی یہ کوشش کی کہ اس کی لذت پر مردوں کا اجارہ راسخ کر کے عورتوں کو محض لذت فراہم کرنے والا جنسی کھلونا بنا دیا جائے۔ یہ سراسر ایک غیر انسانی تخلیق دشمن حاکمانہ سوچ ہے جو صرف جبلتوں کی غلامی پر استوار ہوتی ہے۔ یہ سوچ سماج میں تعمیر کی بجائے تخریب کا باعث بنتی ہے۔ تاریخ کے تناظر میں جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ خود کش حملوں میں مردوں کی جنسی ہوس نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ یاد کیجئے کہ حسن بن سباح کی جنت میں موجود حوروں کے خیال نے اس کے پیروکاروں سے کیا کچھ نہیں کروایا تھا اور آج بھی خود کش بمباروں کو موت کے لیے تیار کرنے والے یہی حربہ کامیابی سے استعمال کر رہے ہیں۔

ہم جنسی جبلت کے تصور کے حوالے سے شدید افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ ہم یہ ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں کہ عورت کو اپنے جسم اور ذہن پر کوئی اختیار ہے۔ ہم ایک طرف اسے گھر میں مقید رکھنے

پر مصر ہیں اور دوسری جانب اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے مرے جاتے ہیں۔ عورت سے دوری مردوں کی جنسی جبلت کو ہمہ وقت انگیخت کر کے یوں برباد کرتی ہے کہ ان کی نام نہاد مردانگی کا نوحہ شہر کی دیواروں پر اشتہار بن جاتا ہے۔

اخلاقی اقدار کا نزول بھلے آسمان سے ہو یا یہ انسانی عقل کی مدد سے وجود پذیر ہوں، یہ سماج کی ضرورتوں کے مطابق اپنی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ ذرا سی توجہ دینے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ الہامی اخلاقی ضابطے بھی مسلسل تغیر و تبدل کی زد میں ہیں۔ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان اقدار کی یکساں تفہیم پر اتفاق مزید ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ ویسے بھی تفہیم کا یہ اختلاف آج پیدا نہیں ہوا بلکہ صدیوں پرانا ہے جس کی گواہی چار معروف آئمہ کی فقہی آراء کی صورت میں تاریخ کے ریکارڈ کا حصہ ہے اور یہ اختلافات محض فروعی نہیں بلکہ بنیادی شرعی معاملات اور عبادات کی ادائیگی کی بابت ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے جب بچوں کی تعداد کو کنٹرول کرنے کے لیے مانع حمل ادویات کے استعمال کو سراسر غیر اسلامی کہا جاتا تھا۔ بلکہ مولانا مودودی نے تو قرآن و احادیث کی مدد سے 'ضبط ولادت' نامی کتاب بھی لکھ ڈالی۔ مگر اب ایسے علماء بھی ہیں جو برتھ کنٹرول کو اسلام کی رو سے ہی جائز ثابت کر رہے ہیں۔ مگر مڈل کلاس کی ایک بڑی اکثریت مذہب کو سامنے رکھنے کی بجائے اپنے حقیقی مسائل کی بنیاد پر فیملی پلاننگ کے تصور کو اپنا رہی ہے۔ یہ بات ایک زندہ حقیقت ہے کہ عوام الناس کی ایک بڑی اکثریت ہر دور میں محض زبانی کلامی ایمان کی حد تک مذہبی رہی ہے جبکہ عملی طور پر وہ مروجہ کلچر کے مطابق ہی زندگی گزارتی ہے۔

فنون اور کلچر تہذیب کی پرورش کے لیے لازمے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی معلوم تہذیب رقص، موسیقی، تھیٹر، مصوری، کہانی اور شاعری سے خالی نہیں رہی۔ فنون کا خاصہ یہ ہے کہ وہ فرد کی فطرت کو آسودگی اور اس کے ذہن کو بالیدگی عطا کرتے ہیں۔ اس کی فطرت فن سے وابستہ جمالیات کے سحر سے گریزاں نہیں رہ سکتی۔ وہ اس کی جانب بے ساختہ کھنچا چلا جاتا ہے اور زاہد خشک اسے خدا سے غفلت کا نام دیتا ہے۔ اس کے خیال میں جو مظاہر انسانی فطرت کو آسودہ کرتے ہیں وہ

شیطان کا بلاوا اور بہلاوہ ہیں جو اس نے حضرت انسان کو خدا سے غافل کرنے کے لیے گھڑے ہیں۔ وہ لوگوں کو عبادت کے نام پر خدا کی طرف بلاتا ہے مگر اکثریت اس میں رغبت محسوس نہیں کرتی ہاں البتہ انکار کی صورت میں احساس جرم کا شکار ضرور ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں عبادات اور مذہبی رسوم کی وہ صورتیں قدرے مقبول ہیں جن میں کسی نہ کسی صورت فنون شامل ہوتے ہیں۔ فنون کی کشش اتنی منہ زور ہوتی ہے کہ اگر ان کی پریکٹس پر کفر کا فتویٰ بھی لگا دیا جائے تو وہ مذہبی تقریبات کے ساتھ معانقہ کر کے اپنا راستہ بنا لیا کرتے ہیں۔ جیسے کہ نعت، قوالی، دھمال، مرثیہ، ماتم، علم، تعزیئے اور ذوالجناح۔ اگرچہ کچھ مخصوص فرقوں کی جانب سے انہیں بدعت اور شرک کہا جاتا ہے مگر عوام الناس بڑی لاپروائی سے ان کے الزامات کو اپنی پریکٹس سے رد کر دیتے ہیں۔ بلکہ انہیں تو ایمان کی حد تک یقین ہوتا ہے کہ وہ انہی ذرائع سے اپنے خدا کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں۔

انسانی نفسیات اور فطرت کے ادراک سے محروم آرتھوڈاکس ذہن کو وقت نے بڑی مصیبت سے دوچار کر دیا ہے۔ ایک وقت تھا جب لوگوں کو فلم، تھیٹر یا رقص دیکھنے کے گھر سے دور جانا پڑتا تھا۔ سو کم از کم بچوں کو زبردستی یا اخلاقی دباؤ کے ساتھ بہت حد تک ان 'خرافات' سے بچانا ممکن تھا، مگر اب تو یہ سارے فنون ٹی وی کی سکرین پر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ وہاں تفریح کے جملہ لوازمات کے ساتھ ساتھ ایسی معلومات بھی نشر ہوتی ہیں جو روایتی عقائد کو خطرناک حد تک چیلنج کرنے والی ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں مذہب محض ایک نظریہ ہی نہیں بلکہ دکانداری بھی ہے جس کی پیروں فقیروں سے لے کر جدید علماء تک بے شمار شکلیں ہیں۔

چنانچہ وہ ایسے بھی ہیں جنہوں نے ابتداء میں ٹیلی وژن کو شیطانی چرخہ کہہ کر اپنے پیروکاروں کو یوں اکسایا کہ انہوں نے بلا سوچے سمجھے اپنے ٹی وی سیٹ چوراہوں میں رکھ کر توڑنے شروع کر دیئے۔ اور جب انہیں معلوم ہوا کہ اس مجہول حرکت سے ٹیلی وژن کی مقبولیت اور عوام الناس پر اس کے اثرات میں شمہ برابر بھی کمی نہیں آئی بلکہ الٹا ان کا یہ فیصلہ عوامی تمسخر کی زد میں ہے تو وہ اپنا سخت مذہبی موقف ترک کر کے خود اسی کی سکرین پر آنے لگے۔ یہ معکوس زقند ان کے خلاف فطرت موقف کی شکست کا صریح اعلان تھی۔ اور

سبھی جانتے ہیں کہ تاریخ مذہبی علما کے بے دلیل فیصلوں کی شکستوں سے بھری پڑی ہے۔

وہی علماء، جو عورت کو سر تا پا ملفوف رکھنے کو عین اسلام گردانتے تھے، اب ٹی وی پر سیاسی اور سماجی مکالمے کے بہانے ماڈرن خواتین کے رُو برو براجمان ہونے لگے اور انہیں مصلحتاً پردے کے بارے میں جملہ مذہبی احکامات پر پردہ ڈالنا پڑتا ہے۔ مگر اپنے بے وقوف مقلدین کو وہ یہی بتاتے ہیں کہ یہ خواتین جہنمی ہیں، ہم تو بس اپنا موقف بتانے کی مجبوری میں وہاں جاتے ہیں۔ جبکہ یہ حقیقت ہے کہ یہ ان پروگراموں میں شرکت کے لیے مرے جاتے ہیں کیونکہ ٹیلیوژن پر آنے سے ان کی اہمیت اور ریٹ دونوں بڑھ جاتے ہیں۔

ایک طبقہ وہ بھی تھا جس نے بہت جلد یہ راز پالیا تھا کہ فنون کا راستہ نہیں روکا جاسکتا، سو وہ مذہبی اداکاروں کا سوانگ بھر کر برینڈڈ لباس زیب تن کرکے ٹی وی سکرینوں پر آن براجا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس پر دھن برسنے لگا۔ بلکہ دہرا فائدہ یہ ہوا کہ رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ نعت خوانوں نے ایسے ایسے طریقے اختراع کیے کہ مذہب کے نام پر نئی موسیقی کے کئی جینڈ وجود میں آگئے۔ یاد رہے کہ ایسا سب اس موسیقی کے تتبع میں ہوا جسے غیر اسلامی کہہ کر رد کیا گیا بلکہ اکثر طرزیں بھی اسی کافر موسیقی سے چرائی گئیں۔

کسی بھی ترقی پسند سوچ رکھنے والے تجزیہ کار کے لیے اس بات سے اتفاق کرنا ممکن نہیں کہ ٹیلیوژن سکرین پر کلچر کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، وہ درست ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ثقافت کے نام پر ڈرامے، موسیقی اور فلم دکھانے کا مقصد عوامی مزاج کی تربیت نہیں بلکہ ان کی جبلتوں کو انگیخت کرکے سرمایہ کمانا ہے۔ مگر وہ مذہبی ذہن کی طرح نہ تو کلچر کا مخالف ہے اور نہ ہی عورت کی حقیقی آزادی کا۔ وہ عورت کو انسان مانتا ہے نہ کہ جنسی معروض۔ ایک ایسی انسان جو مردانہ جبر سے آزاد ہو کر اپنی شناخت قائم کر سکے۔ جسے ایسی گائے بھینس نہ بنایا جائے کہ جسے جس مرد کی کھونٹی سے چاہے باندھ دیا جائے۔ جو تعلیم سے لے کر کریئر تک اور کریئر سے لے کر زندگی کے ساتھی تک کا انتخاب مکمل آزادی اور اعتماد کے ساتھ کر سکے۔ اسے آئینی اور قانونی طور پر ویسے ہی حقوق حاصل ہوں جو مردوں کو حاصل ہیں۔ سماج

اس کے فیصلوں کی راہ میں دیوار بننے کی بجائے سہولت کار کا کردار ادا کرے۔

شادی ایک ذاتی معاملہ بھی ہے اور سماجی بھی، جس کے اثرات بہت دور رس ہوتے ہیں۔ یہ ذہنی اور جنسی تسکین حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ذمہ دار سماجی رکن بننے کا معاملہ بھی ہے۔ ایک ایسا رکن جو معاشرے کی مادی، علمی اور تہذیبی ترقی میں معاون بنے۔ ہم نے اپنی بے سوچی سمجھی روایات کے ساتھ چمٹتے ہوئے شادی کے ادارے کو برباد کر ڈالا ہے۔ جہالت کا یہ عالم ہے کہ متعلق جوڑے کی رائے کو پس منظر میں پھینک کر خاندان اور دوسرے غیر متعلقہ عوامل زقند لگا کر پیش منظر میں آ جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ہمارے بزرگ بچگانہ فیصلے کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

عورت مرد کے درمیان کشش ایک فطری امر ہے جو جنسی جبلت کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس جبلت کے مہذب انسانی اظہار کا نام ہی محبت ہے۔ محبت پر پابندی عائد کرنے والے سماج اپنا انسانی وصف کھو دیا کرتے ہیں کیونکہ وہ جبر کے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتے۔ جبر کا خاصہ یہ ہے کہ وہ یا تو روبوٹس کو جنم دیتا ہے اور یا پھر باغیوں کو۔ یہ دونوں صورتیں انسانوں کو کھا جاتی ہیں، الا یہ کہ کوئی باغی انقلابی میں بدل جائے اور سماج کی کایا کلپ کر دے۔

کوئی بھی سماج ہمیشہ کے لیے جمود کی حالت میں نہیں جی سکتا۔ اسے جلد یا بدیر آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ زندگی علم، تجربے، ریسرچ، تجزیے اور ان پر استوار دلائل کی بنیاد پر آگے بڑھتی ہے نہ کہ بے دلیل مقدس دعووں سے۔ دعوے بھلا کیسی ہی تقدیس کی بنیاد پر کیوں نہ کھڑے ہوں وہ اپنی تصدیق کے لئے بہرحال علم، تجربے اور تجزیے کی کسوٹی کے محتاج ہوتے ہیں۔ ہمیں انسان کی جنسی جبلت اور اس کی تسکین کے ضابطوں کو بھی اسی کسوٹی کی مدد سے سمجھنا اور طے کرنا ہوگا۔ زندگی ایک متحرک مظہر ہے سو ہمیں ضابطے بناتے وقت ان میں بھی تحرک اور تبدیلی کی گنجائش تسلیم کرنا ہوگی۔

معروف مذہبی ذہن صدیوں سے ایک تاثر قائم کرنے میں لگا ہے کہ جیسے چند مخصوص ضابطوں کے علاوہ جنسی تسکین کا حصول جرم اور گناہ ہے۔ جبکہ تاریخ اس کی تردید میں کھڑی ہے۔ اگرچہ یہ ضابطے بے حالت عوام اور خاص طور پر عورتوں پر ضرور لاگو رہے اور آج بھی ہیں مگر ان ضابطوں سے سماج کے

طاقت ور مردوں کے راستے میں کبھی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ انہیں ایک وقت میں چار چار من چاہی عورتوں سے نکاح کرنے کے علاوہ متعہ اور لونڈیوں سے تمتع کی کھلی سہولت حاصل رہی۔ ملوکیت کے دور میں جب جہاد سے حاصل ہونے والی لونڈیوں کی تعداد میں کمی آنے لگی تو پھر دوسرے ممالک سے عورتیں خریدی جانے لگیں۔ مسلمان بادشاہوں کے حرم آزاد بیویوں اور لونڈیوں سے بھرے رہتے تھے۔ جبکہ علت المشائخ کی روائت اس پر مستزاد تھی۔ تاریخ میں تو حکمرانوں کے محرمات کے ساتھ تعلق بنانے کے واقعات بھی ملتے ہیں جن کا مذہبی جواز دینے کے لیے علماء حاضر رہتے تھے۔

حرام ہے جو ہمارے علماء نے مسلمان بادشاہوں کے ان اعمال پر کبھی انگلی اٹھائی ہو یا انہیں فسق و فجور سے تعبیر کیا ہو۔ ہاں البتہ وہ عوام الناس کی جائز خوشیوں پر بھی ہمیشہ عناں گیر رہے ہیں۔ ان کے تئیں دو بالغ افراد کا مرضی اور محبت کا رشتہ ہمیشہ ناپسندیدہ رہا ہے جبکہ بزرگوں کی جانب سے زبردستی مسلط کئے گئے رشتے مشرقی تہذیب کا قابل تعریف نمونہ۔ یہ والدین ہیں جن کے عقل سے عاری یا لالچ کی بنیاد پر طے کردہ رشتے اولاد کی زندگی برباد کردیتے ہیں اور اکثر وہ انا یا نام نہاد مجبوریوں کی زنجیر سے خود کو یوں باندھ لیتے ہیں کہ اولاد کی شادی کی عمر ہی گزر جاتی ہے۔ انہیں اس بات کا شعور ہی نہیں ہوتا کہ اولاد کو ان کے فیصلوں میں خود مختار بنا کر اپنا بوجھ ہلکا کرلیں۔

ہم اجتماعی طور پر فیوڈل رشتوں کی نفسیات سے بندھے ہیں۔ اولاد ہمارے لیے رعایا کی حیثیت رکھتی ہے جس سے ہم اپنے ہر صحیح یا غلط فیصلے پر سر تسلیم خم کرنے کی توقع کرتے ہیں۔ اگر وہ ہماری زبردستی کو تسلیم کرنے سے انکار کرنے کی کوشش کریں تو ہم ایموشنل بلیک میلنگ کا حربہ استعمال کرنے سے بھی نہیں چوکتے اور ایسا اکثر اولاد کی شادی کے موقعوں پر ہوتا ہے۔ جبکہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ بزرگوں کے ایسے فیصلوں کے نتائج اکثر تباہ کن نکلتے ہیں۔

روائتیں سماجی ضرورتوں سے جنم لیتی ہیں لیکن اگر بدلتی ہوئی ضروریات کی نسبت سے ان میں قطع وبرید اور اضافہ نہ کیا جائے تو یہ اذیت ناک بوجھ میں بدل جایا کرتی ہیں۔ ہم بدلنا نہیں چاہتے مگر پھر بھی وقت کے ساتھ گھسٹتے ہوئے تبدیلی کی زد میں ہیں۔ یہ صورتحال ہمیں نئی لاینحل الجھنوں سے دوچار

کر رہی ہے جنھیں سلجھانے کے لیے سماجی دانش تقریباً ناپید ہے۔ گھر میں آنے والی نئی اشیاء اور جدید مشینیں ایک نیا کلچر بھی ساتھ لا رہی ہیں جو ہمارے نہ چاہنے کے باوجود لاشعوری طور پر ہمارے رہن سہن میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ یہ بات بچوں کو ڈسٹرب نہیں کرتی کہ یہ سب ان کے لیے عین فطری ہے۔ مسئلہ تو بزرگوں کا ہے جن کی جمی جمائی نفسیات ان تبدیلیوں سے مجادلے کی حالت میں ہے اور جنھیں ہر لحہ اولاد کے 'خراب' ہونے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ ہر آنے والا لمحہ ان کے خوف میں اضافہ کر رہا ہے۔ مگر وہ حالات کو سمجھنے کی بجائے زور زبردستی سے بچوں کو ان کی دست بُرد سے بچانے کی ناکام کوششوں میں لگے ہیں۔

موبائل اور انٹرنیٹ نے لڑکوں اور لڑکیوں کو آپسی تعلق بنانے کی آسانیاں فراہم کر دی ہیں۔ یہ کوئی بری بات ہرگز نہیں بلکہ یہ ان کی فطرت کا وہ جائز تقاضہ ہے جس پر ہم نے ایک زمانے تک زبردستی بند باندھے رکھے اور دنیا کے سامنے اپنی جھوٹی تہذیب کا ڈھنڈورہ پیٹتے رہے۔ حالانکہ ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم میں سے شائد ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے اپنی نوجوانی میں یک طرفہ یا دوطرفہ محبت نہیں کی ہوگی۔ بلکہ کئی تو ایسے بھی ہوں گے جن نے دھڑلے سے فلرٹ بھی کیے ہوں گے۔ اور یہ بات صرف مردوں پر ہی نہیں بلکہ عورتوں پر بھی سو فیصد لاگو ہوتی ہے۔ ہمیں برا لگے یا اچھا، اس میں خود ہماری مائیں بہنیں، بھتیجیاں اور بھانجیاں بھی شامل ہیں۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ اس عمل کو ہم نے اپنے لیے جائز اور دوسروں کے لیے ناقابل معافی جرم قرار دے رکھا ہے۔

جب ہم اصولوں کی بات کرتے ہیں تو انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ یہ عورت اور مرد دونوں پر یکساں لاگو ہونے چاہئیں۔ آخر عصمت کا تصور عورت کے ساتھ ہی کیوں منسوب کیا جائے۔ کیا اس لیے کہ وہ پریگنینٹ ہو جاتی ہے۔ مگر اس کی ذمہ داری تو اولاً فطرت پر عائد ہوتی ہے اور اس کے بعد مرد پر۔ اور پھر جس عمل سے وہ پریگنینٹ ہوتی ہے اس کا لطف تو مرد اور عورت دونوں ہی اٹھاتے ہیں۔ سو اس حساب سے تو اگر یہ عمل عصمت یا عزت گنوانے سے جڑا ہے تو پھر صرف عورت کی عزت خراب ہونے کا سوال کیوں؟ اور اب تو جدید مانع حمل ادویات نے ان چاہی پریگنینسی کا مسئلہ بھی ختم کر دیا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب مرد اور عورت کے اختلاط کا غالب نتیجہ عورت کے حاملہ ہونے کی صورت میں ہی نکلتا تھا۔ سو مشکل یہ درپیش تھی کہ اس غیر اعلان شدہ تعلق کے نتیجے میں بچے کے باپ کا تعین مشکل کام تھا۔ چنانچہ بچے کی کفالت کا سارا بوجھ ایک ایسی عورت کے کاندھوں پر آجاتا تھا جو کہ معاشی لحاظ سے خود اپنے والدین پر بوجھ ہوتی تھی۔ اعلانیہ نکاح کے بعد اولاد کی پیدائش اس لیے جائز مانی جاتی تھی کہ اس کے نان نفقے کے قانونی ذمہ دار کا تعین ہو چکا ہوتا تھا۔ غور کریں تو عورت اور مرد کے اختلاط پر پابندیاں عائد کرنے کا معاملہ اخلاقی سے کہیں زیادہ معاشی تھا جسے اجتماعی نفسیاتی الجھاووں نے اور زیادہ گھمبیر بنا دیا تھا۔

عورت کو معاش کے میدان سے باہر رکھنے کی ذمہ داری اصلاً مرد پر عائد ہوتی ہے جسے بعد میں عورت کی اپنی سہل پسندی نے ایک مستقل قدر کی شکل دے دی۔ مرد کا مقصد عورت پر اپنی سیادت قائم کر کے نہ صرف اسے اپنا نوکر بنانا تھا بلکہ اس کے بدن سے من چاہے انداز میں لطف اندوز ہونا بھی تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ عورت کے علم اور تجربے کو اس قدر محدود کر دیا جائے کہ وہ خود کو فطری طور پر کم عقل مان کر مرد کے احکامات کو بلا چون چرا تسلیم کرنے والے کردار میں ڈھل جائے اور مرد کی حکم چلانے کی عادت کا مزا کرکرا نہ کرے۔

تاریخ کے پراسیس میں مرد نے عورت کو فیصلہ سازی کے حق سے محروم کرنے کے لیے کئی طرح کی سازشوں کا ارتکاب کیا۔ اسے چار دیواری میں محدود کر کے اس پر معیشت، اور علم کے راستے بند کر دیئے تاکہ اسے یہ یقین دلایا جا سکے کہ وہ عقل اور ذمہ داری کے میدان میں مرد کا مقابلہ کرنے کی اہل ہی نہیں ہے۔ دوسرا عصمت وعفت کا تصور بھی اس کے ساتھ منسوب کر دیا تاکہ وہ اس کے کھوئے جانے کے خوف سے مرد کی فراہم کردہ پناہ گاہ سے باہر نکلنے کی جرأت نہ کر سکے۔ تیسرا اسے یہ باور کروایا کہ وہ سرتاپا حسن ہے اور اس کا کام صرف شوہر کی دلبستگی کے لیے بننا سنورنا ہے۔ ذرا اقبال کا وہ مصرعہ یاد کیجیے جسے یار لوگ لہک لہک کر دہراتے ہیں ''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ''۔ یہ مصرعہ اسی ذہنیت کا عکاس ہے جس کا تذکرہ اوپر کی سطور میں کیا گیا۔

مذہب کے نام پر مرد نے ایک کام یہ بھی کیا کہ عورتوں کو شریف اور غیر شریف کے خانوں میں بانٹ دیا۔ یعنی عصمت کا تصور بھی سب عورتوں کے ساتھ وابستہ نہیں رہنے دیا تا کہ اس کی جنسی تسکین کے لیے کئی آزاد راستے کھلے رہیں۔ یہ غیر شریف عورتیں وہی تھیں جو مسلمان فاتحین کی قید میں آنے سے پہلے ان کی اپنی عورتوں کی طرح معزز اور شریف کہلاتی تھیں لیکن قبضے میں آنے کے فوراً بعد اپنا یہ سٹیٹس کھو بیٹھتیں۔ انہیں انسان تو دور کی بات گھر ستن عورت کا درجہ بھی حاصل نہیں رہتا تھا، ہاں بس ایک جنسی کھلونا جس سے اس کا مالک جیسے چاہے دل بہلائے یا اسے کسی دوسرے کو فروخت کردے یا کسی دوست کو تحفتاً عطا کردے۔ اور آزاد عورت کی حالت بھی کوئی ایسی خوش کن نہیں تھی۔ ہم عمر بزرگ مرد پہلے سے کئی بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی بڑی سہولت سے ایک دوسرے کی کم عمر بیٹیوں کے رشتے مانگ لیا کرتے تھے۔ نکاح کے تعلق میں عورت کا کردار سہولت فراہم کرنے والی کسی شے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ شادی کا مطلب محض مردانہ حاجتوں کی تکمیل تھا جس میں حد سے بڑھی ہوئی جنسی خواہش بنیادی محرک تھی۔

ماضی میں یہ سب خدائی احکامات کے نام پہ ہوا جسے آج کے دور میں جواز دینا آسان نہیں رہا۔ اب عورت بھی بہت کچھ سمجھ چکی ہے۔ اب اسے سیکس اوبجیکٹ اور محض بے تنخواہ گھریلو ملازمہ کا کردار قبول نہیں ہے۔ اسے اپنے پاؤں میں افسانوی جنت کی بجائے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا حق درکار ہے۔ مشین کی ایجاد نے عورت اور مرد کی جسمانی طاقت کے فرق کو ماضی کا قصہ بنا دیا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ بھاری سے بھاری مشین چلانے کے لیے محض ایک انگلی کا بٹن کافی ہے۔ اس کی انگلیاں مرد کے مقابلے میں بہتر رفتار سے کمپیوٹر آپریٹ کرسکتی ہیں۔ وہ بچے کی پیدائش کے سبھی مراحل کا راز جان چکی ہے۔ اب لازمی نہیں کہ مرد کا نطفہ جب چاہے اس کی کوکھ کا بوجھ بڑھاوے۔ سیکس کے عمل سے حمل ٹھہرنے کا خوف منہا ہو چکا ہے۔ اب وہ محض ایک ننھی سی گولی کے بھروسے پر غیر محفوظ سیکس سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔ حمل کے عمل میں ماورائی قوتوں کا عمل دخل افسانہ ثابت ہو چکا۔ ابھی یہ راز شہروں کی خواتین پر آشکار ہوئے ہیں اور وہ دن زیادہ دور نہیں جب دور دراز دیہات کی عورتیں بھی ان دیکھی قوتوں کے نام پر بے وقوف بننے سے

انکار کر دیں گی۔ مولوی نے مرد کو مذہبی دلائل کے جو ہتھیار تھمائے تھے وہ جدید علم کے ہاتھوں ناکارہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس علم کے حصول کے لیے عورتوں کو سکول یا کالج جانے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ اب ہر گھر میں ٹی وی موجود ہے جو انہیں ہر طرح کی جدید معلومات فراہم کر رہا ہے۔

شرم و حیا کے پیمانے تیزی سے بدل رہے ہیں اور لاشعوری طور پر قبول بھی کیے جا رہے ہیں اور ایسا ہونا ناگزیر بھی ہے۔ عورت کا اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال کے لیے فعال ہونا اس کا بنیادی انسانی حق ہے جس پر عقل اور دلیل سے ماورا مقدس حوالوں کی مدد سے ڈاکہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ عورت کا گھر سے باہر نکلنا بے حیائی نہیں ہے۔ بلکہ وہ مرد بے حیا ہے جو اسے محض ایک جسم سمجھ کر سیکس اوبجیکٹ کی طرح ہوس بھری نظروں سے دیکھتا ہے اور پھر اس کے عریاں تصور سے اپنی تنہائی کو رنگین بناتا ہے۔ یہ مرد کی بیماری ہے، گھر سے باہر آنے والی عورت کی نہیں۔ اس بیماری کی وجہ بھی مرد ہی ہے کہ اس نے عورتوں کو ملفوف کر کے اپنی جنسی خواہش کو انتہائی زود حس بنالیا ہے۔ اتنا زود حس کہ وہ عورت کی قربت تو دور کی بات اس کی ایک جھلک سے ہی انگیخت ہو جاتا ہے۔ یہ ایک وحشی معاشرے کی تصویر ہے جس میں ہر مرد اپنے گھر کی عورتوں کو اپنے ہی جیسے مردوں سے بچانے کی فکر میں مرا جاتا ہے۔ مگر یہ صورت تادیر باقی رہنے والی نہیں۔ عورت کو کمزور بنا کر اس کی حفاظت کا فلسفہ ہی بے وقوفی کی بات ہے کہ کمزور عورت چالاک مرد کا آسان شکار ہوتی ہے۔ وہ بھلے محلے کا کوئی نوجوان ہو یا گھر میں بے تکلفی سے آنے والا کوئی با اعتماد دوست یا رشتے دار، کمزور عورت کسی کے بھی ہتھے با آسانی چڑھ سکتی ہے۔

جن عورتوں کو گھروں میں بند رکھا جاتا ہے، ان کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ ان پر اعتماد نہیں کیا جا رہا۔ سو وہ اس بے اعتمادی کا بدلہ گھر میں آنے والے کسی مرد کی جانب خود قدم بڑھا کر یوں بھی لے سکتی ہیں کہ ان کے رکھوالوں کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ مطلب یہ کہ عورت مرد کے بنائے ہوئے حصار کو مرد کی مدد سے ہی توڑ بھی سکتی ہے۔ بس اس میں اور گھر سے باہر جانے والی عورت میں فرق یہی ہے کہ وہ سب کچھ کرنے کے باوجود شریف اور باحیا کہلانے کی حق دار ٹھہرتی ہے۔

تو جناب یہ ہے وہ جھوٹی اور منافقانہ شرم و حیا جس کا بوجھ ہم خوشی خوشی اٹھائے پھرتے ہیں۔ اس میں

کوئی شبہ نہیں کہ مردوں کی اکثریت دوسروں کے گھروں میں سیندھ لگانے کی خواہش میں مبتلا ہے مگر کوشش یہ ہے کہ کوئی دوسرا ان کے گھر میں سیندھ نہ لگا سکے۔ یہ ایک شیطانی چکر ہے جو سراسر مردانہ سوچ کا شاخسانہ ہے۔ یہ نہ تو پند و نصائح سے ختم ہو سکتا ہے اور نہ ہی تبلیغ سے، بلکہ اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ مرد رضا کارانہ طور پر عورت کو اپنے برابر تسلیم کرلے ورنہ جلد یا بدیر وقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کردے گا۔

یہ بات طے ہے کہ ہم مرد اور عورت کے درمیان جتنی زیادہ دوری پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جنسی تعلق کی نارمل خواہش اتنا ہی بھڑک کر شعلہ بننے لگتی ہے۔ ہم اس آگ کو بجھانے کے لئے اس پر مزید دوری کا پٹرول ڈالنے لگتے ہیں۔ ہمارے ہاں بالغوں سے لے کر بوڑھوں تک ہر کوئی نارسائی کی آگ میں سلگتا پھرتا ہے۔ بوڑھوں کی حالت تو اور بھی قابل رحم ہے کہ وہ ناامیدی اور لاتعلقی کے گڑھے میں پڑے سسکتے ہیں۔ نوجوان اولاد اپنے ادھیڑ عمر والدین کا ایک چھت تلے سونا پسند نہیں کرتی اور وہ خود بھی اسے کوئی غیر اخلاقی حرکت سمجھنے لگتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ادھیڑ عمر عورتیں بھی چاچا، تایا اور بابا کہہ کر فاصلے پر رہنے کی چتاؤنی دے دیتی ہیں۔ ایسے میں ان کے پاس ٹھرک کے سوا کوئی حربہ نہیں بچتا۔ جو ذرا شاطر ہوتے ہیں وہ کسی کو بھی بیٹی کہہ کر لپٹانے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر علت المشائخ کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ اولاد اور والدین دونوں ہی ایک دوسرے کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں جیسے کسی نے انہیں ایک دوسرے کی خوشیوں کے راستے بند کرنے کی ڈیوٹی سونپ رکھی ہو۔ جبکہ فریقین کے پاس ان نام نہاد اخلاقی ضابطوں کی کوئی عقلی دلیل نہیں ہوتی مگر سماج کی اجتماعی بے دلیل سوچ کی لاشعوری گرفت میں وہ یہ سب کچھ کیے چلے جاتے ہیں اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ رشتے کے نام پر کس طرح ایک دوسرے کی خوشیاں برباد کیے جارہے ہیں۔

ہماری بے دلیل اخلاقیات کی صورت یہ ہے کہ ہم نے تولید سے متعلقہ معاملات کو بھی فحاشی کی ذیل میں شامل کررکھا ہے۔ اب کون سی بچی ایسی ہے کہ جسے ایک خاص عمر میں حیض سے واسطہ نہیں پڑتا، مگر مجال

ہے کہ والدہ اسے بروقت گائیڈ کرنے کی کوشش کرے۔ مروجہ اخلاقیات نے اس کے ذہن میں یہ بات راسخ کر رکھی ہے کہ حیض اور اس سے جڑے تولید کے معاملے کے بارے میں بات کرنا بری بلکہ گندی بات ہے۔ بس ٹھیک ہے جیسے یہ بات ٹھوکریں کھا کر میں نے سیکھی تھی، بیٹی بھی سیکھ لے گی۔ وہ سوچتی ہے کہ شادی سے پہلے جسمانی تعلق کے بارے میں بیٹی کو علم دینے کی کیا ضرورت ہے، شادی کی رات اس کا شوہر خود اسے سب کچھ سکھا دے گا۔ یعنی جو بات ماں جیسی قریب ترین ہستی کا بتانا گندی بات کے زمرے میں آتا ہے اسی بات کا ایک اجنبی شخص کے ذریعے معلوم ہونا بالکل روا ٹھہرتا ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ یہ رویہ بچی کو کیسے کیسے نفسیاتی جھٹکوں سے دوچار کر سکتا ہے۔

سیکس کا تعلق فرد کی نفسیات اور اجتماعی اخلاقیات سے جس قدر گہرا ہے اس کی ذمہ دارانہ تفہیم سے اتنی ہی شدت سے جان چھڑائی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے اس اہم ترین عمل اور جذبے کو بری طرح سے ولگرائز کر ڈالا۔ ہم نے سیکس، گالی اور فحاشی کو لازم و ملزوم بنا ڈالا۔ اب صورت یہ ہے جہاں کہیں سیکس سے متعلقہ کسی بھی بات کا تذکرہ ہوتا ہے ہمارے چہروں پر یا تو بے شرمی سے لتھڑی خباثت ظاہر ہوتی ہے اور یا پھر شرمندگی سے لبریز بیمار شرم و حیا۔ ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ اپنے بچوں کو زندگی کے اتنے اہم ترین معاملے کا علم معقول طریقے سے نہیں دینا بلکہ انہیں حالات کی بے رحم لہروں کے حوالے ہی کرنا ہے اور ساتھ میں یہ امید بھی رکھنی ہے کہ وہ نیک بچے ثابت ہوں گے۔ کیا ہمیں اب تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ چھپانے کے اس عمل نے ہماری سوسائٹی کے بگاڑ میں مسلسل اضافہ ہی کیا ہے۔

ہم کیوں نہیں مان لیتے کہ سیکس بھی بھوک اور نیند کی طرح ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اہم کہ یہ نسل انسانی کے تسلسل کے علاوہ دو افراد کے درمیان لطف سے لبریز محبت کے تعلق کی بنیاد بھی ہے۔ ہاں بس شرط اتنی ہے کہ اس تعلق میں فریقین کی آزاد مرضی شامل ہو نہ کہ انہیں زبردستی ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے پاس فریقین سے ان کی مرضی چھیننے کا کوئی اخلاقی جواز ہے؟ یاد رکھیے اگر اخلاقی اصول واقعی انسان کو سمجھ کر بنائے گئے ہوں تو وہ انہیں پہلے سے بہتر انسان بننے میں معاون ہوتے ہیں ورنہ وہی نتائج نکلتے ہیں جنہیں ہم آج بھگت رہے ہیں۔ ہماری اخلاقی

اقدار نے ہمیں منافق بنا دیا ہے۔ جب سوسائٹی فرد کی خوشی کے حصول پر کڑے ضابطے نافذ کر دیتی ہے تو پھر بہت سے کام چھپ چھپا کر کرنے پڑتے ہیں۔ ایسے میں اکثر پرخلوص محبت اور فلرٹ یا ناجائز تعلق ہم معنی سمجھ لیے جاتے ہیں۔ اور یوں لوگ محبت کو بھی گناہ کی طرح چھپاتے ہیں۔ لو میرج کرنے والے اکثر جوڑے یہی کہتے پائے جاتے ہیں کہ ان کی شادی ارینجڈ تھی۔

آزادمرضی کے لیے شعور لازمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ شعور بنا علم کے ممکن نہیں۔ اور علم کے لیے غیر متعصب اور منطقی تعلیم شرط ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے جو فرد میں احساسِ ذمہ داری، خود اعتمادی اور فیصلہ سازی کی صلاحیت پیدا کرے گی۔ یہی وہ تعلیم ہے جو لڑکیوں کے بارے اس تاثر کو غالب حد تک ختم کرسکے گی وہ والدین پر بوجھ ہوتی ہیں۔ دوسروں کے خوف یا نام نہاد عزت سے جڑی بہت سی سماجی رسوم جن میں جہیز اور بری بھی شامل ہیں، تیزی کے ساتھ اڑن چھو ہو جائیں گی۔ بچے ذمہ داری سے متصف ہوں گے تو والدین کو ان پر پہرہ نہیں دینا پڑے گا۔ وہ بڑوں کے مقابلے میں اپنا جیون ساتھی زیادہ بہتر انداز میں اعتماد کے ساتھ چن سکیں گے۔ مگر اس کے لیے ہمیں محبت اور آزادی کے مفہوم اور ان کے آپسی تعلق کو جاننا ہوگا۔ اور یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ یہ دونوں عوامل کس طرح سے سماج کو امن اور اطمیناں کا گہوارہ بنا سکتے ہیں۔

محبت ایک بے ساختہ جذبہ ہے جس میں کوئی ملاوٹ ممکن نہیں۔ یہ جب کسی سے ہوتی ہے تو ہم اس فرد کے لیے بنا کسی مفاد کے جان تک دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ محبت واحد جذبہ ہے جس میں ہم اپنے محبوب کو ذرہ برابر بھی گزند نہیں پہنچا سکتے، بلکہ اس کا تو ہم خود سے بھی زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا سماج (جس کا بنیادی یونٹ خاندان ہے) اتنے خوبصورت اور مثبت جذبے سے بدکتا کیوں ہے؟ ایک ایسا فیصلہ جس کا تعلق سراسر محبت کی بنیاد پر اپنا شریک زندگی منتخب کرنے سے ہے، والدین اور دوسرے بزرگ اولاد سے اس کا حق چھیننے پر کیوں تُل جاتے ہیں؟ اس کا سیدھا سادہ جواب ہے احساسِ ملکیت اور اس سے جڑی انا۔

ملکیت کا تعلق انسانوں سے نہیں اشیاء کے ساتھ ہوتا ہے مگر کیا کریں پیسے اور اشیاء کے ساتھ ہماری

محبت نے اولاد کو بھی ملکیت میں بدل دیا ہے۔ ہم ان سے پالتو جانوروں کی طرح اپنے غلط یا ٹھیک احکامات کی تعمیل کی توقع رکھتے ہیں۔ اگر وہ انکار کردیں تو ہمارے احساسِ ملکیت اور انا کو ویسی ہی ٹھیس پہنچتی ہے جیسے کہ کسی غلام یا نوکر کے انکار کرنے پر۔ پھر ہم اپنی اولاد کے انکار کو اقرار میں بدلنے کے لیے ایموشنل بلیک میلنگ سے لے کر عاق اور قتل تک کی دھمکیوں کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ یہ غیرت کے نام پر بہنوں اور بیٹیوں کے قتل اسی بے ہودہ سوچ کا شاخسانہ ہیں۔ غور کریں تو یہ غلامی کے رشتے کی ہی ایک شکل ہے جسے ہم مذہب اور سماجی روایات کے نام پر قائم رکھے ہوئے ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ اس ملکیتی جذبے اور اس سے جڑی انا نے ہمیں کوئی سکھ نہیں دیا۔ والدین کی ضد سے طے کیے گئے رشتوں نے اکثر خاندان کی زندگی کو جہنم میں ہی بدلا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس جہنم کو جنت میں بدلنے کا کوئی راستہ ہے؟ جی بالکل ہے۔ اور وہ راستہ یہ ہے اولاد کو ملکیت سمجھنے کی بجائے اپنی ذات سے باہر ایک آزاد وجود تسلیم کیا جائے۔ ان کے ساتھ جبر اور حکم کی بجائے دوستی کا تعلق بنایا جائے۔ انہیں ان کی عمر کے مطابق اپنے فیصلے خود کرنے کی تربیت دی جائے۔ ایک خاص عمر کے بعد ان کے گھر سے باہر اکیلا جانے کے لیے حوصلہ افزائی کی جائے، خاص طور پر لڑکیوں کی تاکہ وہ گھر سے باہر کی دنیا میں موجود مشکلات سے نمٹنا سیکھ سکیں۔ انہیں سوسائٹی کے شر سے بچانے بلکہ اس میں کمی لانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ انہیں اس شر سے ڈرانے کی بجائے لڑنا سکھا دیا جائے۔

ہمیں ابتدائی سے اعلیٰ درجے تک مخلوط تعلیم کی جانب جانا ہوگا۔ اساتذہ کو بھی اس بات کی تربیت دینا ہوگی کہ وہ طلبہ کو صنفی خانوں میں تقسیم کرنے کی بجائے انہیں صرف انسان کے طور تعلیم دیں۔ مخلوط تعلیم سے ہی ممکن ہوگا کہ عورت اور مرد کو ایک دوسرے کے بارے میں ناجائز تجسس کی بیماری سے نجات حاصل کرسکیں۔ جو نوجوان مخلوط تعلیم کے عمل سے گزرے بغیر یونیورسٹی جائن کرتے ہیں وہ اپنی جنسی زود حسی کی وجہ سے اپنے اصل مقصد یعنی تعلیم کے حصول پر مناسب توجہ نہیں دے پاتے اور یوں اپنا اور قوم کا مستقبل تاریک کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو یہ کوئی معمولی المیہ نہیں ہے۔

ہمارے ہاں عمومی تصور یہ ہے کہ دفاتر کا ماحول خواتین کے لیے سازگار نہیں ہوتا۔ یہ بات اتنی غلط بھی نہیں ہے۔ مگر یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ جس کا تدارک نہ کیا جا سکے۔ جب ابتدائی سے اعلیٰ درجے تک مخلوط تعلیم کے تجربے سے گزرنے والے نوجوان کام کرنے ، لے اداروں میں اکٹھے ہوں گے تو وہاں کا ماحول عورتوں کو پریشان کرنے والے جنسی ہراس کے خوف سے بہت حد تک پاک ہوگا۔

اگر ہم یہ کہیں کہ عورتوں کو گھر میں بند رکھنے کی پالیسی نے گھر سے باہر کی دنیا کو ان کے لیے خطرناک بنا دیا ہے تو یہ بات غلط نہیں ہوگی۔ کچھ لوگ اس بات کو غلط ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل لا سکتے ہیں کہ جناب ہمارے مذہب میں تو یہی حکم ہے کہ عورتوں کو چادر اور چار دیواری میں بند رکھا جائے اور انتہائی مجبوری کے عالم میں گھر سے باہر نکلیں۔ ہم مان لیتے ہیں کہ ہاں مذہبی حکم یہی ہوگا، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں عملی نظائر مہیا ہوں۔ اور ظاہر ہے یہ نظائر ہمیں اسلام کے ابتدائی ادوار سے ہی تلاش کرنا ہوں گی جب کہ مذہب ابھی خالصتاً عربی تھا اور اس میں عجمیت کی ملاوٹ شروع نہیں ہوئی تھی۔ پردے کے احکامات کا اطلاق صرف فاتح مسلمانوں کی عورتوں پر ہوتا تھا جبکہ جنگ میں پکڑی گئی خواتین کو پردہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ دلیل یہ تھی کہ ایسا کرنا شریف عورتوں کی نقل کے مترادف ہے اور انہیں اس بات کا حق کیونکر دیا جا سکتا ہے۔ تو کیا ہم یہ مان لیں کہ عورت کے لفظ کا اطلاق صرف مخصوص کمیونٹی سے وابستہ خواتین پر ہوتا تھا اور لونڈیوں کی حیثیت محض ایک ذاتی غلام اور جنسی معروض کی تھی؟

عورت کو گھر تک محدود رکھنے کے لیے ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ اس کے گھر سے باہر آنے کی صورت میں معاشرے (یعنی مردوں) میں بے راہ روی پھیل جائے گی۔ ظاہر ہے اس بے راہروی کا تعلق جنسی معاملات سے ہی ہوگا۔ تو جناب یہ مقصد تو غارت ہوگیا جب ہم نے ایک دوسری قسم کی عورتوں کو خود سرِ عام بے پردہ پھرنے پر مجبور کر دیا۔ ظاہر ہے یہ "عورتیں" سماج میں اپنے حسن و جمال کی نمائش کے علاوہ اور کیا کرتی ہوں گی۔ اور جب وہ ایسا کرتی ہوں گی تو کتنے مرد ہوں گے جو ان نظاروں کی صورت میں غضِ بصر سے کام لیتے ہوں گے۔ اور ایسی صورت میں امتناعِ اختلاط اور سخت

پردے سے جن نتائج کا حصول مقصود تھا، وہ کیسے حاصل کیے جا سکے ہوں گے؟ اس سوال کا درست جواب حاصل کرنے کا ایک عمدہ طریقہ یہ ہے کہ آپ اسے آج کی صورتِ حال میں تصور کر کے سوچیں کہ ایسی صورت میں کیا وہ معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے جس کا پاکیزہ نقشہ آپ نے سنہرے ماضی کے حوالے سے اپنے دماغ میں سجا رکھا ہے؟ اس سوال کا جواب سوچتے وقت ضروری ہے کہ اس زمانے میں چار چار شادیوں کے ساتھ ساتھ متعہ اور نکاح مسیار کی دستیاب سہولتوں کو بھی پیش نظر رکھیں۔

غور کریں تو ہمارے سامنے ایک ایسے سماج کی تصویر بنتی ہے جہاں مردوں کی جنسی حس کی تسکین پر کوئی پابندی دکھائی نہیں دیتی جبکہ عورتوں کے لیے کڑے ضابطے موجود تھے۔ ایک ایسا سماج جہاں مردوں کی خواہش ہی قانون دکھائی دیتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کا مرد بھی اسی ذہنیت کا اسیر ہے۔ وہ بظاہر عورتوں کو گھر میں بند کرنے کا حامی ہے مگر حقیقت میں وہ صرف اپنے گھر کی عورتوں کو پردے میں رکھ کر باقی عورتوں تک رسائی کا خواہشمند ہے۔ اگر اسے یہ رسائی آسانی سے دستیاب ہو جائے تو اپنی عورتوں کے بارے میں اس کا خوف مزید گہرا ہو جاتا ہے اور وہ گھر میں پردے کے ضابطے اور سخت کر دیتا ہے۔ کیا ایسا معاشرہ عورت اور انسانیت کے احترام کا دعویدار ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ یہ وہ سماج ہے جہاں بھیڑیے بھیڑ کی کھال اوڑھے پھرتے ہیں۔

وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی اخلاقی اقدار کی بنیادوں کو پرکھیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہ اقدار اپنی اہمیت کیوں کھو چکیں۔ یہ ہمیں آسودہ کرنے کی بجائے اذیت میں کیوں مبتلا کر رہی ہیں؟ والدین اور بچوں میں بڑھتی ہوئی اجنبیت کیسے کم کی جا سکتی ہے؟ کیا والدین کو سمجھنا بچوں کی ذمہ داری ہے یا یہ فریضہ والدین کا ہے کہ وہ اولاد کو سمجھیں؟ کیا روائتی تعلیم اور روائتی سوچ سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے؟ کیا ذات، برادری اور فرقہ اولاد کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے؟ کیا ذات، برادری اور فرقہ کردار پرکھنے کی حقیقی کسوٹی ہیں؟ کیا والدین کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ رشتہ کرنے کے معاملے میں اپنے مفاد یا خوشی پر اولاد کی مرضی کو قربان کر دیں اور ان کی جھوٹی ہاں کو سچی رضامندی سمجھ بیٹھیں؟

جو والدین تربیت کے معاملے میں جبر کے قائل ہوتے ہیں ان کی اولاد کبھی ان کے ساتھ سچ نہیں

بیتی۔ اور اکثر اس جبر کا انتقام یوں لیتی ہے کہ وہ ان کی آنکھ بچا کر پابندیوں کو توڑتی ہے اور انہیں دھوکہ دے کر یک گونہ تسکین محسوس کرتی ہے۔ مگر جب یہی اولاد خود ذمہ داری کے منصب پر فائز ہوتی ہے تو اسے احساسِ جرم آن گھیرتا ہے اور وہ خود لاشعوری طور پر اپنے والدین والا کردار اپنا لیتی ہے۔ یعنی جبر اور تحکم کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔

ہم ایک پہلے سے کہیں زیادہ مشکل اور پیچیدہ دور میں داخل ہو چکے ہیں جہاں پرانی اخلاقیات اپنی وقعت کھو چکیں۔ موجودہ والدین کی ایک بڑی اکثریت نے ضیاء الحق کے زمانے میں ہوش سنبھالا۔ یہ وہ دور تھا جب نمائشی مذہبیت اور حقائق سے متصادم اخلاقیات نے عروج پکڑا۔ مُلّا کی طاقت جو بھٹو کے دور میں نیم جاں ہو چکی تھی، اس نے حکومت کی آشیرباد سے معاشرے کو بری طرح سے یرغمال بنا لیا۔ ابھی یہاں کمپیوٹر متعارف نہیں ہوا تھا۔ موبائل بھی خال خال تو دولتیوں کی دسترس میں تھا۔ انٹرنیٹ تو ابھی ایک خواب تھا۔ لے دے کے ایک ٹیلی ویژن تھا جو علم اور تفریح سے کہیں زیادہ تبلیغ کا آلہ تھا۔ صورت یہ تھی کہ نیوز کاسٹر اور ڈرامے کی ہیروئن بھی دوپٹہ اوڑھنے کی پابند تھی۔ ہاں البتہ وی سی آر آ چکا تھا جو عموماً طور پر ٹی وی سیٹ اور فلموں کے ساتھ کرائے پر مل جاتا تھا۔ اس کے ذریعے یار لوگ گروپ کی صورت میں چھپ چھپا کر ننگی جنسی فلمیں دیکھ لیا کرتے تھے۔ بہت سے شادی شدہ جوڑے بھی ان فلموں سے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ جنسی تعلق کے نئے نئے زاویے سیکھتے تھے۔ اس سب کے باوجود معاملات ابھی قدرے سادہ اور کسی حد تک بزرگ نسل کے کنٹرول میں تھے۔ ابھی بچوں کے معاملات پہ نظر رکھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ سوسائٹی میں پرائیویسی کا احساس الارمنگ سطح تک نہیں پہنچا تھا۔ مگر جب نوے کی دہائی میں ٹیکنالوجی کا سیلاب آنا شروع ہوا تو ادھیڑ عمر کی نسل کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ موبائل اور کمپیوٹر کے ذریعے انٹرنیٹ بچے بچے کی پہنچ میں آ گیا۔ جس کا سیدھا مطلب تھا پورن سائٹس تک آسان رسائی۔ جنسی تصویروں اور فلموں نے جبر سے دبائے گئے تجسس کو خوب ہوا دی اور اخلاقی روایات سوکھے پتوں کی طرح بکھرنے لگیں۔ بچوں کو لذت کے حصول کا آسان راستہ ہاتھ آ گیا مگر انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس بات کے اعتراف کی صورت میں سماج اور خاص طور پر گھر کے

بڑے ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اس سلوک سے بچنے کے لیے خود کو ان سے ایک محفوظ فاصلے پر رکھنا ضروری تھا۔ تعلیم کے سلسلے میں دور دراز ہوسٹلوں میں قیام نے یہ محفوظ فاصلہ بھی فراہم کر دیا۔ ان ہاسٹلوں میں ایسے گھاگ دوست بھی دستیاب تھے جو جنسی خواہش کو بھڑکانے اور بیباک بنانے کے راستے بتانے میں طاق تھے۔ جب انسان ایک دو بار اس تجربے سے گزر جاتا ہے تو پھر وہ اپنی عملی زندگی میں مروجہ اخلاقیات کے دباؤ سے بہت حد تک آزاد ہو جاتا ہے۔ بھلے کوئی مانے یا انکار کرے مگر حقیقت یہی ہے کہ ہمارے ہاں یہ بہت تیزی کے ساتھ وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ یہ معاملہ صرف لڑکوں تک محدود نہیں رہا بلکہ لڑکیاں بھی اسی ڈگر پہ چل نکلی ہیں۔ کئی ایک نے تو اس کام کو باقاعدہ کاروبار بنا لیا ہے اور گاہک ان کے ایجنٹوں کے ذریعے انہیں کہیں بھی بلا سکتے ہیں۔ کوئی اس مظہر پر کتنا ہی تبریٰ کیوں نہ بھیجے، ہمیں یہ تسلیم کیے بنا چارہ نہیں کہ یہ سب انہی اخلاقیات کا نتیجہ ہے جن سے ہم بلا سوچے سمجھے چمٹے ہوئے ہیں اور ابھی تک ان میں کسی شعوری تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ہم من حیث القوم جنسی خواہشات کی جکڑ میں ہیں مگر ہم کسی صورت اس معاملے پر سنجیدہ مکالمے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہاں البتہ ہر شخص گندے لطیفوں کی زنبیل اٹھائے پھرتا ہے۔ بس کسی محفل میں آپ ایک لطیفہ سنانے کی جرأت کیجئے، پھر دیکھئے کیسے کیسے ثقہ دہان سے کیسے کیسے لطیفے برآمد ہوتے ہیں۔

سیکس اور سیکس سے جڑے معاملات تب تک ہی فحش ہوتے ہیں جب تک انہیں سنجیدہ معاملے کے طور پر زیرِ بحث نہ لایا جائے۔ مگر ہمارے ہاں تو صورتحال یہ ہے کہ ہمارے اکثر اساتذہ بایولوجی کی کتاب میں بچوں کو تولید کا باب اس لیے نہیں پڑھاتے کہ وہ ان کے نزدیک فحش ہے۔ ہمیں آج نہیں تو کل ان معاملات کو بہر حال سنجیدہ مکالمے کا موضوع بنانا ہوگا۔ ہمیں اپنے بچوں کا یہ بتانا ہوگا کہ جنسی جبلت کی زندگی میں کیا اہمیت ہے اور اس جبلت کو شعور کے کنٹرول میں لانا کیوں ضروری ہے۔ شعور کا یہ کنٹرول صرف ایک صورت میں ممکن ہے اور وہ صورت ہے محبت کا تعلق۔ محبت احساس کی اعلیٰ ترین حالت ہے جس میں انسان اپنی جان تو دے سکتا ہے مگر محبوب کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دیتا۔ ہمیں جنسی جذبے اور

محبت کو یکجا کر کے دیکھنا ہوگا اور یہی راستہ ہے جس کے ذریعے ہم گناہ کے احساس میں لتھڑے فحاشی کے تصور سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

جنسی جذبہ ایک طاقت ہے جو اپنی اصل میں نہ نیک ہے نہ بد۔ مگر بدقسمتی سے ہم نے اسے شر اور گناہ کا منبع سمجھ لیا ہے حالانکہ ہم شادی کی صورت میں اسی جذبے کو جسے کہ ہم فحاشی سمجھ کر سنجیدگی کے ساتھ زیرِ بحث لانے سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں، جائز مان لیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی جوڑے کی ان کی مرضی کے خلاف کی جانے والی شادی جنسی تعلق کے جائز اور انسانی ہونے کا جواز بن سکتی ہے۔ ممکن ہے آپ میں سے بہت سے لوگ اسے جائز ہی مانتے ہوں کیونکہ زبردستی کی شادیوں کا یہ عمل سوسائٹی میں اس تواتر سے دہرایا جا رہا ہے کہ ہم اس کے بارے میں کوئی سوال اٹھانے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ معاملہ ہماری اپنی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتا کیونکہ ہمارے لیے تو دوسروں کی شادی بس عمدہ دعوت کھانے اور دور دراز کے عزیزوں سے مل کر خوش ہونے کا ایک بہانہ ہے۔ ہم صرف ان معاملات کو زیرِ بحث لانے کی خواہش رکھتے ہیں جو ہماری زندگی پر براہِ راست اثر ڈالتے ہیں۔

ہمارے نزدیک والدین کی ضد سے طے ہونے والی شادیوں میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ بالآخر لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو قبول کر ہی لیں گے جیسے کہ ہم نے قبول کر لیا تھا اور پھر وہ نارمل میاں بیوی کی طرح رہنے لگیں گے۔ تو کیا میاں بیوی کی زندگی کا بظاہر نارمل دکھائی دینا ان کی زندگی کی حقیقی تصویر کی بھی عکاسی کر رہا ہوتا ہے؟ کون جانے کہ اس ظاہری نارملیٹی کے خاموش سمندر میں اذیت کے کیسے کیسے آتشیں طوفان پل رہے ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر ہمیں اس بات سے کیا تکلیف ہے کہ ہماری اولادیں اپنا اپنا جیون ساتھی خود منتخب کریں۔ ہم ان پر اپنی مرضی کیوں لاگو کریں۔ ہم اپنی اولاد کو جاننے کا لاکھ دعویٰ کریں مگر حقیقت یہی ہے کہ ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ کیونکہ ہم نے کبھی ان کو وہ ماحول ہی نہیں دیا کہ ان کے لیے خود کو ہمارے سامنے لانا اور بیان کرنا ممکن ہو۔ ہمارا یہ زعم کہ ہم بڑے ہیں، ہم ان سے زیادہ

جانتے ہیں، ہمیں ان کی سطح پر نہیں اترنے دیتا، ہمیں ان کے قریب جا کر ان کی ذات میں جھانکنے نہیں دیتا۔ وہ اگر کبھی ہم سے دل کی بات کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو ہم لیکچر دینے پر اتر آتے ہیں جو اتنا یکطرفہ ہوتا ہے کہ بچے ہماری بات میں دلچسپی کھو بیٹھتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں یہ بات راسخ ہو چکی ہوتی ہے کہ ہم بڑے ہیں، سمجھ دار ہیں جبکہ بچے بچے ہیں، ناسمجھ ہیں، سو وہ اپنے فیصلے خود کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اگر ہم نے انہیں فیصلے کرنے کا اختیار دیا تو وہ کچھ نہ کچھ غلط کر بیٹھیں گے۔ ہمیں یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ انسان کو غلطیاں ہی درست فیصلوں کی جانب لے کر جاتی ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کو غلطیوں سے سیکھنے کی اجازت دینا ہوگی۔ فیصلہ سازی واحد عمل ہے جو انسان کو کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہم بچوں پر فیصلہ سازی کی ذمہ داری ڈال کر ہی انہیں سوچنا اور غور و فکر کرنا سکھا سکتے ہیں۔ اور یہی عمل ان کی آئندہ کی زندگی کی کامیابی کی کلید بنے گا۔

بلاشبہ تہذیب اور شرافت کے نام پر سیکس کے بارے میں ہماری ناجائز اور بے دلیل خاموشی نے ہمارے بچوں کو بے جا تجسس میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اور یہی بے جا تجسس ان کی سوچ کو تنگ بنا کر انہیں پریشان خیالی کا شکار بنا رہا ہے۔ ہمارے رویوں نے ان کے ذہن میں یہ خیال بری طرح راسخ کر دیا ہے کہ جنسی عمل تو رہا ایک طرف، اس کے بارے میں سوچنا اور بات کرنا بھی سراسر گناہ اور فحاشی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جہاں ایک طرف سیکس اور اس سے متعلقہ معاملات پر سنجیدہ گفتگو پر سماج نے ایک خاموش معاہدہ کر رکھا ہے وہیں دوسری طرف اس کے بارے میں فحش لطائف اور رازدارانہ انداز میں فحش گفتگو کا چلن عام ہے۔

اگرچہ شادی کا معاملہ ایک وسیع پھیلاؤ رکھنے والا سماجی مظہر ہے جس کا بنیادی مقصد ایک نئے خاندان کی شروعات سے ہے مگر اس لفظ کو سنتے ہی ہمارے ذہن میں صرف اور صرف دو افراد کے جنسی تعلق کا منظر ابھرتا ہے۔ اس موقع پر دولہا کے ساتھ اسکے بے تکلف دوستوں کی معنی خیز گفتگو مکمل طور پر فحاشی کی عکاس ہوتی ہے اور کم و بیش ایسی ہی رمزیہ گفتگو دولہن اور اس کی سکھیوں کے درمیان بھی چل رہی ہوتی ہے۔ گویا شادی ہمارے تئیں متخالف صنف کے دو بالکل عریاں پہلوانوں کے دنگل جیسی

تصویر بناتی ہے جسے ہم سب کسی نہ کسی طرح چھپ چھپا کر دیکھنا چاہتے ہیں مگر دیکھ نہیں سکتے۔ ہماری یہ خواہش اس بات کا اظہار ہے کہ ہماری فطرت کا بے ساختہ پن فحاشی کے احساس سے کس قدر مسخ ہو چکا ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اس جبلت کو جو نہ صرف باقی جبلتوں کے مقابلے میں انتہائی درجے کے لطف کی حامل ہے بلکہ ایک جناتی طاقت جیسا مقام رکھتی ہے، مثبت انداز میں سمجھنے اور برتنے کی بجائے 'شیطانی' مان لیا ہے۔ ایک ایسی شیطانی طاقت جو مسلسل ہمارے تعاقب میں ہے اور ہمیں گمراہ کرنے میں لگی ہے۔ مزید یہ کہ ہم نے عورت کے بدن کو اس شیطانی طاقت کا منبع و مرکز سمجھ لیا ہے اور ہمارے اخلاقی مربیوں کا خیال ہے کہ مرد کو گناہ سے بچانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ عورت کو مرد کی نظروں سے ممکنہ حد تک اوجھل رکھا جائے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تقریروں میں حوروں کا سراپا یوں دکھاتے ہیں کہ سننے والوں کی جنسی حس بے طرح انگیخت ہونے لگتی ہے۔ اب معلوم نہیں کہ اخلاقیات کے ان مبلغین کا مقصد جنسی حس کو سلانا ہے یا کسی سوئے پڑے درندے کو بیدار کر کے گھروں میں بند عورتوں کی چیر پھاڑ کی جانب مائل کرنا۔ ان مبلغین کی فکر اور عمل میں موجود اسی طرح کے بے شمار تضادات یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ ان کے نظریۂ حیات میں دانش اور دلیل کا کتنا عمل دخل ہے۔

ہم سراسر فرسودہ اور غیر عملی اخلاقیات کا بوجھ اٹھائے گھسٹ رہے ہیں مگر ان کو زیر بحث لانے کو تیار نہیں کیونکہ ان کی پشت پر مذہبی تقدس کھڑا ہے۔ اور مذہبی تقدس کا کمال یہ ہے کہ وہ عقل کو بروئے کار ہی نہیں آنے دیتا۔ گفتگو کی حد تک ہم سے زیادہ مذہب سے محبت کرنے والی قوم آج تک روئے زمین پر نہیں اتری۔ برے سے برا آدمی بھی دن میں سینکڑوں بار اسلام کی حقانیت کا تذکرہ کرتا سنائی دے گا مگر عملی طور پر اپنے گھٹیا مفادات سے جڑا ہوا۔ مذہبی اخلاقیات کو عمل میں نہ لا سکنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اکثر مذہب سے محبت کا ثبوت تخریب کاری کی شکل میں دیتے ہیں۔ دنیا میں کہیں بھی اگر ہمارے کسی مذہبی شعائر کا مذاق اڑایا جائے تو ہم فوراً سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور پھر اپنے ہی بھائی بندوں کی دوکانوں کو نذر آتش کر کے خود کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے اسلام سے محبت کا حق ادا کر دیا۔ اسی

طرح اگر یہاں کسی مسجد سے کسی فرد پر مذہب کی توہین کا الزام نشر ہو جائے تو ہماری مذہبی غیرت ثبوت مانگے بنا ہی اس فرد کو جہنم واصل کرنے پر تُل جاتی ہے۔ مزید المیہ یہ ہے کہ ہمارے بہت سے کالم نگار اور دانشور حضرات اسے اللہ اور رسولؐ کی محبت کہہ کر سراہتے ہیں۔ ہماری اخلاقیات کا ایک اور المیہ یہ ہے کہ چونکہ ان کا اپنی ذات پر نفاذ تقریباً ناممکن ہے، سو ہم اسے دوسروں پر نافذ کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس کا سب سے آسان نشانہ ہماری اپنی اولاد بنتی ہے۔

میں نے ہماری مروجہ سماجی روایات اور اخلاقیات کی بنیادوں میں موجود تضادات اور تناقصات اور ان کے نتائج کا مقدور بھر تذکرہ اور تجزیہ سامنے رکھ دیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جنسی جبلت اور اس سے متعلقہ معاملات کے بارے میں ہماری تفہیم نے ہمیں کیسے کیسے اذیت ناک مسائل سے دوچار کر رکھا ہے۔ اب یہ ہمارے اہلِ فکر و دانش کا کام ہے کہ وہ ان مسائل و معاملات سے صرفِ نظر کرنے کی بجائے انہیں سنجیدہ مکالمے کا موضوع بنائیں۔ یہ مکالمہ ہی ہے جو سماج کی غلط اور نقصان دہ تفہیم کو تبدیلی کی جانب مائل کر سکتا ہے۔ کوئی قانون یا ضابطہ کسی دانشور کی نگاہ میں سماج کی بھلائی کے لیے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو، اسے عوام الناس کو قائل کیے بنا نافذ کرنا کبھی اچھے نتائج نہیں دیتا۔ سو یہ ضروری ہے کہ اگر ہمیں اپنی اخلاقیات کی پریکٹس میں مثبت تبدیلیاں درکار ہیں تو اس کے لوگوں کو قائل کرنا ناگزیر ہے۔ سوچ سے عمل تک کی تبدیلی کا یہ عمل سماج میں مکالمے کے بغیر ممکن نہیں۔

اختتام

قیمت پاکستان میں: 600 روپے

بیرونی ممالک: 20 ڈالر علاوہ ڈاک خرچ

سعید ابراہیم

ہمارے سماجی پس منظر میں
ایک ایسے موضوع پر
بات کرتی ہوئی کتاب
جو ہر بالغ فرد کا مسئلہ ہے مگر
ہم نے اس موضوع کو فحش مان کر
سنجیدہ گفتگو کو
تقریباً ناممکن بنا دیا ہے

نروان پبلیکیشن ہاؤس
2-779 ڈی-1 نیو ٹاؤن شپ، لاہور-پاکستان
موبائل: 0321-4272847